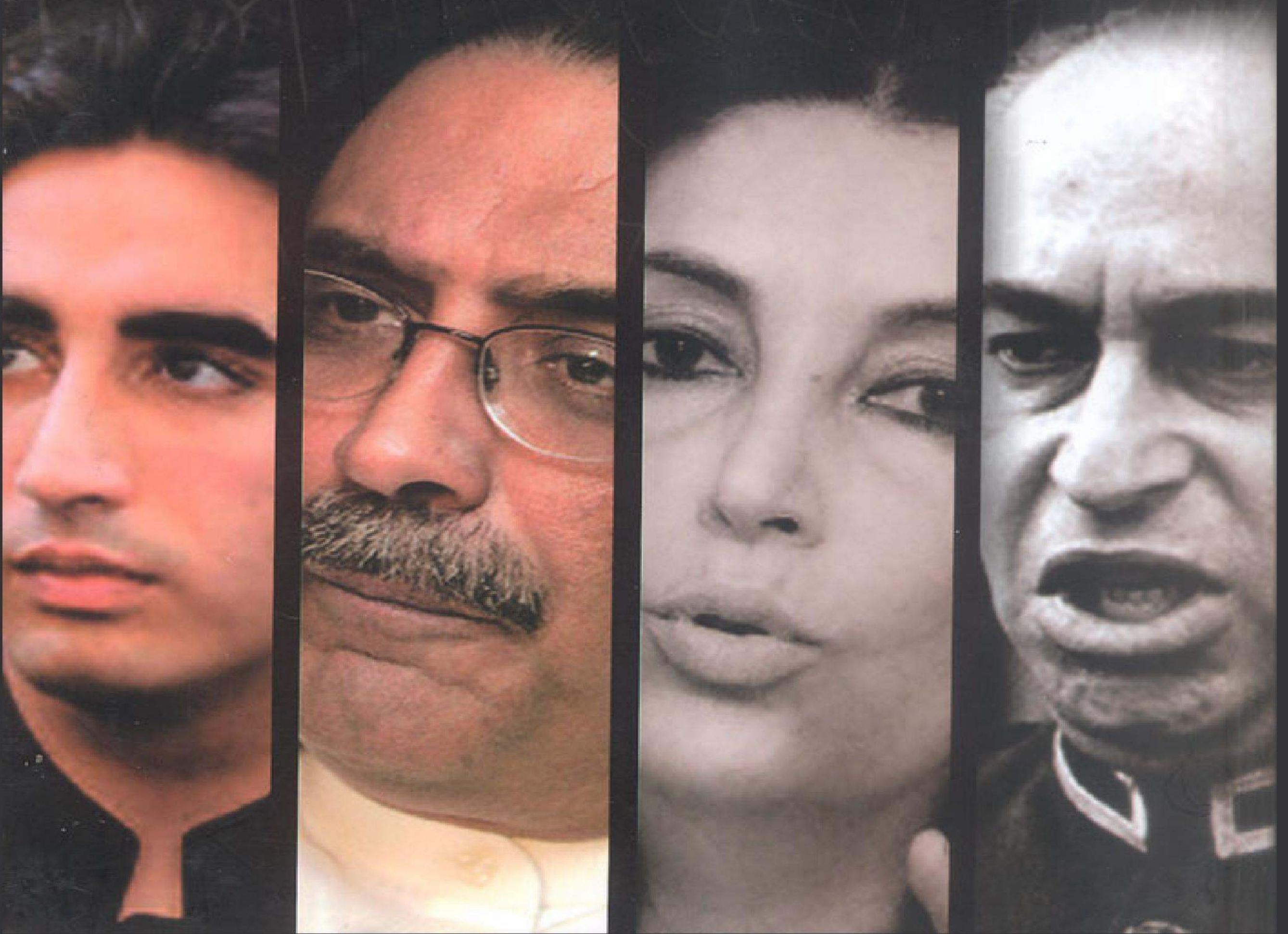
آمریّت یا جمہوریّت

بے نظیر بھٹو



Reproduced by:

Sani Hussain Panhwar

Member Sindh Council, PPP

انتساب

پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے نام

پیش لفظ

جمہوریتیں نہ تو جنگوں کو فروغ دیتی ہیں اور نہ ہی بین الاقوامی دہشت گردی کا سبب بنتی ہیں، جب کہ اس کے برعکس آمریت معاشرے میں مایوسی کو پروان چڑھاتی ہے اور قنوطی منظر نامے اور عوام میں افسردگی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے، افسردگی کے باعث مایوسی، پست ہمتی اور شکست خوردہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ آمر ظلم و تشدد، ناانصافی، کرپشن کے مرتکب ہوتے ہیں، یا اپنی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے دہشت پیدا کرتے ہیں۔ وہ مفاد پرست اور ابن الوقت عناصر کو بدعنوانی کی دلدل میں دھکیل دیتے ہیں۔

پاکستان کی پوری تاریخ میں ملک پر نصف عرصہ تک فوجی جرنیل مسلط رہے اور ملک میں جمہوریت کی آبیاری نہ ہوسکی اور اسے پھلنے پھولنے کا موقع نہ دیا گیا۔ جمہوریت اور جمہوری نظریہ پر کاربند عوامی جماعت پیپلز پارٹی کے ساتھ فوج کے چند اقتدار پسند جرنیلوں اور ایجنسیوں کا رویہ ہمیشہ معاندانہ رہا، اسے مختلف حیلوں بہانوں سے دبانے کے ساتھ اس کی قیادت پر کرپشن کے الزامات عائد کیے جاتے رہے، جنہیں آج تک ثابت نہیں کیا جاسکا۔

آج حکومت ایک بحران سے نکل کر دوسرے بحران میں داخل ہورہی ہے، نتیجتاً حکومتی اُمور نظر انداز ہورہے ہیں، جس سے نہ صرف مقامی بلکہ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی ساکھ متاثر ہو رہی ہے، اور حکومتی کارکردگی چاہے دہشت گردی کا خاتمہ ہو یا پاک امریکہ تعلقات، بھارت کے ساتھ معاملات ہوں یا مقامی نوعیت کے مسائل، ہر میدان میں ناکام ہورہی ہے۔ جس کی بنیادی وجہ حکومت میں سیاسی بصیرت کا فقدان ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کے زیرِ نظر کالموں کے مجموعہ میں ''آمریت یا جمہوریت'' پر پاکستان کے تناظر میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ مجموعہ قارئین کو پسند آئے گا۔

منور انجم

فہرست

جنرل پرویز مشرف آئینی بحران کی زد میں

اکتوبر 2002ء میں جنرل پرویز مشرف نے عالمی دباؤ کے تحت متنازعہ انتخابات کرائے، جس کے نتیجے میں تین سال کے وقفے کے بعد پارلیمنٹ وجود میں آئی، تاہم بے اختیار پارلیمنٹ کے وجود سے حاصل ہونے والی خوشی اُن کے لیے دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ دو سابق وزراء اعظم کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہ دی گئی اور کنگ پارٹی نے بہت زیادہ نشستیں حاصل کرلیں اور ملک پھر آئینی بحران کا شکار ہوگیا۔ یہ آئینی بحران پرویز مشرف کی نااہلی کی وجہ سے پیدا ہوا، کیونکہ انہوں نے فوجی پیش رووں سے یہ نہیں سیکھا کہ پارلیمنٹ کے لیڈروں کو پیچھے دھکیلنے کے بجائے انہیں ساتھ ملایا جاتا ہے۔

گزشتہ ہفتے صدر مشرف حیدرآباد گئے، جہاں انہوں نے اعلان کیا کہ اگر پارلیمنٹ اُن کے فریم ورک آرڈر (ایل۔ایف۔او) کو تسلیم نہیں کرتی تو اُسے (پارلیمنٹ کو) رخصت ہونا پڑے گا۔ ان کے تین سالہ دورِ حکومت کی بنیاد انتخابات کرانے کے وعدے پر تھی، جس کے نتیجے میں یہ پارلیمنٹ وجود میں آئی۔ پاکستان کی سپریم کورٹ نے ایک شخص کو یہ اختیار نہیں دیا تھا کہ وہ پوری قوم پر اپنے ذاتی نظریات ٹھونسے۔

پارلیمنٹ فوجی ڈکٹیٹر کی جانب سے منتخب آواز کو دبانے کی کوشش کے خلاف مزاحمت کررہی ہے۔ اس عمل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جنرل پرویز مشرف اپنی جانب داری دکھاتے ہوئے چور دروازے سے صدارتی نظام لانا چاہتے ہیں۔ اس سے یہ خدشہ بھی پیدا ہوگیا ہے کہ قومی سلامتی کونسل اور اُمورِ خارجہ کے معاملات مسلح افواج کے کنٹرول میں آجائیں گے۔ ترکی کے برعکس اسلام

آباد میں بیٹھے ہوئے حکمران جدّت پسند جرنیل سیاسی قیادت کی نسبت اُن انتہا پسند قوتوں کے زیادہ قریب ہیں، جنہوں نے افغان جہاد میں حصہ لیا۔

پارلیمنٹ بھی یہ سمجھتی ہے کہ اسمبلیاں توڑنا جنرل پرویز مشرف کے مفاد میں نہیں، وہ صرف زبانی کلامی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ اسمبلیاں توڑنے کے عمل سے پرویز مشرف کی صدارت بھی ختم ہوجائے گی۔ مزید یہ کہ انہیں اپنے کیے کی معافی نہیں مل سکے گی۔ بہرحال یہ اُن کے اپنے مفاد میں ہے کہ سیاسی جماعتوں کے مطالبات پورے کریں اور اسمبلیوں کو کام کرنے دیں۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ جس صدر نے اسمبلی توڑی اسے خود بھی رخصت ہونا پڑا۔ یہ الگ بات ہے کہ نئے انتخابات کے نتیجے میں پارلیمنٹ بحال ہوگئی۔

ماضی قریب کی تاریخ میں جنرل ضیاء الحق، غلام اسحاق خان اور فاروق لغاری ایسے صدور تھے، جنہوں نے اسمبلیاں توڑیں اور خود بھی چلتے بنے۔ مشرف کے دل میں بھی یہ بات ہے کہ اگر انہوں نے اسمبلیاں توڑیں تو انہیں بھی گھر جانا پڑے گا۔ تاہم اس بات کا بہت کم امکان ہے کہ وہ اپنی دھمکیوں کے مطابق پارلیمنٹ سے چھٹکارا حاصل کرسکیں۔ موجودہ پارلیمنٹ کا انتخاب سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق ہوا تھا، جس نے اسمبلیوں کے وجود میں آنے تک آئین کو معطل رکھا۔ مشرف پاکستان کے آمروں کی اس قطار میں اب تک آنے والے آخری حکمران ہیں، جنہوں نے سیاسی تاریخ میں اپنا رنگ جمایا۔ اس سے پہلے آنے والے آمر اپنا ایل۔ ایف۔ او پارلیمنٹ میں لاتے رہے۔ صرف جنرل یحییٰ خان نے ایسا نہیں کیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک ٹوٹ گیا اور 90 ہزار فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سیاسی جماعتوں کے اصرار پر متعارف کرائے جانے والے ایل۔ ایف۔ او کے کچھ مثبت پہلو بھی ہیں۔ اُن میں ایک یہ ہے کہ بڑے پیمانے پر خواتین کی نمائندگی ہوئی اور اقلیتوں کو مخلوط انتخابات کا موقع فراہم کیا گیا۔ پارلیمنٹ ان مثبت پہلوؤں کی منظوری دے سکتی ہے، مگر پرویز مشرف سیاسی حقیقتوں کو کچھ زیادہ ہی نظر انداز کررہے ہیں۔ گزشتہ ہفتے انہوں نے حیدرآباد میں غلط دعویٰ کیا کہ خواتین کی نمائندگی اور اقلیتوں کے مخلوط انتخابات خطرے میں تھے، یا پھر یہ پرویز مشرف کی ایک چال ہے، جس کا مقصد منتخب نمائندوں کی تحریک سے لوگوں کی توجہ ہٹانا ہے۔ متنازعہ معاملات میں جو چیزیں شامل ہیں، وہ یہ ہیں:

پرویز مشرف کا حاضر سروس جنرل ہونے کے باوجود حکومت سنبھالنا، اسمبلیاں توڑنے کا صدارتی اختیار، جس کی وجہ سے ماضی میں پاکستان کے اندر سیاسی عدم استحکام پیدا ہوا، الیکشن کمیشن

کی اصلاح کی ضرورت اور انتخابات، محنت کشوں کے حقوق اور دیگر قوانین کی تشکیل۔ اس میں ایک چیز یہ بھی شامل کی جاسکتی ہے کہ اخباری اطلاعات کے مطابق جنرل پرویز مشرف نے لاکھوں ڈالر مالیت کا ایک گھر صدر کی حیثیت سے، اور دوسرا آرمی چیف کی حیثیت سے حاصل کیا۔ لالی پاپ کے طور پر سابق صدور کو بھی مکانات دے دیئے گئے۔ ارکانِ پارلیمنٹ نے اس سلسلے میں ایک فہرست کا مطالبہ کیا، جس کی سرکاری سطح پر توثیق کی جانی چاہئے تھی، مگر ابھی تک یہ فہرست انہیں فراہم نہیں کی گئی۔ اس کے علاوہ بھی کچھ متنازعہ حکم نامے منظور کیے گئے۔ اس طرح کی خبریں باہر آئی ہیں اور اپوزیشن نے اقوام متحدہ سے شکایت کی ہے کہ سابق خاتونِ اوّل بیگم بھٹو کے خلاف ایک مقدمے کے سلسلے میں احتساب عدالت کے جج کو رشوت کی شکل میں ترقی اور مراعات دینے کی پیش کش کی گئی۔

ارکانِ اسمبلی صدر مشرف کے فیصلوں کی توثیق میں تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ جو حکم نامے پاس کرائے جاتے ہیں، ارکان کو ایسے حکم ناموں کی ایک جامع کاپی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ ان کا جائزہ لینے کے بعد ان کے حق میں کوئی فیصلہ کرسکیں۔ لیکن ابھی تک ان ارکان کو ان حکم ناموں کی نوعیت کے بارے میں بھی نہیں بتایا جاسکا۔ جمالی کی حکومت اور سیاسی جماعتیں کئی ماہ سے ایل ایف او کے مذاکرات میں مصروف ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سلسلے میں مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے ساتھ مذاکرات ہوئے، نہ کہ سابق وزراءاعظم کے اتحاد کے ساتھ۔ بعض وجوہ کی بناء پر مشرف نہیں چاہتے کہ مذاکرات کامیاب ہوں۔ ایک اطلاع کے مطابق ان مذاکرات کے دوران ہی پرویز مشرف نے اسمبلی توڑنے کی باتیں شروع کردیں، تاکہ وہ ارکانِ پارلیمنٹ کو خوفزدہ کرکے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرسکیں۔ یہ ایک پرانی چال ہے، جو جنرل ایوب نے پچاس کے عشرے میں اور ضیاءالحق نے اَسّی کی دہائی میں چلی۔ ارکانِ اسمبلی اب اتنے سمجھ دار ہوچکے ہیں کہ ان خالی خولی دھمکیوں کا اندازہ کرسکیں اور مشرف کی بڑھک کو سمجھ سکیں۔ مشرف کو آئین معطل کرنے کے لیے اسمبلی کی ضرورت ہے۔ اگر وہ اپنی بنائی ہوئی اسمبلی کو رعایتیں دینے کے باوجود یہ مقصد حاصل نہیں کرتے تو اس کا مطلب ہے انہوں نے اپنا بہت زیادہ نقصان کرلیا۔ پرویز مشرف پارلیمنٹ کو اس لیے اپنے تابع کرنا چاہتے ہیں کہ اب وہ زیادہ دیر تک کابینہ کے اجلاسوں کی صدارت نہیں کرسکتے۔ اب وہ وقت ان کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے، جب وہ حکم ناموں کے ذریعے قوانین تبدیل کردیتے تھے۔ وہ غلط، یا صحیح جو بھی خواہش کرتے تھے، وہ قانون بن جاتا تھا۔ ان کے اردگرد درباری جمع تھے، جو ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ اب اُن کے اپنے ساتھی بکھر گئے ہیں۔ اپوزیشن سے

بات کرنا تو دور کی بات ہے، اگر وہ اپنے اتحادیوں کوخوش نہ کریں تو وہ اسمبلی کا کورم توڑتے ہوئے ایک طرف ہوجاتے ہیں اور اسمبلی کا اجلاس ختم کرا کے انہیں پریشان کر دیتے ہیں۔ مشرف فوج کا عہدہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ حیران کن یہ بات ہے کہ انہیں اپنے فوجی ساتھیوں میں سے کوئی اس قابل نظر نہیں آتا، جس پر وہ آرمی چیف بنانے کے سلسلے میں اعتماد کرسکیں۔ جنرل مشرف ہر چیز کو اپنی مرضی سے چلانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ سیاسی قیادت کچھ لو کچھ دو پر کوئی سمجھوتہ چاہتی ہے۔ ان کے غیر لچک دار رویے اور سیاسی جماعتوں کا نقطہ نظر جاننے سے انکار کی وجہ سے ملک شدید آئینی بحران کا شکار ہو چکا ہے۔

ماضی کے واقعات کے تناظر میں قائدانہ صلاحیتوں کے فقدان نے کارگل کی احمقانہ مہم کو جنم دیا، جہاں پاکستان تین ہزار فوجی افسروں اور جوانوں کے ضیاع کے بعد یک طرفہ طور پر پیچھے ہٹا۔ انہوں نے اپنی بنائی ہوئی قومی سلامتی کونسل اور کابینہ سے مشاورت کے بغیر دہشت گردی کے خلاف مہم میں شمولیت اختیار کی۔ اگر ان اداروں سے مشاورت کر لی جاتی تو یہ بھی اس مہم میں شامل ہوجاتے اور اس اتفاق رائے کے نتیجے میں ملک کو اس سے کہیں زیادہ فائدہ ہوتا، جو مشرف نے قرضے وغیرہ کی صورت میں حاصل کیا۔ سیاسی اور اقتصادی خودکشیاں، ماضی قریب میں بھارت کے ساتھ تین جنگیں، ایران اور افغانستان جیسے ہمسایوں کے ساتھ تعلقات بگاڑنا، کراچی میں فسادات کا دوبارہ پھوٹنا، اوکاڑہ ملٹری فارم کا سکینڈل، جہاں کسان اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں، کیونکہ پرویز مشرف کے ساتھی اُن کی زمینیں ہتھیانا اور حکومتی کرپشن پر آنکھیں بند کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں پرویز مشرف کا داغ دار ورثہ ہیں۔ پرویز مشرف نے سیاسی صفائی کے وعدے کے ساتھ حکومت سنبھالی تھی۔ انہوں نے اب اس صفائی کو اپنے فوجی بوٹوں تلے روند ڈالا ہے۔ انہوں نے ایک چھوٹے صوبے میں حکومت بنانے کے لیے مجرموں کو آزاد کر دیا۔ وہ لوگ جو احتساب بیورو کے ذریعے پرویز مشرف کے دوستوں کی جانب سے کرپٹ قرار پائے تھے، جب انہوں نے پرویز مشرف کا ساتھ دیا تو ایک منٹ میں صاف شفاف ہو گئے۔ اخبارات سینیٹ کی رُکنیت خریدنے کے لیے خرچ ہونے والی رقم کے بارے میں خبر دیتے ہیں، مگر پرویز مشرف آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ حال ہی میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ ایک سینیٹر نے پرویز مشرف کے لیے بارہ ارکانِ اسمبلی خریدنے کی پیش کش کی ہے۔

مصلحت آمیز سیاست اور موقع پرستی ایک ڈکٹیٹر کا فن ہوسکتا ہے، تاہم پہلے آمروں میں پرویز مشرف جیسی سرکشی نہیں تھی، وہ اپنے ذاتی مفادات کے سلسلے میں اس کا سہارا نہیں لیتے تھے۔

جب پرویز مشرف نے نواز شریف کو ہٹایا تو اُن کے مخالف جمہوری اتحاد کو اپنے ساتھ ملانے کے سلسلے میں پرویز مشرف نے جس نااہلی کا مظاہرہ کیا، اس کی وجہ سے اُن (پرویز مشرف) کی سیاسی حمایت ختم ہوگئی۔ اُن کے متنازعہ صدارتی ریفرنڈم نے انہیں مزید کمزور کردیا۔ ہارس ٹریڈنگ کے ذریعے انتخابی عمل میں مداخلت اور پارلیمنٹ کے اجلاس کے التوا نے اُن کی حیثیت کو بُری طرح نقصان پہنچایا۔ جمہوریت کی بحالی کے لیے متحد سیاسی جماعتوں کے ساتھ پرویز مشرف جتنی زیادہ لڑائی کریں گے، اتنا زیادہ نقصان اُٹھائیں گے۔

پرویز مشرف متنازعہ کالاباغ ڈیم تعمیر کرنے کی کوشش کررہے ہیں، جس سے نشیبی علاقوں کے لوگ متاثر ہوں گے۔ (اور شاید اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ صحرائی زمین انہیں اور اُن کے دوستوں کو الاٹ ہوجائے گی۔) اس ڈیم سے ذاتی فائدہ حاصل کرنے کے لیے صوبوں کے درمیان کشیدگی پیدا کردی گئی ہے۔ پاکستان کو پانی کے بحران کا سامنا ہے۔ اس بحران کے خاتمے کے لیے بے شمار چھوٹے ڈیم تعمیر کرنے کی ضرورت ہے۔ بڑے ڈیموں کے مقابلے میں یہ چھوٹے ڈیم کم وقت اور کم سرمائے سے بنائے جاسکتے ہیں اور یہ بڑی تیزی سے پانی فراہم کرسکتے ہیں۔

دو سابق وزراءاعظم کو کونے میں دھکیلنے کے لیے پرویز مشرف کی مسلسل کوششوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مستحکم معاشرے کی تشکیل کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ عوام کے دلوں میں قومی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے لیے جو احترام اور محبت ہے، اس چیز نے پرویز مشرف کو ناراض اور پریشان کردیا ہے۔ وہ ہر کام اپنے انداز میں کرنا چاہتے ہیں، چاہے اس سے قومی مفاد کو نقصان ہی پہنچے۔ وہ پریس کے سامنے آتے ہوئے انتہائی جذباتی ہوجاتے ہیں اور اُن کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

بمبئی کے دھماکوں نے پاکستان اور بھارت کے درمیان امن اقدامات کو نقصان پہنچایا۔ طالبان کی سرگرمیوں نے پاکستان اور افغانستان کے تعلقات بگاڑے، پاکستان کے اندر مشرف نے آئینی بحران پیدا کیا، غربت نے پاکستانی نوجوانوں کو گھیر رکھا ہے۔ پرویز مشرف پاکستان کی دو بڑی جماعتوں کے ساتھ محاذ آرائی قائم کیے ہوئے ہیں۔ ان جماعتوں کے سربراہوں سے پرویز مشرف خوفزدہ ہیں۔ اس صورت حال کے تناظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پرویز مشرف پاکستان کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے مناسب رہنما ہیں؟

جمہوریّت اور فوجی آمریّت

پاکستان میں اکتوبر کے پارلیمانی انتخابات فوج کی طرف سے ملک میں جمہوریت کی بحالی کے وعدے کا حصہ تھے۔ بڑے پیمانے پر دھاندلی کے الزامات کی وجہ سے یہ انتخابات دھندلا گئے۔ امریکی تنظیم ''ہیومن رائٹس واچ'' نے نوٹ کیا کہ سیاسی جماعتوں کے خلاف حالات کو اپنے مفاد کے مطابق ڈھالا گیا۔ یورپی یونین نے انتخابات کو ناقص قرار دیا۔ دولت مشترکہ نے پاکستان کی رُکنیت کی بحالی سے انکار کردیا۔ ان انتخابات کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ انتخابات جمہوری حکمرانی کو مسترد کرنے کا عمل تھے۔ پاکستان میں انتخاب اس صورت حال میں منعقد ہوئے کہ عالمی سطح پر کشیدگی، اضطراب اور دہشت گردی کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ جب پاکستانی ووٹ ڈال رہے تھے، اس وقت ایشیا کے مختلف حصوں میں دہشت گردی کے واقعات تواتر کے ساتھ ظہور پذیر ہورہے تھے۔ دہشت گردی کے ان واقعات سے انڈونیشیا، کویت اور یمن متاثر ہوئے۔

پاکستان کی فوجی آمریت نے انتہا پسندی، عدم رواداری اور نفرت کی قوتوں کو ازسرنو منظم ہونے کے لیے ایندھن کا کام دیا، جب کہ ان قوتوں نے اکیسویں صدی میں عالمی امن کو خطرے سے دوچار کردیا ہے۔ فلسطینی اتھارٹی اور عراق میں جمہوریت سے متعلق بین الاقوامی برادری میں بحث ہورہی ہے، تاہم پاکستان میں جمہوریت سے متعلق خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔ پاکستان کے آمر کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں حلیف تصور کیا جاتا ہے۔ ایک آمر کو اپنے ہاتھ میں رکھنے جب کہ دوسری جگہوں پر آمریت کی مخالفت کرنے کی پالیسی کی وجہ سے مسلم دنیا میں کنفیوژن اور آزردگی پیدا ہورہی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ آزادی سے متعلق تسلسل کے ساتھ واضح انداز میں آواز اُٹھائی جائے۔ مسلمانوں کی غالب اکثریت آمریت کے زیر سایہ رہ رہی ہے۔ انہیں اکثر مجبوری کی صورت میں مذہبی آمریت، یا فوجی آمریت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مسلم عوام کو آزاد سماج کی ایک تیسری چوائس دی جانی چاہیے، جس کی بنیاد بنیادی انسانی حقوق اور قانون کی حکمرانی پر ہو۔

اس کے برعکس مسلم ممالک اپنے آپ کو ایسے معاشروں میں پاتے ہیں جہاں خواتین کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے، جہاں دوست نوازی اور اقربا پروری آزاد مقابلے کی ناگزیریت کو ختم کردیتی ہے، جہاں ججوں کو رشوت دی جاتی ہے، یا اُن پر تشدد کیا جاتا ہے اور جہاں سیاسی جماعتوں کو کچلا جاتا ہے۔

پاکستان کے جرنیل قومی دھارے میں شامل سیاسی جماعتوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے خفیہ ایجنسیوں کو بے رحمی سے استعمال کرتے ہیں۔ اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیاسی جماعتوں کو بتدریج کمزور کیا جائے۔ اس لیے وہ مذہبی انتہا پسندوں کے ہاتھ میں کھیلتے ہیں۔ وہ اپنی مہم چلانے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ فرماں بردار عدالتیں اُن کے لیڈروں کو آزاد کردیتی ہیں جب کہ یہی عدالتیں جمہوری جماعتوں سے تعلق رکھنے والے سیاسی قیدیوں کو آزاد کرنے سے خوفزدہ ہوتی ہیں۔

انتہا پسند اور دہشت گرد قوتیں سوویت یونین کی طرف سے 1980ء کے عشرے میں افغانستان پر قبضے کے دوران جنگ سے تباہ حال افغانستان کے اندر پیدا ہوئیں۔ دہشت گرد قوتوں کو کمزور کرنے کے لیے لازمی ہے کہ اس بات کو سمجھا جائے کہ دنیا نے افغانستان کے معاملے میں کہاں غلطی کی تھی۔ افغانستان سے سوویت یونین کے انخلا کے بعد عالمی برادری، جو دیوار برلن کے خاتمے کے بعد بدحواس تھی، نے اپنی توجہ یورپ کی طرف مبذول کی۔ عالمی برادری کی توجہ یورپ کی طرف منتقل ہونے کی وجہ سے یہ افغانستان میں ایسی جمہوری حکومت کے لیے کام نہ کرسکی، جس کی بنیاد اتحاد کے اُصولوں، اتفاق رائے اور افہام وتفہیم پر ہوتی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہ کاری کے المیے میں بنیادی غلطی یہ تھی کہ حق خودارادیت، جمہوریت اور آزادی کی اقدار کی پاسداری میں ناکامی تھی کیونکہ یہی اقدار دہشت گردی کو ختم کرتی ہیں۔ وہ لوگ جو جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں، وہ دہشت گردی کی تمام سفاکانہ صورتوں سے نفرت کرتے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف نے پاکستان کے مستقبل کے لیے نئے چہروں کو سامنے لانے کا وعدہ کیا تھا۔ نئے چہروں کو ملاّ عمر کے اتالیق کی صورت میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی جماعتوں کے جھنڈے تلے بڑی تعداد میں منتخب ہونے والے لوگوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے بہت سارے لوگ

افغان جہاد میں حصہ لے چکے ہیں۔ یہ لوگ سخت جنگ جو اور افغان جہاد کے آزمودہ کار ہیں۔
انتخابات سے ایک روز قبل ٹیلی ویژن پر خبر دی گئی کہ پاکستان کے جرنیلوں نے افغانستان سے متصل سرحدی علاقے مذہبی جماعتوں کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اطلاع درست ثابت ہوئی۔ انتخابات میں دھاندلی کئی طریقوں سے کی گئی۔ ان میں ووٹوں کی گنتی میں ہیرا پھیری بھی شامل ہے۔ نتائج میں تبدیلی کے لیے ووٹوں کی گنتی کے اعلان میں 3 سے 36 گھنٹوں کی تاخیر کی گئی۔ اعلان کردہ نتائج ایکشن پول سے متضاد تھے کیونکہ ایکشن پول انتخابات میں جمہوری قوتوں کی فتح کی نشاندہی کر رہے تھے۔ شاید جرنیلوں کی سوچ یہ تھی کہ وہ مغرب کو یہ دھمکی دے سکتے ہیں کہ اگر انہیں اقتدار میں واپس نہ لایا گیا تو یہاں مذہبی شورش اور افراتفری برپا ہو جائے گی۔ اگر ایسی بات ہے تو انہوں نے غلط اندازہ لگایا۔ اُن کے دونوں سابق پروردہ وزراءاعظم جونیجو اور نواز شریف اُن کے خلاف ہو گئے تھے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اُن کے نئے پروردہ بھی اسی طرح کریں گے۔

1996ء میں جب پاکستان میں جمہوریت تھی، اُس وقت پاکستان کا شمار دنیا کی دس سرکردہ کیپٹل مارکیٹس میں ہوتا تھا۔ عسکری شدت پسندوں اور مذہبی انتہا پسندوں نے پاکستان میں جمہوریت کو عدم استحکام سے دوچار کیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے کی دو برس بعد بن لادن نے افغانستان، جہاں وہ طالبان کی پناہ میں تھے، کی سرزمین سے مغرب کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔۔ پاکستان میں جمہوریت کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کا سلسلہ جاری رہا، جس کی بازگشت جنوبی ایشیا اور عالمی برادری میں سنائی دینے لگی۔ پاکستانی جمہوریت پاکستانی لوگوں کو بااختیار بنانے کے لیے اہم ہے۔ غربت کے ہاتھوں بدحال لوگوں کو متاثر کرنے والے سماجی مسئلوں کو حل کرنے کے لیے بھی پاکستانی جمہوریت اہم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عالمی برادری کی جغرافیائی تزویراتی تحفظات کے لیے بھی یہ اہمیت کی حامل ہے کیونکہ عالمی برادری اس صدمہ میں دہشت گردی کے خلاف نبردآزما ہے۔ ان وجوہات کی وجہ سے گزشتہ اکتوبر کے انتخابی ڈرامے کو رد کر دینا چاہیے۔ پاکستان کے جرنیل یہ رائے رکھتے ہیں کہ دنیا عراق میں ہتھیاروں کے معائنے کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ اس بات پر بھی یقین کیے بیٹھے ہیں کہ بین الاقوامی برادری پاکستان میں جمہوریت کو نظرانداز کر دے گی۔ ہو سکتا ہے وہ درست رائے رکھتے ہوں لیکن اگر پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح فوجی آمریت کو داخلی آمریت کا جواز دینے کے لیے عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ کی اجازت دی جاتی ہے تو اس سے صرف اور صرف سیاسی عدم استحکام میں اضافہ ہوگا۔

جنرل مشرف کو بش سے دوستی مہنگی پڑے گی

فارسی کے مشہور شاعر حافظ شیرازی نے جرنیلوں کی ہوس ملک گیری کو نشانہ تنقید بناتے ہوئے کہا ہے کہ ''کسی جنرل کو پوری دنیا روند ڈالنے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے، وہ اُن مصائب و مشکلات کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی، جن کا فوج کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' 11 ستمبر 2001ء کے بعد پاکستان کے جنرل مشرف خوشی سے پھولے نہیں سمارہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شامل ہونے سے انہیں صدر بش کی قربت حاصل ہوگئی ہے اور امریکہ انہیں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب انہیں امریکہ میں کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ صدر کلنٹن نے اُن کے ساتھ دیر تک بات چیت سے انکار کر دیا تھا۔ 11 ستمبر کے بعد حالات نے اچانک پلٹا کھایا۔ امریکہ نے پاکستان کے تعاون کی ضرورت محسوس کی اور جنرل پرویز مشرف امریکہ کی غیر مشروط حمایت کا دم بھرنے لگے، تو صدر بش نے انہیں اپنے دوستوں کے حلقہ میں شامل کرلیا۔ تاہم جنرل پرویز مشرف نے صدر بش کی دوستی پر مسرت کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان کے انتہا پسند مذہبی طبقوں کو اُوپر آنے اور اقتدار میں شریک ہونے کا موقع دے کر عجیب صورت حال پیدا کرلی ہے۔

تکنیکی اعتبار سے دیکھا جائے تو پاکستان دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی سرپرستی میں بننے والے اس اتحاد کا بنیادی رُکن ہے، جو دنیا بھر میں القاعدہ کا سراغ لگانے اور اُسے کچلنے کی غرض سے تشکیل دیا گیا ہے۔ پاکستان میں طالبان کی حامی مذہبی جماعتوں کو اسی بنیاد پر اکتوبر کے الیکشن میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، جب کہ ان جماعتوں کی طرف سے زبردست دھاندلی کا شور مچایا جارہا

تھا۔ جنرل مشرف کی انوکھی قیادت نے اسلام آباد کو عجیب اُلجھن سے دوچار کر دیا ہے۔ پاکستان کو دوست بھی سمجھا جا رہا ہے اور شک کی نظر سے بھی دیکھا جا رہا ہے۔ دو حالیہ واقعات سے اس کا پتا چلتا ہے کہ اُن میں سے ایک پاک فوج کے ایک افسر کی امریکیوں سے جھڑپ ہو گئی، دوسرے امیگریشن کے نئے قواعد کے تحت پاکستان کے مرد شہریوں کے فنگر پرنٹ لیے جا رہے ہیں۔

ایک اور قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ ہفتے طالبان کا تعاقب کرتے ہوئے امریکی دستے پاکستان کی حدود میں داخل ہو گئے۔ پاک فوج کے ایک افسر نے اُن پر فائر کھول دیا، جس کے نتیجے میں ایک امریکی سپاہی زخمی ہو گیا۔ امریکیوں نے طیش میں آ کر اس مسجد پر 500 پاؤنڈ وزنی بم گرا دیا، جس میں فوجی افسر نے پناہ لے رکھی تھی۔ تاہم وہ افسر بال بال بچ گیا۔ دونوں افواج کے مابین یہ دوسری جھڑپ تھی، اس سے پہلے بھی ایک ناخوشگوار واقعہ رونما ہو چکا ہے۔

باوثوق ذرائع کے مطابق پاکستان کی فوجی یونٹوں کو اس امر کا خفیہ پیغام بھیجا گیا ہے کہ امریکہ کی سپیشل فورسز کے ساتھ تعاون جاری رکھیں۔ کھلی اور خفیہ پالیسی میں پائے جانے والے اس صریح تضاد نے پاکستان کے عوام اور فوج کو طرح طرح کے شکوک میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان پر دوہری پالیسی اپنانے کا الزام لگایا جاتا ہے تو وہ یہ وضاحت کرنے کی پوزیشن میں نہیں کہ پاکستان امریکہ کا دوست ہے، یا دشمن۔ غالباً یہ کمانڈو والی حکمت عملی ہے، جسے روبہ عمل لا کر دشمن کو اس طرح اُلجھن میں ڈالا جاتا ہے کہ وہ معاملے کی اصل حقیقت نہیں سمجھ پاتا۔

آج کل پاکستان کی عوام بھی اس طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ انہیں کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ امریکہ پاکستان کا حلیف ہے، یا حریف۔ امریکہ نے پاکستان کو اُن ممالک کی فہرست میں شامل کر لیا ہے، جن کے باشندوں پر امیگریشن کے نئے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ پاکستان کے جملہ مرد شہریوں کے لیے جن کی عمر 16 سے 45 سال کے درمیان ہیں، فنگر پرنٹ دینا لازم قرار دیا گیا ہے۔ اُن کی تصویریں بھی لی جاتی ہیں۔ اکثر پاکستانی اس سلوک پر شکوہ کرتے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف اتحاد کا بنیادی رُکن ہونے کے باوجود پاکستان کے شہریوں کو ناحق ہراساں کیا جا رہا ہے۔

1996ء میں جمہوریت کا جنازہ نکلنے کے بعد ملک میں ادارے بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ جب پاکستان اپنی سرحدیں خود بند کر سکتا تھا اور کسی کو مطلوبہ افراد کے تعاقب میں پاکستانی حدود کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ان دنوں پاکستان کی پولیس فورس نے ایک لسانی شورش کا قلع قمع کر دیا تھا، لیکن آج یہ حالت ہے کہ اسلام آباد نے ایف بی آئی

والوں کو مشکوک افراد کی گرفتاری کی اجازت دے دی۔ اپنی خودمختاری اور سلامتی گروی رکھنے کا معاوضہ یہ ملا کہ پاکستان کے بعض قرضے کچھ مدت کے لیے ری شیڈول کر دیئے گئے۔

پاکستان ایک عرصہ سے دہشت گردی کا نشانہ بن رہا ہے، بم دھماکے ہو رہے ہیں، لوگ ناحق مر رہے ہیں، اس کی روک تھام کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات نہیں کیے جا رہے۔ پاکستان کی حکومت اس گمان میں مبتلا ہے کہ اسے امریکہ کی لازوال دوستی حاصل ہے جب کہ امریکہ میں مقیم پاکستانیوں پر جو قیامت بیت رہی ہے، وہ ظاہر کرتی ہے کہ امریکہ پاکستان کا حلیف نہیں، حریف اور رقیب ہے۔ حافظ کا یہ قول واقعی سو فیصد صداقت کا آئینہ دار ہے کہ ''جنرل کو دنیا فتح کرنے سے جو خوشی میسر آئی، وہ اُن مشکلات اور قربانیوں کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتی، جن کا فوج کو، یا عوام کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔''

دہشت گردی اور غربت کا دور

دنیا کی توجہ دہشت گردی کے خلاف جنگ پر مرتکز ہونے کی وجہ سے غربت کے خلاف جنگ پر توجہ کم ہوگئی ہے۔ تین برس قبل ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر بمباری کے وقت سے تین عناصر منظر عام پر آئے ہیں:

اوّل، عسکریت کو ختم کرنے کی لڑائی۔

دوم، مذہب کے نام پر سیاسی ظہور (انتہا پسندی)

اور سوم، امیر اور غریب کے درمیان بڑھتا ہُوا فاصلہ۔

پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں فرنٹ لائن سٹیٹ ہے۔ پاکستان سے زیادہ تر سرکردہ دہشت گرد گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ القاعدہ کے آپریشنل چیف خالد شیخ کو راولپنڈی سے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ ہر چھ ماہ بعد القاعدہ کے اہم رہنماؤں کو جستہ جستہ گرفتار کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اُن گرفتار ہونے والوں میں تنزانیہ کے احمد خلفان گیلانی، جن کو پاکستان کے شہر گجرات سے گرفتار کیا گیا تھا، بھی شامل ہیں۔ یہ اسلام آباد کے فوجی حکمران کے لئے اچھی اور بُری خبر ہے۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ جنرل کو گرفتاریوں کا ڈرامہ رچانے کا اچھا موقع ملا ہے، اسی وجہ سے انہوں نے اپنی آمریّت کو برقرار رکھنے کے لیے واشنگٹن کی اشیر باد حاصل کرلی ہے۔ بُرا پہلو اس ناپسندیدگی کا اظہار ہے کہ القاعدہ کے سرکردہ جنگجو اِسی علاقے میں کیوں چھپے ہوئے ہیں، جہاں پر دہشت گردی کے خلاف جنگ میں واشنگٹن کے کلیدی اتحادی کی حکومت ہے۔ پاکستان کے لیے بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اندرونی سطح پر قتل و غارت اور خودکش حملوں میں اضافہ ہو رہا ہے، جس کے نتیجے

میں بہت سے پاکستانی اور کئی غیر ملکی مارے گئے۔ کئی اعلیٰ سیاسی رہنماؤں، جن میں پاکستان پیپلز پارٹی کے رُکن پارلیمنٹ بھی شامل ہیں، کو راولپنڈی کے شمال اور کراچی کی جنوبی گلیوں میں ہلاک کر دیا گیا۔ قاتلوں میں سے کوئی بھی گرفتار نہیں ہوا۔ گزشتہ دسمبر سے حکومت کی توجہ عوامی مفاد کے بجائے اعلیٰ سطح پر ہونے والے پانچ قاتلانہ حملوں کی کارروائیوں پر رہی ہے۔ اُن میں سے دو حملے جنرل پرویز مشرف پر، ایک کراچی کے کور کمانڈر پر، چوتھا حملہ نامزد وزیراعظم شوکت عزیز پر اور پانچواں حملہ بلوچستان کے وزیراعلیٰ پر ہوا۔ حکومت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ یہ قاتلانہ حملے سیاسی طور پر ہائی ویلیو ٹارگٹس کے خلاف تھے۔ اگر مثبت پہلو سے پرکھا جائے تو یہ زیادہ سے زیادہ ہائی ویلیو ٹارگٹس کو ہراساں کرنے کی کوششیں تھیں۔ اگر اسے منفی رنگ دیا جائے، جس طرح شکی مزاج افراد تصور کرتے ہیں کہ بیرونی استحصال کے لیے سب کچھ کیا گیا، تو یہ بہت ہی بُرا ہوگا۔ مثال کے طور پر حملے میں خودکش حملہ آوروں نے کم درجے کا دھماکہ خیز مواد استعمال کیا۔ ان حملوں میں یا تو کاروں کو نشانہ بنایا گیا، یا اُن کے قریب مواد پھٹا۔ ان میں جو ہلاکتیں ہوئیں وہ عوامی سطح کی تھیں اور ان حملوں میں کوئی بھی سیاسی شخص ہلاک نہیں ہوا۔ ان حملوں کے نشانے پر معصوم لوگ اور سیاسی طور پر ہائی ویلیو ٹارگٹس کے قافلے بنے ہیں۔ کسی بھی ہائی ویلیو ٹارگٹ یعنی جنرل پرویز مشرف، کور کمانڈر کراچی، نامزد وزیراعظم اور وزیراعلیٰ کو خراش تک نہیں آئی۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ وہ بچ گئے۔ لیکن بڑے مسائل کو حل کرنے کی ضرورت ہے مثلاً کیا حملہ آوروں کا مقصد ہائی ویلیو ٹارگٹس کو ہلاک کرنا تھا، یا کہ محض انہیں ہراساں کرنا تھا، یا اُن کا مقصد کچھ اور تھا؟ کور کمانڈر اور نامزد وزیراعظم کے ڈرائیور ہلاک ہو گئے، جب کہ کاروں میں سوار باقی لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ خودکش حملہ آور کا ہر بار کم درجے کا دھماکہ خیز مواد استعمال کرنا سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ وہ شخص جو کار میں بیٹھے ہوئے پر حملہ کر رہا ہے، اُس نے تو مرنا ہی ہے۔ (یا وہ شخص جو کار کے پاس دھماکہ خیز مواد لئے کھڑا ہے، اس نے تو مرنا ہی ہے۔)

خودکش حملوں کی تہہ تک پہنچنے والا عوامی کمیشن انکشاف کرے گا کہ خودکش حملہ آوروں کا اصل ارادہ کیا تھا۔ اُن کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حملے سے دوسری اہم تبدیلی جو منظر عام پر آئی ہے، وہ مذہبی انتہا پسندی ہے۔ دنیا کے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ایسے گروہ پیدا ہو گئے ہیں، جن کا یقین ہے کہ مذہبی وجوہات کے لیے تہذیبوں کے تصادم کی ضرورت ہے۔ عیسائی بنیاد پرستوں کا عقیدہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کو دوبارہ بھیجا جائے گا اور یہودی دریائے فرات پر دوبارہ آباد ہوں گے۔ مسلمان انتہا پسندوں کا یقین ہے کہ جب مسلمانوں اور غیر مسلم شدت پسندوں کے

درمیان لڑائی ہوگی، اس وقت امام مہدی ظہور پذیر ہوں گے۔ یہ سیاسی منظر نامہ ہے، جو دوسری جنگ عظیم کے بعد سے قائم معاشرتی ڈھانچے کو نیست ونابود کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ اس معاشرتی ڈھانچے کی بنیاد برداشت ہے، جیسے مختلف مذہبوں، نسلوں اور ثقافت کے درمیان ایک دوسرے کو برداشت کی صلاحیت۔ تہذیبوں کا تصادم آرماگیڈن (Armagaddon) کی طرف رہنمائی کرسکتا ہے، جہاں کرۂ ارض پر کوئی بھی فاتح نہ ہوگا۔ لیکن شاید مذہبی انتہا پسندی کرۂ ارض پر فاتح ہونے کی خواہاں ہے۔

عالمی برادری کے لیے چیلنج یہ ہے کہ برداشت، اعتدال پسندی اور بین المذہبی افہام وتفہیم پر زور دیا جائے، جس پر پُرامن دنیا کے ستون قائم ہیں۔ تاہم ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر بمباری اور عراق میں واقعات نے مسائل کو پیچیدہ بنا دیا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملوں نے مسلمانوں کے خلاف شکوک پیدا کیے، جس سے شہری آزادیاں ناپید ہوگئیں۔ عراق کے واقعات نے مسلمانوں میں عراق جنگ کے مقاصد کے بارے میں شکوک پیدا کیے۔ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی عدم دستیابی اور ابوغریب جیل میں قیدیوں کی بے حرمتی نے عراق جنگ کے لیے پیش کی گئی وجوہات کو نقصان پہنچایا۔ توجہ صرف دہشت گردی اور عسکری پسندی پر دی گئی، جس کی وجہ سے بڑھتی ہوئی غربت کے مسئلے پر سے توجہ ہٹالی گئی۔ اس وقت تجارتی مفادات چھائے نظر آتے ہیں۔ حال ہی میں میڈیا کی ایک رپورٹ نے دعویٰ کیا ہے کہ بیس برس قبل دولت مشترکہ کی رپورٹ کے مطابق آجر اجیر کے مقابلے میں چالیس گنا زائد منافع حاصل کررہا تھا۔ گزشتہ برس یہ شرح ایک کے مقابلے میں چارسو ہوگئی اور اب ایک کے مقابلے میں پانچ سو ہوچکی ہے۔

یہ ششدر کردینے والی ترقی بالائی طبقات کا مقدر ہے، جب کہ مصائب کا شکار نچلا طبقہ ایسے ناسور میں بدل سکتا ہے، جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔ اسی طرح پاکستان میں سٹاک مارکیٹ کے چڑھاؤ اور بڑھتے ہوئے زرمبادلہ کے ذخائر کے پس پردہ ایک تکلیف دہ تصویر موجود ہے۔ یہ تصویر بڑھتی ہوئی غربت، بھوک، بدحالی اور مایوسی کی ہے۔ چھ ماہ میں افلاس کی وجہ سے ہلاک ہونے والے جوان لوگوں کی تعداد بارہ سو تھی۔ یہ تفصیلات تو سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ہیں، جب کہ حقیقت میں ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ پاکستان میں اوسط آمدنی کم ہورہی ہے۔ عام شہری کے لیے یوٹیلیٹی بلز ادا کرنا اور بنیادی ضروریات پوری کرنا بتدریج مشکل ہوتا جارہا ہے۔ پاکستان معاشی سروے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ 1996ء میں جب سے جمہوری حکومت کو ہٹایا گیا ہے، غربت کی شرح میں اضافہ ہورہا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو محض طاقت کے استعمال پر

مبنی جنگ تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم معاشیات کی اپنی ایک طاقت ہے، جسے وہ اُن خاندانوں کے مایوس کن حالات میں استعمال کرتی ہے، جو اپنی ' گزر اوقات نہیں کر سکتے۔ زیادہ مستحکم دنیا طاقت کے استعمال پر اس وقت انحصار کرتی ہے، جب اس کی ضرورت ہوتی ہے اور ممکنہ صورت میں سیاسی حل بھی تلاش کرتی ہے۔ بہرحال سیاسی تصفیے میں زیادہ موزوں مشاورتی پوزیشن پیدا کرنے میں طاقت ایک کارروائی ہوتی ہے۔ عسکریت اور لالچ، نئی صدی، جس کا بہت زیادہ اُمید سے آغاز ہو چکا ہے، کی پہچان نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ عراق میں بڑھتی ہوئی ہلاکتیں، افغانستان میں سرکردہ این جی او کا اخراج اور پاکستان کے نامزد وزیراعظم پر حملہ ایسے مناظر ہیں، جن پر غور و فکر کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جمہوریت کی سادہ اقدار پر عمل کیا جائے۔ لوگوں کی مرضی کے مطابق حکومت کی تشکیل ہو اور ادارے بنائے جائیں، تاکہ معاشرتی بے چینی سے نمٹا جا سکے۔ مذہبی انتہا پسندی کے پس منظر میں بڑھتی ہوئی غربت کو نظر انداز کرنے سے پہلے سے پیچیدہ عالمی صورت حال مزید پیچیدہ ہو جائے گی۔

اسرائیل، امریکہ گٹھ جوڑ اور پاکستان

کبھی کسی دور میں پاکستان میں فیصلے ادارہ جاتی فریم ورک کے اندر ہوتے تھے، جہاں مختلف حکومتی شعبہ جات کے مابین بحث ہوتی تھی۔ اس کے نتیجے میں اتفاق رائے سے قابلِ یقین، قابلِ اعتماد، قابلِ جواز، سنجیدہ اور قابلِ قبول پالیسیاں سامنے آئی تھیں لیکن اب ایسا نہیں۔

جب سے کمانڈو سٹائل سیاست نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو نئے سرے سے تشکیل دینا شروع کیا ہے، اس وقت سے اس کھیل کا نام جلد بازی، تیز رفتاری ہوگیا ہے۔ 11 ستمبر 2001ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد اسی کھیل کا مظاہرہ کیا گیا۔ جیسے ہی امریکہ کے وزیر خارجہ کولن پاؤل کا فون آیا فوجی آمر اس فون کال پر ڈھیر ہوگیا۔ امریکی انتظامیہ کے لیے یہ حیران کن بات تھی (اس کا اظہار "Bush At War" نامی کتاب میں کیا گیا ہے) کہ جنرل پرویز مشرف دہشت گردی کے خلاف عالمی اتحاد میں قیمت لیے بغیر شامل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے یہ فیصلہ حکومتی اداروں کے ساتھ مشاورت کے بغیر کیا ہے۔ دفتر خارجہ، سکیورٹی سروسز، قومی سلامتی کونسل اور کابینہ، جو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شمولیت کی حمایت کرتی، کو نظر انداز کر دیا گیا۔

اس جلد بازی نے پاکستان کو اتفاق رائے اور قرض کے بوجھ کے اس ریلیف سے محروم کر دیا، جو آنے والی نسلوں کو مالی بوجھ سے نجات دلا سکتا ہے۔ مصر اور اردن جیسے دوسرے ممالک نے اس وقت اس قسم کا ریلیف حاصل کیا تھا، جب اُن کے خطّے میں اس طرح کی تزویراتی صورتِ حال پیدا ہوئی تھی۔ اس برس کے موسم گرما میں پاکستانی صدر، امریکی صدر بش، جو یک قطبی دنیا کے طاقت ور

ترین لیڈر ہیں، سے ملاقات کے لیے امریکہ میں کیمپ ڈیوڈ کے مقام پر تشریف لے گئے۔ اُن کا دورہ فلپائن کی صدر کے دورے کے بعد تھا۔ فلپائن کی صدر کو وائٹ ہاؤس میں شاندار ضیافت دی گئی، جب کہ انہیں دیئے گئے ڈنر کے موقع پر میرین بینڈ نے پس پردہ موسیقی کی دھنیں بکھیریں، یوں فلپائنی صدر کا دورہ ایک شاندار ریاستی دورہ تھا۔ اس کے برعکس پاکستانی صدر کے دورے کو کم تر درجے کا سرکاری دورہ سمجھا گیا۔ جیسے کاروباری دورہ ہوتا ہے، جو سادہ نوعیت کا تھا اور جسے کیمپ ڈیوڈ میں جلدی سے نمٹایا گیا۔ کیمپ ڈیوڈ کے دورے سے تر و تازہ ہونے کے بعد جنرل مشرف نے ٹیلی ویژن کے ٹاک شو میں جلد بازی اور تیز رفتاری کے ایک اور مظاہرے کا فیصلہ کیا۔ اب کی بار وہ اس امر پر بحث چاہتے تھے کہ پاکستان کو اسرائیل کو تسلیم کرنا چاہیے یا نہیں، اگر چہ پاکستان اور اسرائیل کے درمیان غیر رسمی روابط ضیاء الحق کے دور سے موجود تھے۔ لیکن پاکستان، اسرائیل کو تسلیم کرنے کے معاملہ کو یروشلم اور گولان کی پہاڑیوں کے مسئلے کے تصفیے سے مشروط کرتا تھا۔

شاید جنرل مشرف نے یہ سوچا کہ امریکہ جانے والے تمام راستے اسرائیل سے ہو کر گزرتے ہیں، یا پھر وہ اپنے عرصہ اقتدار میں توسیع چاہتے ہیں۔ تاہم جو بھی صورت ہو یہ اہم اعلان کابینہ، قومی سلامتی کونسل، یا پاکستانی فوج کے کور کمانڈرز سے مشاورت کے بغیر کیا گیا۔ حیران کن حد تک جنرل پرویز مشرف نے یہ سوچا کہ اسرائیل ایسی حقیقت پسند اور سخت جان ریاست کو پاکستان میں اس بحث سے ترغیب و تحریص ملے گی اور وہ بھارت کے ساتھ اپنے تزویراتی تعلقات ختم کر دے گا۔ بلاشبہ بھارتی وزیراعظم واجپائی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جلدی سے اسرائیلی وزیراعظم کو دورہ بھارت کی دعوت دے ڈالی تاکہ جو لوگ اندھیرے میں ہیں، وہ یہ بات جان لیں کہ اسرائیل بھارت گٹھ جوڑ محفوظ ہے۔ یک طرفہ ایکشن کے لیے اتفاق رائے کو ایک طرف پھینکنے کی جنرل مشرف کی کمانڈ و تدبیر کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پاکستان کو اس پر شدید قسم کے ردِعمل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پاکستان کے دفتر خارجہ نے بھارت اور اسرائیل کے درمیان بڑھتے ہوئے دفاعی تعاون پر انتہائی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ دفتر خارجہ کے ترجمان نے کہا کہ ''اس تعاون سے پاکستان متاثر ہوگا، کیونکہ اسرائیل بھارت گٹھ جوڑ پاکستان کے خلاف ہے۔ ہمیں اس پر انتہائی تشویش ہے کیونکہ یہ علاقے میں منفی پیش رفت ہے۔''

اسرائیل کا بھارت کے ساتھ دفاعی معاہدہ بھارت اور ایران کے درمیان چند ماہ پیشتر ہونے والے دفاعی معاہدے کے بعد سامنے آیا ہے۔ دوسری جانب پاکستان کے افغانستان کے ساتھ تعلقات مشکل سے ہی خوش گوار کہے جا سکتے ہیں کیونکہ طالبان نواز عسکریت پسند پھر سے اکٹھے ہو

رہے ہیں اور وہ کرزئی حکومت کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اس پس منظر کے المناک پہلو یہ ہیں کہ:

کُل جماعتی حرّیت کانفرنس، جو پاکستان کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتی ہے، تقسیم ہو گئی ہے۔

امریکہ، جو ماضی میں بھارت اور پاکستان کے درمیان مذاکرات میں مدد کرتا رہا ہے، نے ابھی تک صدر مشرف اور واجپائی کے درمیان سربراہ ملاقات کا تعین نہیں کیا ہے۔

ستمبر میں جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے برصغیر کے دو لیڈر نیویارک میں ہوں گے۔

لدّاخ میں بھارت فوجی مشقیں کررہا ہے۔ دفتر خارجہ کی بریفنگ کے مطابق یہ فوجی مشقیں متنازعہ علاقے میں کی جارہی ہیں۔ یہ مشقیں اسرائیلی وزیراعظم ایریل شیرون کے دورہ بھارت کے پس منظر میں بھارت، امریکہ عسکری روابط کے طور پر امریکہ کی خصوصی فورسز کے ساتھ کی جارہی ہیں۔ پاکستان اس ساری صورت حال میں لاچار اور بے بس ہے حالانکہ وہ امریکہ کا قریبی حلیف ہے۔

یہ صورتِ حال پاکستانی قیادت سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ انفرادی فیصلہ سازی کے افسوسناک ماضی پر قابو پالے۔ اگرچہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وقت اور قیادت ایک دوسرے کے مدّمقابل ہیں۔

ریاست کے اندر ریاست قائم کرنے کا نتیجہ

قوم سے اپنے خطاب کے دوران جنرل پرویز مشرف نے اسٹیبلشمنٹ کی مذہبی جماعتوں سے متعلق پالیسی کو لپیٹ دیا۔

جنرل مشرف نے دہشت گردی اور طالبان کے گاڈ فادر سے جدیدّیت کے نمائندے کے طور پر دوبارہ جنم لیا ہے اور یہ کارنامہ برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر اور امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ کولن پاوَل کی ماہرانہ خدمات کا نتیجہ ہے جس کا مقصد جنوبی ایشیا کو جنگ سے بچانا ہے۔

جہادی قوتوں کی پشت پناہی کی پالیسی کا قصہ پاک کر کے فوجی حکومت نے سیاسی قوتوں کے اس موقف کی تصدیق کر دی ہے جس کے تحت وہ بڑے عرصے سے اسے ''قومی سلامتی کے لیے خطرہ'' قرار دے رہی تھیں۔ سیاسی جماعتیں بڑے عرصے سے نجی مسلح گروپوں کے خلاف کریک ڈاؤن کی ضرورت پر زور دے رہی تھیں، جب فوجی حکومت کو ابھی جنگ کے اُمنڈتے بادلوں کا ادراک نہ ہُوا تھا اور پاکستان اس کی پالیسیوں کی بدولت بین الاقوامی طور پر تنہا ہو کر رہ گیا تھا۔

اب پاکستان میں دو مشرف ہیں: ایک 2002ء سے پہلے کا مشرف، جس کے طیارے کو سخت گیر جرنیلوں نے بحفاظت تخت شاہی پر لینڈ کرا دیا تھا۔ ان تین سالوں کے دوران جنرل مشرف نے پاکستان میں جہادیوں کی حامی قوتوں کے لیے ایک سویلین ڈھانچہ تعمیر کیا۔ اُن کے کلیدی ساتھیوں میں سے بیشتر ایسے تھے جو انٹیلی جنس کا پس منظر رکھتے تھے۔

دوسرا 2002ء کا مشرف جس نے کسی پشیمانی کا بوجھ اُٹھائے بغیر پہلے پاکستان کو ایک فوجی جنگ کے دہانے لا کھڑا کیا اور پھر پُر امن بقائے باہمی کے اُصولوں کو اپنا لیا جن کا ڈھنڈورا اِن کے

مخالفین ہر طرف پیٹتے پھرتے ہیں۔

بھارت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے جنرل مشرف نے خارجہ پالیسی کے انہی داؤ پیچ کا سہارا لیا جن سے پاکستان کے پہلے منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کام لیا کرتے تھے۔ بھٹو نے 1972ء میں شملہ معاہدے پر دستخط کیے اور اُن کی پارٹی نے 1988ء میں معاہدہ اسلام آباد طے کیا جس کے تحت پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے پر رضامند ہو گئے۔

11 ستمبر کو امریکہ میں بمباری کے واقعات نے دنیا کا رُخ بدل دیا لیکن مشرف حکومت نے اسے سمجھنے میں دیر لگا دی۔ پاکستان کے سیاسی قائدین نے جنرل مشرف پر زور دیا کہ وہ اسلام آباد کو لشکر طیبہ اور جیش محمد سے دور رکھیں لیکن افسوس کہ انہوں نے اُس وقت تک انہیں درخور اعتنا نہ سمجھا جب تک کہ نئی دلّی، واشنگٹن اور لندن حکومت کے جوڑوں میں نہ بیٹھ گئے۔ پھر جنرل مشرف نے ٹیلی ویژن پر عسکری گروپوں اور عسکریت پسندوں کے خلاف اپنی نو آموز پالیسی کا اعلان کر دیا۔

اس تقریر میں بھارت کو ''ٹھنڈا'' رہنے کی دھمکیاں کہیں نظر نہ آئیں جو وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے آغاز کے بعد اکتوبر میں دیا کرتے تھے، نہ ہی وہ بڑھکیں سنائی دیں کہ ہم ''بڑے موذی'' کے ذریعے ''چھوٹے موذی'' کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ مشرف نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ان کے زیر اثر ریاست کی بالادستی قائم نہیں رہی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آئندہ وہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ پاکستان کے آئین کے تحت اگر کوئی حکومت آئین کی روشنی میں ملک کو چلانے میں ناکام رہتی ہے تو اِسے مزید برسرِ اقتدار رہنے کا حق نہیں لیکن جنرل مشرف نے تو کوئی استعفیٰ پیش نہیں کیا نہ ہی اُن کی کابینہ نے ایسا کچھ کیا۔

جنرل مشرف کی تقریر اسٹیبلشمنٹ کی بعض انتہائی مرغوب پالیسیوں پر قلابازی تھی۔ انہوں نے ایک تھیوکریٹک ریاست کے تصور، نجی مسلح گروپ قائم کرنے کے حق اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے پاکستانی سرزمین کے استعمال کے ساتھ ساتھ ہمسایہ ملک بھارت کے ساتھ خارجہ پالیسی میں طاقت کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے پر کڑی نکتہ چینی کی۔ البتہ، جنرل مشرف کی تشکیل کردہ انتظامیہ، جو اُس وقت قائم کی گئی تھی جب سخت گیر جرنیل انہیں اقتدار میں لائے تھے، بدستور اپنی جگہ برقرار ہے۔

ریاست کی بالادستی قائم کرنے میں ناکامی کے ذمہ دار اداروں کی عدم اصلاح پر جنرل مشرف کے حقیقی ایجنڈے سے متعلق سوالات بھی غور طلب ہیں۔ تجزیہ نگار حیران ہیں کہ آیا نئے اعلانات جوڑ توڑ پر مبنی، یا تزویراتی نوعیت کے حامل ہیں، یا بعد ازاں ایک اور قلابازی کی نوبت بھی

آئے گی۔

جنرل مشرف کے لیے صرف نئی دلّی، واشنگٹن اور لندن کو خوش کرنے کے علاوہ اور بھی کچھ کرنا ضروری ہے۔ انہیں ایسے معاشرتی اُصولوں پر زور دینا چاہیے جن کی بدولت تشدد سے پاک نسل تیار کی جا سکے۔

اس قسم کے چیلنج سے نمٹنا ایک ایسی حکومت کے لیے خاصا مشکل کام ہے جو ایک بحران سے نکل کر دوسرے میں پھنس چکی ہو۔ ابھی افغان سرحد پر بندوقوں کی گھن گرج کا شور ختم نہ ہوا تھا کہ پاک بھارت فوجوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ دونوں افواج ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی ہیں اور ایسی صورت حال میں ایٹمی صلاحیت کی حامل دو ریاستوں کے درمیان تصادم کے خطرات شدید تر ہو گئے ہیں۔

ایک بحران سے نکل کر دوسرے میں داخل ہوتے ہوئے جنرل مشرف نے فوجی آمروں کی روایات کو پوری خوش اُسلوبی کے ساتھ نبھایا۔ تاریخی اعتبار سے پاکستان کے جمہوری قائدین نے ہمیشہ جنگ سے گریز کیا ہے جب کہ اس کے فوجی آمروں کی تاریخ اس کے برعکس ہے۔

جنرل ایوب کی فوجی آمریت نے پاکستان کو 1965ء کی جنگ کے بعد بدنام زمانہ معاہدۂ تاشقند میں اُلجھا دیا۔ جنرل یحییٰ خان کی فوجی آمریت نے 1971ء میں مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالے۔ جنرل ضیاء کی آمریت نے 1984ء میں سیاچن گلیشیر گنوا دیا۔ جنرل مشرف نے 1999ء میں تنازعہ کارگل کی بساط بچھائی۔ طالبان کو اسامہ بن لادن کی حوالگی پر آمادہ کرنے کی اُن کی عدم اہلیت، 2001ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر بمباری اور اس کے نتیجہ میں چھڑنے والی دہشت گردی کے خلاف جنگ کا موجب بنی۔ آگرہ میں قیام امن کے مقصد میں اُن کی ناکامی نے جنگ عظیم دوئم کے بعد 2002ء میں فوجی دستوں کی سب سے بڑی نقل وحرکت کے لیے راہیں ہموار کیں لیکن کسی حکومتی عہدیدار کو احتساب کا سزاوار قرار نہیں دیا گیا۔

پاکستانی عوام کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ اُن کا انتہائی بنیادی حق منصفانہ انتخابات کے ذریعے حکمرانوں کا احتساب ہے۔ اگر انتخابات جانب دار انتظامیہ کے تحت اور بھوت پولنگ سٹیشنوں میں ووٹ ڈالنے کے لیے الیکشن کمیشن میں کمپیوٹر ہیکنگ کے ذریعے غیر منصفانہ ہوئے تو پاکستان کا داخلی بحران مزید بدتر ہو سکتا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ جنرل مشرف نے اپنی تقریر کے دوران پاکستان میں ''ریاست کے اندر ایک اور ریاست'' کے جڑ پکڑنے کی بات کی۔ سیاسی قوتیں یہ محاورہ فوجی انٹیلی جنس ایجنسیوں

کے لیے استعمال کرتی ہیں، جب کہ سویلین لیڈر انہیں بوجوہ ریاست کے اندر ایک اور ریاست کا نام دیتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ سویلین حضرات فوجی افسروں کی ترقی، تنزلی، فراغت، یا کورٹ مارشل کے علاوہ بھرتی کرنے کا آئینی اختیار نہیں رکھتے۔ جب کہ جنرل مشرف کو بطور آرمی چیف یہ اختیارات حاصل ہیں۔ اُن کے زیر اثر تو ''ریاست کے اندر ایک ریاست'' کا وجود خاصا مشکل ہے اور اگر طے شدہ پالیسی اور دھونس کی پالیسی کے درمیان عدم تعلق پایا جاتا ہے تو پھر یہی ہوسکتا ہے کہ پاکستان دو کشتیوں پر سوار ہے۔

جمہوری حکومتوں کے ادوار میں پاک فوج کو قیام امن کے مشنوں میں اس کے کردار پر خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے لیکن تین حوالوں سے انہیں ہدف تنقید بنایا جاتا ہے:

اول، پارلیمنٹ پر دھاوا بولنے کی صورت میں اُن کا اپنے جیوسٹریٹیجک وژن پر اصرار۔ دوم، منتخب نمائندوں کے جیوسٹریٹیجک وژن کے نفاذ سے انکار کرتے ہوئے انہیں عدم استحکام سے دوچار کرنا اور سوم، سول اُمور کی انجام دہی کا فریضہ سنبھال لینا مثلاً گیس بل جمع کرنا، وغیرہ۔

علاوہ ازیں مجاہدین کوئی آسمان سے تو نہیں اُترے تھے وہ بھی تو اسٹیبلشمنٹ کے ہی پروردہ اولاد تھے۔ جب والدین انتقام سے بچنے کے لیے اور بچوں کو نگلنے کے لیے دانت تیز کرنے لگتے ہیں تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔

پاکستان میں کشمیری عوام کے لیے عظیم ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں، بھلے کئی گروپوں میں غیر کشمیریوں کے گھس جانے پر تنقید بھی کی جاتی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ نے مجاہدین کو کارگل کی برفانی سردی میں مرنے کے لیے بھیج دیا۔ اسی طرح انہیں تباہ حال افغانستان کی سخت آب و ہوا میں بھی مرنے کے لیے روانہ کردیا گیا۔ وہ جنہیں استعمال کیا گیا انہیں اسٹبلشمنٹ کی غلط پالیسی کی قربان گاہ پر اذیت کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ پالیسی جس نے جمہوریت کو عدم استحکام کا شکار اور وطن دوستوں کو ''غدار'' قرار دلواتے ہوئے غریب گھرانوں کے نوجوانوں کو بندوقیں اُٹھانے پر مائل کیا۔ شاید ماضی کے دوست اور دشمن پشیمانی کے چند الفاظ کے تو حق دار ہیں۔

بھارت کے ساتھ جنگ کا خطرہ اللہ کرے ٹل جائے لیکن ابھی ختم نہیں ہوا۔ جب کہ پاکستان کے پہاڑی دروں میں افغان جنگ کے ساتھ آنے والی نسل پرستی کی لہر سمیت اور بھی کئی چیلنج دروازے پر دستک دے رہے ہیں۔

کابل میں پاکستان کی حامی حکومت کی جگہ بھارت کی حامی حکومت کی آمد اس بات کا اشارہ ہے کہ دو اہم صوبوں یعنی بلوچستان اور سرحد میں پشتون قوم پرستی کی لہر دوبارہ سر اُٹھانے والی ہے

کیونکہ یہ دونوں صوبے ناراض پشتون افغانوں اور برہم مزاج قبائل کے گھر ہیں۔

ایک لیڈر کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی پالیسیاں مرتب کرے جن میں معروضی حالات کا تجزیہ شامل ہو اور اُن سے ملکی فلاح و بہبود کو فروغ ملے۔ جنرل مشرف نے ستمبر 2001ء میں یہ مژدہ سنانے کے لیے قوم سے خطاب کیا کہ وہ ''بڑے موذی'' (بھارت) کے خلاف حمایت حاصل کرنے کے لیے ''کم تر موذی'' (امریکہ) کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شامل ہو رہے ہیں۔ اُبھرتے ہوئے عالمی حقائق کی روشنی میں یہ الفاظ بے محل تھے۔ جن دونوں قوتوں کو موذی قرار دیا گیا وہ انہیں مسلح گروپوں اور عسکریت پسندوں کے خلاف کارروائی پر مجبور کرنے کے لیے ایک ہو گئیں۔ (یہ ایک الگ بات ہے کہ اُن کے خلاف کریک ڈاؤن بھی ضروری تھا۔)

جنگ کا خطرہ پیدا ہونے سے پہلے جنرل مشرف کو قیام امن کے کئی مواقع ملے۔ اس طرز کا ایک موقع آگرہ سربراہ ملاقات تھا۔ وہاں وہ کوئی معاہدے طے کرنے کے بجائے تاج محل اور اپنے آبائی گھر کے سامنے تصویریں بنواتے رہے۔ ایک اور موقع اس وقت آیا جب پاکستان اور بھارت دونوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شمولیت اختیار کی۔ لیکن اس مرتبہ اس غلط فہمی میں نئی دِلّی کو بھڑکا دیا گیا کہ انکل سام کو تورابورا میں اسلام آباد کی ضرورت ہے اور وہ کشمیر کا قصہ بھی پاک کرائے گا۔ دیگر غلط اندازوں میں کابل کا تختہ اُلٹنے کے باوجود طالبان سے چپکے رہنے پر اصرار اور یہ توقع رکھنا کہ رمضان کے دوران جنگ جاری نہیں رہے گی، حالانکہ شمالی اتحاد کابل کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

گزشتہ تین برس کا قصہ زبوں حالی کی ایک المناک داستان ہے۔ جو اِب انتہائی ناگفتہ بہ حالت تک جا پہنچی ہے۔

اسٹیبلشمنٹ نے اس وقت اپنی آنکھیں بند کیے رکھیں جب نجی مسلح گروپوں میں اُن کے نائبین نے پوسٹر چھاپے، ٹرک کرائے پر لیے، کیمپ لگائے اور افغانستان میں ''زمینی جنگ'' کی خاطر ''جہاد میں شامل ہونے کا نعرہ'' لگا کر نوجوانوں کو ورغلایا۔ ہزاروں پاکستانی نوجوان سرحد پار چلے گئے۔ افغانستان کے گلی کوچوں میں بکھری ان کی لاشوں کو گدھ نوچتے رہے۔ جو قید ہوئے انہیں یرغمال بنایا گیا اور اب اُن کے اہل خانہ سے تاوان کے مطالبے کیے جا رہے ہیں۔ جن کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہونے کے لیے انہیں مدرسوں میں بھیجا تھا۔

یہ اسی لاتعلقی اور ہٹ دھرمی کا کیا دھرا ہے کہ پاکستانی قوم فوجی حکومت کی غلط پالیسیوں کی انسانی اور سیاسی قیمت چکا رہی ہے جو ایک عام پاکستانی کے لیے ناقابل قبول ہے۔ مغرب جنرل مشرف کو اُن کی بعد از 11 ستمبر اور جنوری 2002ء پالیسیوں کی وجہ سے قبول کرتا ہے۔ پاکستانی قوم

اُن کی قبل از 11 ستمبر اور جنوری 2002ء کی پالیسیوں کا نشانہ بنی ہوئی ہے اور نتیجتاً مصائب و آلام سے گزر رہی ہے۔

یہ مشرف حکومت ہی تھی جو اسامہ بن لادن کو حاصل کرنے میں ناکام رہی اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر بمباری، یا جواباً بی 52 ڈیزی کٹر اور آکسیجن ختم کر دینے والے بموں کی یلغار کا راستہ نہ روک سکی۔ مشرف نے کارگل کا میدان سجایا اور اسی طرح آگرہ سربراہ ملاقات کو بھی ناکام کروا دیا۔ اُن کی حکومت پر قلابازیوں کا بوجھ لدا ہے جس نے اُس کا اعتبار ختم کر دیا ہے۔

جرنیل مغربی دنیا اور بھارت سے اُمید لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ عسکریت پسندوں کے خلاف کریک ڈاؤن کے انعام کے طور پر انہیں اپنا اقتدار جاری رکھنے کی اجازت دے دیں گے۔ مغرب اور بھارت ضرور اُن کی اُمیدیں پوری کریں گے لیکن ایسا پاکستانی قوم کی قیمت پر ہی ہوگا۔

شاہ ایران خطے میں آزاد دُنیا کے تھانیدار کا کام کرتے تھے۔ جمہوری قوتوں کو بے دخل کرنے کی اُن کی پالیسیوں نے انقلاب ایران کی راہیں ہموار کیں جس کے اثرات اب بھی باقی ہیں۔ کنگز پارٹی کے کندھوں پر سوار فوجی حکومت کو، جس نے سیاسی قوتوں کے خلاف محاذ جنگ کھول رکھا ہو، مذہبی جماعتوں کے اشاروں پر ناچنا پڑتا ہے۔ فوجی اور سلامتی کے اُمور سے متعلق حکام کے ساتھ اُن کے خفیہ رابطے غیر جمہوری معاشروں میں انہیں ناجائز فوائد اُٹھانے کا بھرپور موقع فراہم کرتے ہیں۔

ایک خوبی جو اسلام آباد کے فوجی حکام میں اُوپر سے نیچے تک یکساں طور پر پائی جاتی ہے وہ ہانڈی سے نکل کر چولہے میں کودنے کی طرف اُن کا رجحان ہے۔ بیرونی قوتوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے عوام کے بارے میں اُن کے غیر لچک دار رویئے نے انہیں اندرونِ ملک اعتماد سے محروم کر دیا ہے۔ امن، جمہوریت، انسانی حقوق اور قانون اور انصاف کی حکمرانی جیسی اقدار سے اُن کا انحراف سول سوسائٹی کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ یہ ایک حکومت ہے جو تشدد کی پیداوار ہے، تشدد پیدا کر رہی ہے اور تشدد کے ہاتھوں پٹ رہی ہے اور عین ممکن ہے کہ اس کا انجام بھی تشدد کے ہاتھوں ہی لکھا ہو۔

پاکستان ایک ایسی حکومت کا حق دار ہے جو اس آمرانہ نظام سے بہتر ہو، جو اقتدار کی خاطر بیرونی قوتوں کی ناز برداری میں مصروف ہے۔

جنگ کیسے ٹل سکتی ہے؟

جنگ کی فضا موجود ہے۔ بے بس اداکاروں کی طرح پاکستان اور بھارت دونوں ممالک بے رحمانہ طریقے سے مہلک اور تباہ کن جنگ کی سمت بڑھ رہے ہیں۔

نفرت اور انتقام کے جذبے نے اس مہلک جنگ کو ہوا دی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کش مکش سے بھی محاذ آرائی کی شدت میں اضافہ ہوا جس کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان نصف صدی کے دوران تین جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔

نفرت کے محرک کے نتیجے میں کشمیری عسکریت پسند جنھوں نے بھارتی فوجیوں کا روپ دھار رکھا ہے، کشمیر کی خون آلود اور مقبوضہ وادی میں بندوقوں اور گرنیڈ کے ساتھ بچوں اور خواتین کو بے دریغ کاٹ رہے ہیں۔ وہ بدلہ لینا چاہتے ہیں جس کے لیے اُنھوں نے یہ لائحہ عمل اختیار کیا ہے۔

وہ سرحدوں پر متعین بھارتی فوج کے سپاہیوں کے بچوں اور بیویوں کو قتل کرتے ہیں۔ اُن کا پیغام واضح ہے اور وہ یہ ہے اگر عسکریت پسند بھارتی فوج کے اہل خانہ کو گھروں کے اندر نشانہ بنا سکتے ہیں تو لائن آف کنٹرول پر موجود بھارتی فوجی انہیں مشکل ہی سے روک سکتے ہیں۔

بھارتی فوجی جب اپنی بیویوں، بیٹیوں اور بیٹوں کو خون آلود کپڑوں میں دیکھتے ہیں تو اُن کے اندر نفرت اور بدلہ لینے کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ عسکریت پسندوں کا شکار ہونے والے بھارتی فوجیوں کے ساتھیوں کے دل میں بھی نفرت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ وہ بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ بھارتی وزیراعظم واجپائی پر یہی دباؤ ہے کہ حربی کارروائی کے ذریعے بدلہ لیا جائے۔

سی آئی اے کے امریکی سربراہ نے مارچ میں بھی اس طرح کی جنگ کے امکانات کی پیش

گوئی کر دی تھی۔ سینیٹ کی مسلح سروسز کمیٹی کے سامنے تصدیق کرتے ہوئے ٹینیٹ نے کہا "اگر بھارت کو پاکستان کے زیر کنٹرول کشمیر کے علاقے میں بڑے پیمانے پر جارحانہ آپریشن کرنا پڑا تو پاکستان ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے جوابی حملہ اس یقین کے ساتھ کر سکتا ہے کہ اس کا نیوکلیئر ڈیٹرنٹ بھارت کے جوابی حملے کی وسعت کو محدود کر دے گا۔"

دو برس قبل امریکی صدر کلنٹن نے جنوبی ایشیا کو دنیا کا خطرناک ترین خطہ قرار دیا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے بھارتی اور پاکستانی فوجی لائن آف کنٹرول پر ایک دوسرے کے سامنے جنگ کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ سرحد پر فوجیوں کا اتنی بڑی تعداد میں اجتماع گزشتہ برس بھارتی پارلیمنٹ پر حملے کے نتیجے میں سامنے آیا۔

اب بھارت نے پاکستانی ہائی کمشنر کو اپنے ملک سے نکال دیا ہے۔ بھارت کے وزیراعظم اور اپوزیشن کے درمیان ہم آہنگی اور یک جائی پائی جاتی ہے، جب کہ بھارتی پارلیمنٹ نے عسکریت پسندوں کے خلاف زبردست ایکشن کا مطالبہ کیا ہے۔ جنگ کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔

بین الاقوامی برادری کو خطے میں شدید خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ پاکستان امریکہ کی زیر قیادت ان فورسز کا اہم حلیف ہے جو ہمسایہ ملک افغانستان میں کارروائی کر رہی ہیں۔ امریکہ آخر میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تبدیل ہوتا دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر عسکریت پسند اتحادی فوجوں کی توجہ پاکستان اور افغانستان کے قبائلی سرحدی علاقوں میں القاعدہ کے خلاف کارروائی سے ہٹانا چاہتے تھے تو وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ عسکریت پسندوں کی طرف سے گزشتہ برس ستمبر میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے جڑواں ٹاورز پر حملے کے بعد جو جنگ شروع ہوئی تھی اس جنگ کے شروع ہونے کے بعد اس بات کا قطعی امکان تھا کہ سری نگر میں بھی جنگ شروع ہو جائے گی جس کے پس پردہ محرک وہ عسکریت پسند ہوتے جو پاکستان اور بھارت کے درمیان کش مکش اور محاذ آرائی کو فروغ دینے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

بین الاقوامی برادری کی جانب سے ایک بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک فوجی آمر بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کو کم کر سکتا ہے، یا انتہا پسندی کی ان لہروں کو روک سکتا ہے جو اب خطے میں خلیج پیدا کر رہی ہیں۔

بین الاقوامی برادری کی دوسری بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ داخلی علاقائی تنازعات اور دہشت گردی کے درمیان تمیز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ فلسطینی اتھارٹی پر ہلّہ بولنے کے لیے اسرائیلی وزیراعظم ایریل شیرون نے تبدیل شدہ عالمی تصورات کو استعمال کرنا چاہا تو مشرق وسطیٰ کی صورت

حال انتہائی کشیدہ ہوگئی۔

اب بھارت بھی اسی طرح کی غلطی کا ارتکاب کرتا نظر آتا ہے۔ درحقیقت مابعد ستمبر کی دنیا سیاسی حل کے بجائے فوجی حل کی جانب مائل نظر آتی ہے۔

بھارت کے سرکاری افسران کی جانب سے اس طرح کی باتیں کی جارہی ہیں کہ محدود عسکری حملوں کے ذریعے پاکستان کے زیر کنٹرول کشمیر کے علاقے میں ٹریننگ کیمپوں کو تباہ کر دیا جائے۔ لائن آف کنٹرول کے پار بڑے پیمانے پر فائرنگ کا تبادلہ ہورہا ہے۔ لائن آف کنٹرول کے قریب دیہاتوں میں رہنے والے دیہاتی اس شور کے ساتھ اپنے علاقے چھوڑ رہے ہیں کہ پاک بھارت چوتھی جنگ ہوسکتی ہے۔

یہ ہولناک منظر ہے۔ مغربی ممالک نے انتہائی سرعت سے اپنے سفارت کاروں کو خطے میں کشیدگی کم کرنے کے لیے بھیجا۔ جنرل مشرف کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ایک بہت بڑی اُمید تصور کیا جارہا تھا، لیکن اب یہ اُمید دم توڑتی نظر آتی ہے۔ ان کے دور میں انتہا پسندی، عسکریت پسندی اور علاقائی کشیدگی میں اضافہ ہوا ہے۔

اُنھوں نے آگرہ میں بھارت کے ساتھ اعتماد کی فضا پروان چڑھانے والے موقع کو ضائع کر دیا۔ انہیں کارگل کش مکش کا روح رواں سمجھا جاتا ہے۔ اس کش مکش کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت جنگ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ان کی سیاست انہیں داخلی سیاسی قوتوں کے خلاف عملی مخالفت پر اُبھارتی ہے جس سے ملک میں انتشار پھیل رہا ہے۔ اس طرح کی تاریخ کو مدّنظر رکھتے ہوئے اس بات کا امکان ہے کہ مذاکرات کی تجاویز اس سفر کو روک لیں گی جو جنگ کی سمت شروع ہو چکا ہے۔

جنگ کے امکانات سے بچنے کا ایک راستہ موجود ہے۔ یہ راستہ ہے حکومت کی تبدیلی کا۔ پاکستان میں حکومت کی تبدیلی سے نئے آغاز کا امکان پیدا ہوسکتا ہے۔ اس طرح کی تبدیلی پاکستان آرمی کی آفیسرز کور کے ذریعے آسکتی ہے۔ وہ جنرل پرویز مشرف کو مستعفی ہونے کے لیے کہہ سکتے ہیں۔ اس سے نئی حکومت کو صاف ذہن کے ساتھ اعتماد پیدا کرنے والے مذاکرات کا موقع مل سکتا ہے۔

ایسا ایک مرتبہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ 1971ء میں پاکستان آرمی کے سینئر افسران فوجی آمر جنرل یحییٰ خان کے پاس گئے، جن کے پاس آرمی چیف کا بھی عہدہ تھا اور انہیں مستعفی ہونے کے لیے کہا۔ جنرل یحییٰ نے ایسا ہی کیا جس سے نئی حکومت کی تشکیل کا کام آسان ہوا۔ نئی حکومت نے

بکھرے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا۔

اس نئی حکومت نے 1972ء میں شملہ معاہدے پر دستخط کیے۔ اس معاہدے سے دونوں ملکوں کے درمیان کافی عرصے تک امن رہا۔ یہاں تک کہ 1998ء میں دونوں ملکوں نے ایٹمی دھماکے کیے۔ 1998ء کے بعد سے اب تک دونوں ممالک تین مرتبہ جنگ کے کنارے پہنچے ہیں۔

اطلاعات اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ کور کمانڈرز ایسا کر سکتے ہیں۔ ابتدائی طور پر اُنہوں نے متنازعہ ریفرنڈم کے انعقاد کی مخالفت کی جو جنرل مشرف نے اپنے صدر بننے کے لیے منعقد کیا تھا۔ جب ان کمانڈرز کے سپاہی مشرقی اور مغربی سرحدوں پر پھیل گئے تو انہیں بیک وقت دو محاذوں کو سنبھالنا ہوگا۔

پاکستان کے اہم اور طاقتور حلیف امریکہ کا نقطۂ نظر بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ امریکہ نے جنرل پرویز مشرف کی کھل کر حمایت کی۔ صدر بش نے انہیں اپنا دوست کہا، اب انہیں ایسے فرد جنہیں وہ اپنا دوست قرار دیتے ہیں اور محدود جنگ کے خطرے، جو بے قابو بھی ہو سکتی ہے، میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

بھارت فوجی ایکشن شروع کرنے سے قبل ایسا تاثر ظاہر کرے گا کہ اسے امریکی حمایت حاصل نہیں، لیکن بھارت کو ایکشن کی اس سے زیادہ آزادی حاصل ہوگی جتنی کہ کارگل جنگ کے دوران پاکستان کو حاصل تھی۔ تب صدر کلنٹن نے قرضوں میں جکڑے ہوئے پاکستان کو آئی ایم ایف کا یرغمال بننے کو کہا تھا۔ صدر بش کے لیے بھارت کو یہی کچھ کہنا مشکل ہے۔ بھارت کی معیشت بڑی حد تک آزادانہ ہے۔

صدر بش کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے وہ بھارت کو روک سکتے ہیں۔ یہ ہتھیار کشمیر کے مسئلے پر بین الاقوامی ثالثی کا ہے۔ بھارت اس مسئلے میں بین الاقوامی ثالثی کی مخالفت کرتا ہے۔

عسکری طور پر دھچکا لگنے سے جنرل پرویز مشرف کی کامیابی کے امکانات مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے۔ ان کے اور خطے کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ حکومت کی تبدیلی پر رضامند ہو جائیں تاکہ مسلح جنگ سے بچا جا سکے جو نیوکلیئر تباہی بھی لا سکتی ہے۔

بھارت کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ اپنا منہ رکھنے کی خاطر حکومت کی تبدیلی کو قبول کر لے، بجائے اس کے کہ وہ محدود جنگ کرے جو بے قابو بھی ہو سکتی ہے۔

بھارت کو یاد ہوگا کہ پاکستان وقت اور علاقے کے حوالے سے محدود جنگ میں بہترین

کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ پاکستان کی فوج پوری طرح اسلحے اور ہتھیاروں سے مسلح ہے۔ محدود جنگ، طویل جنگ کی صورت اختیار کرسکتی ہے اور طویل جنگ موسم گرما کے درجہ حرارت کو بڑھا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ دونوں ملکوں کے کچھ علاقوں میں درجہ حرارت 50 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جائے گا۔

گزشتہ مارچ سینیٹ کی کمیٹی کے سامنے اپنی شہادت میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر نے کہا تھا کہ ''11 ستمبر کے حملوں کے نتیجے میں پاکستان کو حلیف بنانے کا فیصلہ بنیادی سیاسی تبدیلی کا حامل فیصلہ تھا جس میں بنیادی طور پر خطرات مضمر تھے''۔

اب یہ خطرات واضح ہوکر سامنے آرہے ہیں کہ جنوبی ایشیا کا خطہ جنگ کے خطرے سے دوچار ہے۔

عالمی مذاہب: مفاہمت کی ضرورت

11 ستمبر کو جو المیہ امریکہ میں پیش آیا، اس کی لہریں آج بھی پورے کرۂ ارض پر محسوس کی جارہی ہیں۔ اس روز القاعدہ نے جو حملہ کیا، اس کے تین بڑے اہداف تھے:

(1) وہ مظلوم لوگ جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے طیاروں کے ٹکرانے کے نتیجہ میں جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، اُن کے ساتھ افغانستان کے بے یارومددگار عوام بھی مظلوم ہیں، جن پر القاعدہ اور طالبان کی قوتوں نے جنگ مسلّط کردی۔

(2) اسلام کا تصور بھی اس ظلم کا نشانہ بنا، جس کے بارے میں طرح طرح کے غلط الزامات پھیلائے گئے، اور

(3) جمہوریت بھی اس ظلم کا نشانہ بنی، کیونکہ اس کے بعد جمہوری اقدار کے بجائے تزویراتی (دفاعی حکمتِ عملی) افکار پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔

امن کا زمانہ، جس کے لیے لوگ دعائیں کرتے رہے تھے، جنگ کے دور میں بدل گیا، تحمل و برداشت کی جگہ دہشت گردی نے لے لی اور پاکستان میں جمہوریت کو آمریت کے خطرات لاحق ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں بھی خودکش بم دھماکے ہونے لگے۔ مسیحیوں کے گرجا گھر، مسلمانوں کی مساجد، شہروں میں ہوٹل، غیر ملکی قونصل خانے اور مغربی اخبار نویس، سبھی دہشت گردوں کے نشانہ پر ہیں۔ درجنوں افراد قتل بھی ہو چکے ہیں۔ عالمی برادری مشرق وسطیٰ میں تو جمہوریت کے قیام کی تیاریاں کررہی ہے، مگر پاکستان میں ایک فوجی آمر اُن کا اہم ترین حلیف بن چکا ہے۔

اسلام تو تحمل و برداشت کا مذہب ہے۔ اِجماع (اِتفاق رائے) کے اُصول کے تحت اسلام کا

جمہوریت سے گہرا تعلق ہے۔ بدقسمتی سے جمہوریت کے ساتھ گہری لگن کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت آمریت کے سایہ میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ مغرب میں اکثر نام نہاد ''اسلامی سٹریٹ'' کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ مغرب جس ''سٹریٹ'' کا ذکر کرتا ہے، وہ دراصل انتہا پسندی کی ''گلی'' ہے۔ لیکن ایک اور اسلامی سٹریٹ بھی ہے، جہاں خواتین سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے، طلبا غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، تاجروں کو آزادی سے تجارتی مسابقت کی اجازت نہیں، انسانی حقوق کا مطالبہ کرنے والوں کو جیلوں میں بند کر دیا جاتا ہے اور سیاسی جماعتوں کا ''قتل عام'' کیا جاتا ہے۔ یہ لوگوں کی ''گلی'' ہے، جس پر ریاستی جبر کی قوت نے قبضہ کر رکھا ہوتا ہے۔ یہ ایسے مستقبل کی ''سٹریٹ'' ہے، جو عام اور معمولی مذہبی انتہا پسندوں کی ''سٹریٹ'' سے پہلے دھماکہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔

اکیسویں صدی میں مسلمان اس آزادی کے متلاشی ہیں، جو دنیا کے دوسرے حصوں کے عوام کو حاصل ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تلاش میں ہیں، جو نمائندہ اور جواب دہ ہو اور جس کا وہ خود اپنے لیے تعین کر سکیں۔ مغرب دہشت گردی کے خلاف جنگ کے ذریعے آزادی کے تحفظ کا دعویٰ دار ہے، مگر پاکستان میں مغرب کا اصل حلیف ایک ڈمی (مصنوعی) پارلیمنٹ کا قیام عمل میں لانے میں مصروف ہے تا کہ وہ اس کے فیصلوں پر صادر کر سکے اور مہر تصدیق ثبت کر سکے۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی ایک ہی جدامجد (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے خلف ہیں، جو اُن کے دو بیٹوں کی اولاد ہیں۔

(حضرت) اسحاق (علیہ السلام) کی اولاد تو جمہوریت میں زندگی بسر کر رہی ہے،
مگر (حضرت) اسماعیل (علیہ السلام) کی اولاد آج بھی آمریت کے سائے میں رو رہی ہے۔

مسلمان، یہودیوں اور عیسائیوں کے پیغمبر کو بھی اپنا پیغمبر تسلیم کرتے اور مانتے ہیں۔ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی آسمانی کتابوں کو بھی اپنی مقدس کتاب کی طرح ہی تسلیم کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام مختلف انبیاء اور مرسلین کے ذریعے مختلف نسلوں تک پہنچایا گیا۔ اس کا مقصد انسانیت کو نجات ابدی کی راہ دکھانا تھا اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے معبوث فرمائے۔ یہ بات باعث تشویش ہے کہ مسلمانوں کو ابھی تک امن پسند قوم تسلیم نہیں کیا جاتا، جو وہ دراصل ہیں۔ 11 ستمبر کا ایک اثر یہ مرتب ہوا کہ مسلمانوں کو تشدد پسند، غیر متحمل اور معصوم لوگوں کا جنونی قاتل سمجھا جانے لگا۔ ابی سینیا (حبشہ) کے نجاشی کے دنوں کو

فراموش کر دیا گیا ہے، جس نے مسلمانوں کو یہ مانتے ہوئے پناہ دی تھی کہ مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان ایک نہایت نازک سی لکیر ہے، جو انہیں الگ کرتی ہے۔ اب مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ مغرب میں اُن پر شک وشبہ کا اظہار کیا جاتا ہے اور اُن کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جارہا ہے۔ اکیسویں صدی، وہ صدی ہے جب انفرادی حقوق انسانی کا غلغلہ بلند ہوا اور یہ تسلیم بھی کیے جانے لگے۔ اب اکیسویں صدی میں اس انسانی کامیابی کو، جو بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کی گئی تھی، ختم کیا جارہا ہے۔ مسلمانوں کا احساس ہے کہ عالمی تعصب اور نفرت کا نشانہ صرف وہ ہیں، چنانچہ مختلف مذاہب کے درمیان مکالمہ اس نازک دور میں زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔

ستمبر وہ مہینہ ہے، جس میں دنیا بھر میں امریکہ پر حملہ کی یاد سنجیدگی کے ساتھ منائی گئی۔ اس المیہ میں ہلاک ہونے والے معصوم لوگوں کو یاد کیا گیا، اُن کے لیے دعائیں مانگی گئیں اور یہ عہد کیا گیا کہ آئندہ اس نوع کا المیہ وقوع پذیر ہونے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی وقت ہے کہ اس جنگ کے شکار معصوم لوگوں پر اس کے اثرات پر بھی غور وفکر کیا جائے، جو چند انتہا پسندوں نے مسلّط کر رکھی ہے۔ یہ انتہا پسند اب دوبارہ منظّم ہورہے ہیں۔ دنیا سمجھتی ہے کہ یہ انتہا پسند اس نوع کا ایک اور المیہ برپا کر سکتے ہیں، چنانچہ پوری دنیا ہوشیار اور تیار ہے۔ اگر انتہا پسند اپنے مذموم مقاصد میں دوبارہ کامیاب ہوگئے تو وہ دنیا کے عظیم مذاہب کے درمیان اس طرح کا عدم تحمل پیدا کر سکتے ہیں، جو شاید صلیبی جنگوں کے بعد کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

نیویارک کے ٹریڈ سنٹر سے طیاروں کے ٹکرانے کے بعد اب وقت آ گیا ہے کہ اس واقعہ اور اس کی وجوہ پر غور وفکر کیا جائے۔ انتہا پسند عالم اسلام اور مغرب کے درمیان صلیبی جنگ شروع کرانے کے درپے ہیں۔ یہ جنگ باہمی افہام وتفہیم، زخموں پر مرہم رکھنے کے عمل اور مفاہمت و مصالحت کے ذریعے ہی دور کی جاسکتی ہے۔ یہی ایک ایسا عمل ہے، جو پوری دنیا کے عوام مذہبی عقائد سے قطع نظر چاہتے ہیں اور یہ اُن کا حق بھی ہے۔

جمہوریت کی بحالی ناگزیر ہے!

گزشتہ ماہ جنرل پرویز مشرف امریکہ کے دورے پر گئے تھے، تاکہ اس عزت افزائی سے لطف اندوز ہو سکیں، جو دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے ایک اہم رُکن ملک کے لیڈر نے انہیں بخشی ہے۔ اس مہینے انہوں نے ٹوکیو کا قصد سفر بھی کیا، تاکہ 11 ستمبر کے واقعات کے بعد پاکستان نے جو کردار ادا کیا ہے، اس حوالے سے تحسین آمیز توجہ حاصل کر سکیں۔

واشنگٹن میں انہوں نے یہ کہہ کر لوگوں کو حیران کر دیا ''آپ لوگ جمہوریت کا لیبل چاہتے ہیں، ٹھیک ہے میں جمہوریت کا لیبل لگا دوں گا''، لیکن یہ بات بھی واضح کر دی کہ از سر نو لیبل لگانے کے باوجود بھی آمریت باقی رہے گی۔ اُن کے خارجہ سیکرٹری نے دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے، لیکن جنرل کو جب راستی کی ضرورت تھی اس وقت انہوں نے اگلی صبح کی میٹنگ میں یہی بیان دیا۔ انہوں نے کہا ''میرے خارجہ سیکرٹری اگرچہ یہ نہیں چاہتے، لیکن آپ مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ میں جمہوریت کا لیبل لگاؤں۔ ٹھیک ہے میں یہ لیبل لگاؤں گا۔'' اس کے بعد سے تسلسل کے ساتھ آمریت پر جمہوریت کا لیبل لگا رہے ہیں۔ نئی زبان میں انجینئرڈ انتخابات کو صاف و شفاف انتخاب کا اور فوج کی خواہش کو عوام کی خواہش کا نام دیا جا رہا ہے۔

مشرف صاحب کا ٹوکیو میں زبردست استقبال کیا گیا، کیونکہ وہ ایک ایسے ملک کے لیڈر ہیں جو دہشت گردی کے خلاف بین الاقوامی اتحاد کا اہم رُکن ہے۔ پاکستان کی اتحاد میں شمولیت کے حوالے سے اُن کے رہنما کردار کو نہ صرف تسلیم کیا جا رہا ہے، بلکہ اُسے سراہا بھی جا رہا ہے۔ تاہم جاپان اپنی جمہوری اقدار سے پیوست رہا ہے، کیونکہ یہ اس کی عالمی پالیسی ہے۔ اسی وجہ سے جاپان

نے یہ بات واضح کر دی کہ وہ صاف، شفاف اور غیر جانب دار انتخابات کے ذریعے پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کی حمایت کرتا ہے۔

سوویت یونین کے انہدام کے بعد پاکستانی جمہوریت کی بحالی عالمی جمہوریت کے ڈھانچے کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ بہت سارے ایسے ممالک اور بہت سارے سیاست دان جو یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ اپنی حدود سے ماورا ہو کر استبدادیت مسلّط کر سکیں گے۔ دنیا ایسی کمیونٹی کو مشکل ہی سے برداشت کر سکتی ہے، جہاں چوائس فوجی آمر اور طالبان آمر میں سے کرنی ہو۔ یہ صورت حال جنرل پرویز مشرف کو تذبذب میں ڈال دیتی ہے۔ سیاسی رہنماؤں کے مطابق ملک میں شفاف، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کا مطلب پاکستان پیپلز پارٹی اور اُس کی قیادت کی واپسی ہے۔ جنرل صاحب تو اس کی مخالفت کا حلف اُٹھا چکے ہیں۔

انہوں نے اپوزیشن کے اہم لیڈروں کو حوالات میں بند کرنے کی دھمکی دی ہے۔ انہوں نے اس عمل کا آغاز اس طرح کیا کہ 15 مارچ کو پانی کے مسئلے سے متعلق احتجاج کرنے والے ہزاروں پُر امن مظاہرین کو گرفتار کر لیا۔ تاہم اپوزیشن لیڈروں کو حوالات میں قید کرنا ایک بات ہے اور انہیں جیل کے اندر سے انتخابات میں حصہ لینے سے روکنا دوسری بات ہے۔ جنرل صاحب جس قدر اپوزیشن کے ساتھ زیادہ محاذ آرائی کریں گے، خاص طور پر خواتین کے ساتھ محاذ آرائی، اسی قدر اُن کے اپنے ساتھیوں کی حیثیت کم سے کم ہوتی چلی جائے گی۔ مسلم ثقافت خواتین کو ماؤں اور بہنوں کی حیثیت سے عزت دیتی ہے۔ وہ لوگ، جو ان خواتین کو پابندِ سلاسل کرتے ہیں، اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں۔

ثقافت اور سیاست میں پھنسنے کی وجہ سے فوجی حکومت ایک ایسا قانون پاس کرنے پر غور کر رہی ہے جو سیاسی لیڈروں کو تیسری مرتبہ وزیر اعظم بننے سے روکے۔ مسئلہ یہ ہے کہ فوجی حکومت جو بھی قانون پاس کرے، اسے پارلیمنٹ کی توثیق کی ضرورت ہوتی ہے اور ان قوانین، جن کی پارلیمنٹ توثیق کرتی ہے، کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ آیا انتخابات انجینئرڈ تھے، یا شفاف۔ ابتداً فوجی حکومت نے تمام شعبہ ہائے حیات کے سیاسی لیڈروں کے ساتھ مذاکرات کے متعدد راؤنڈز کیے، لیکن بڑی اپوزیشن پارٹیوں اور جنرل صاحب کے درمیان ہونے والے مذاکرات تین اہم معاملات پر ڈیڈلاک کا باعث بنے:

1- پہلے مسئلے کا تعلق سیاسی قیدیوں کی رہائی سے ہے۔ جو لوگ جلاوطن کیے گئے ہیں، انہیں واپس بلایا جائے اور جن لوگوں کے خلاف سیاسی بنیادوں پر مقدمات قائم کیے گئے ہیں، انہیں

واپس لیا جائے۔

2- دوسرے پہلو کا تعلق مجوزہ قانون سے ہے، جس میں فرد کو الیکشن کے ذریعے منتخب ہو کر تیسری مرتبہ ملک کے چیف ایگزیکٹو کے عہدے پر متمکن ہونے سے روکا جانا ہے۔

3- تیسرے پہلو کا تعلق اپوزیشن کے اس اصرار سے ہے کہ صاف، شفاف اور غیر جانب دار انتخابات کے لیے انتخابات کے طریقہ کار کو نام کے بجائے حقیقتاً اپنایا جائے۔

مذاکرات میں جس تیسرے پہلو کی وجہ سے تعطل پیدا ہوا ہے، اس پہلو نے فوجی حکومت کے اندر سب سے زیادہ اندیشے پیدا کر دیئے ہیں۔ حکومت کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ اگر صاف، شفاف، غیر جانب دار اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد کیا گیا تو ہر دل عزیز لیڈر دبئی، لندن، یا واشنگٹن سے اسمبلی پر اثر انداز ہوگی۔

شفاف، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان عدم استحکام سے بدستور دوچار رہے گا۔ نیا وزیراعظم اپوزیشن کے ساتھ ملنے کی دھمکی دے کر صدر کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ وزیراعظم جونیجو نے 1980ء کے عشرے میں یہی کچھ تو کیا تھا، جب انہوں نے جرنیلوں سے مرسڈیز بینز لے کر انہیں چھوٹی سوزوکی کاروں میں لا بٹھایا تھا۔ افغانستان سے متعلقہ جنیوا عمل کے دوران بھی وہ جرنیلوں کو خاطر میں نہ لائے۔ اس اعلانیہ نافرمانی نے فوجی صدر کے ساتھ اُن کے تعلقات کشیدہ کر ڈالے۔ انہیں بظاہر کرپشن اور نااہلی کی بنیاد پر برطرف کر دیا گیا۔ پاکستان مزید مشکلات کا شکار ہو گیا۔ ماورائے آئین اقدامات کی وجہ سے ماورائے آئین ردعمل پیدا ہوا۔ اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ انتخابات میں دھاندلی کی صورت میں انتہا پسند عناصر مقامی اپوزیشن کو ہائی جیک کر سکتے ہیں، اس لیے پاکستان کے قومی مفاد کے لیے صاف اور شفاف انتخابات بہت ضروری ہیں۔

تاریخ ایک منٹ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ 11 ستمبر کو یہی کچھ ہوا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون پر ہونے والے حملوں نے پاکستان کو ایک اہم ملک بنا دیا۔ پاکستان کو سب سے زیادہ امداد دینے والے ملک جاپان کی طرف سے ہنگامی اقتصادی امداد کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک سے بھی امداد آ رہی ہے۔ ایک ایسا ملک جو چالیس بلین ڈالرز کا مقروض ہو، اس کے لیے یہ فیاضانہ امداد ہے لیکن یہ طویل المدت حل نہیں ہے۔ پاکستانی عوام جنرل پرویز مشرف کے قرض معاف کروانے کی عدم صلاحیت پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ حوالہ دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ اُن کی ناقص مذاکراتی صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ آخر کار عالمی بحرانوں کے موقع پر مصر، اردن اور دوسرے ممالک بھی تو اپنے

قرضے معاف کروانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ جنرل پرویز مشرف اس اقتصادی اُلجھاؤ سے بے خبر ہیں، جس نے پاکستان کو قرض کے لیے پھندے میں اُلجھایا ہے۔ ری سٹرکچرنگ قرض میں اضافے کے حوالے سے ایک سراب ہے۔ ان کی حکومت ثمرات حاصل کرے گی اور ان کی سزا اُن بچوں کو ملے گی، جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے ہیں۔

جاپان نے پاکستان پر زور دیا ہے کہ پاکستان ایٹمی دھماکوں پر عارضی پابندی کو برقرار رکھے۔ جاپان نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ پاکستان سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دے۔ دونوں لیڈروں نے یقیناً اس مسئلے پر بھی گفتگو کی ہو گی۔ لیکن جنرل پرویز مشروف کو سب سے زیادہ مشکل کا سامنا جمہوریت اور شفاف انتخابات کے مسئلہ پر کرنا پڑا ہوگا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں، یہ نغمہ اُن کے سامنے الاپا جاتا ہے۔

اسلام آباد کے دروازوں پر عسکریّت کی دستک

افغانستان میں اپنی پناہ گاہوں سے بھاگنے والی انتہا پسند قوتوں نے اب دوبارہ اپنے قدم جمالئے ہیں جس کا خدشہ پاکستان پیپلز پارٹی نے ظاہر کیا تھا۔ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ خدشات کہ اگر 2002ء میں پاکستان میں جمہوریت بحال نہیں ہوئی تو یہ قوتیں پاکستان میں دوبارہ منظم ہوجائیں گی، بے بنیاد نہیں۔

پاکستان میں 2002ء کے انتخابات میں دھاندلی، پارلیمان کا اجلاس بلانے میں تاخیر اور پاکستان پیپلز پارٹی کو ہارس ٹریڈنگ کے ذریعے توڑنے تاکہ اس کی پارلیمان میں تعداد کم ہوجائے، ایسے اقدامات تھے جن کے ذریعے پاکستان کے لئے خدشات پیدا کئے گئے۔

رپورٹوں کے مطابق یہ انتہا پسند جو مقامی اور غیر ملکی طالبان اور وسطی ایشیائی ممالک کے القاعدہ عناصر پر مشتمل ہیں، نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں اپنے ٹھکانے بنالئے ہیں۔ یہ عناصر 2001ء میں اپنی شکست کے بعد دوبارہ مجتمع ہو چکے ہیں۔ یہ عناصر از سرنو منظم ہو چکے ہیں، اسلحے سے لیس ہو چکے ہیں اور خودکش حملہ آوروں کا استعمال کر رہے ہیں اور گوریلا حکمت عملی اپنا چکے ہیں۔ جنرل ضیاء کی ڈکٹیٹرشپ 80 کی دہائی کے دور میں افغان مجاہدین سے منسلک تھی۔ یہ افغان مجاہدین بعد میں طالبان بن گئے اور القاعدہ کا روپ دھار لیا۔ ان کے پاکستانی ساتھی آئی جے آئی بنے اور اب پاکستان مسلم لیگ (ق) کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔

افغانستان میں 90 کی دہائی میں طالبان اور القاعدہ اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے، جبکہ ان کے پاکستانی ساتھی، پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف عمل رہے کیونکہ وہ

پاکستان پیپلز پارٹی کو اپنی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت 1996ء میں فوجی انتہا پسندوں اور ان کے سیاسی ساتھیوں نے ایک سازش کے ذریعے ختم کی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی قومی احتساب بیورو قائم کیا گیا جس میں پیپلز پارٹی سے نفرت کرنے والوں اور افغان جہاد سے منسلک سابق افسران اور اہلکاروں کا تقرر کر دیا گیا اور ایک دہائی تک اس ادارے کو ملک کی مقبول قیادت کے خلاف استعمال کیا جاتا رہا۔

القاعدہ اور طالبان کے دوست جو کہ پارلیمان میں موجود تھے اور خود کو چھپانے کے لئے ان پارلیمانی اراکین نے داڑھیاں منڈوا رکھی ہیں، نے مل کر پاکستان میں طالبانائزیشن کو فروغ دینا شروع کر دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پیپلز پارٹی کو الگ تھلگ کر دیا جائے اور عسکریت پسند انتہا پسندوں کو تقویت دی جائے اور یہ عمل مذہبی مدارس کے ذریعے کیا گیا۔ ان مدرسوں کا کام طلباء کے ذہنوں کو برین واش کر کے پاکستانی طالبان بنانا تھا تاکہ یہ طالبان پاکستان پر قبضہ کر لیں۔

حالانکہ اسلام کی تعلیم ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں لیکن ان طلباء کو غلط سکھایا گیا کہ دین میں جبر ہے۔ مذہب کو ایسے مشینی انسان بنانے کے لئے غلط طور پر استعمال کیا گیا جن کی مدد سے انتہا پسندوں کے سیاسی مقاصد حاصل کئے جاسکیں۔ ان طالبان سے ایسی کارروائیاں کروائی جاتی ہیں جن سے شہریوں کے جان و مال، ان کی سلامتی اور استحکام، علاقائی اور عالمی امن کو خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ یہ طالبان ایک ایسا لاوہ ہے جو پھٹنے کے لیے تیار ہے اس کے پھٹنے سے پاکستان کی سڑکوں پر افراتفری اور انارکی پھیل جائے گی۔

خطرہ ہے کہ اگر پاکستان میں ان عناصر کو تقویت دینے لیے انتخابات میں ایک مرتبہ پھر دھاندلی کی گئی تو یہ عناصر غلبہ پالیں گے۔ حالیہ حکومتی ڈھانچہ پی۔ایم۔ایل (ق) پر مشتمل ہے، اس کے کچھ اراکین اعتدال پسند ہیں۔ تاہم ان میں سے بہت سارے ضیاء کی ڈکٹیٹر شپ کی باقیات ہیں جنہیں ضیاء کے دور کی انٹیلی جنس سے اکٹھا کیا ہوا ہے تاکہ پیپلز پارٹی کا راستہ روکا جائے، اور اس کے لئے کبھی آئی جے آئی بنوائی گئی تھی اور اُس وقت انہیں پی ایم ایل (ق) میں اکٹھا کیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہبی پارٹیاں جو ایم۔ایم۔اے کی شکل میں اکٹھی ہیں، نے خود کو لال مسجد اور جامعہ حفصہ سے لاتعلق اور دور کیا ہوا ہے لیکن کابینہ نے اب تک ایسا نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اسلحہ سے بھرا ایک ٹرک لال مسجد جا رہا تھا جسے روکا گیا لیکن کابینہ کے ایک وزیر کے حکم پر اس ٹرک کو چھوڑ دیا گیا۔ کابینہ ہی کے اثر و رسوخ کی وجہ سے دو پولیس اہلکاروں کو اغوا کرنے والے انتہا پسندوں کے خلاف پولیس خود کیس دائر نہیں کر سکی۔ لال مسجد کے مذہبی رہنما کی تقرری خود کابینہ نے کی ہے اور اس سرکاری ملازم نے اسلام آباد میں نام نہاد شرعی عدالت

قائم کر دی ہے۔ یہ قطعہ اراضی جہاں سیاسی مذہبی مدرسے موجودہ حکومت کے دور میں تعمیر کئے گئے ہیں، حکومت پاکستان کی ملکیت ہے اور کابینہ کی ملی بھگت سے جامعہ حفصہ نے اس پر غیر قانونی قبضہ کیا ہوا ہے۔ اس سرکاری زمین پر ان مدرسوں کی تعمیر کے دوران حکومت نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ اصلاحی مدرسے ہوں گے جن کے طالب علموں کی رجسٹریشن کی جائے گی۔ ان مدرسوں کو تعلیم کے نام پر فنڈ دیئے گئے جس سے ان مدرسوں نے خود کو مستحکم کیا، اور اب یہ اسلام آباد کے ایوانوں تک پہنچ گئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جامعہ حفصہ کو اس لئے ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ اس میں پڑھنے والی طالبات فوجی افسران کی بیٹیاں ہیں۔ حیرت زدہ کر دینے والی بات یہ ہے کہ ان طالبات کے والد اپنی بیٹیوں کو ڈنڈا بردار محافظہ بننے کی اجازت کیوں دے رہے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے 90 کی دہائی میں مالاکنڈ پر فوجی قبضے کی کوشش کو ناکام بنایا تھا۔ جس کے بعد عسکریت پسندوں نے پیپلز پارٹی کے ایک پارلیمینٹیرین کو جاں بحق کر دیا، پولیس اسٹیشنوں پر قبضہ کر لیا، حکومت کے دفاتر پر قبضہ کر لیا اور کچھ بینکوں اور اسکولوں پر بھی قابض ہو گئے۔ پیپلز پارٹی نے پولیس اور پارلیمینٹیرینز کی ایک ٹیم بنائی اور ان کی بغاوت کو کچل دیا۔ تاہم جب پولیس اور دیگر اداروں میں انتہا پسند عناصر سرایت کر جائیں تو عسکریّت پسندوں کی راہ کی رکاوٹ خود بخود ختم ہو جاتی ہے، اور ایٹمی پاکستان میں انتہا پسندوں کا انقلاب لانا آسان ہو جاتا ہے۔

یہ تو صرف ایک مدرسہ سامنے آیا ہے کسی کو معلوم نہیں کہ اسلام آباد اور دوسرے مقامات پر اس قسم کے کتنے سیاسی مدرسے موجود ہیں۔ لال مسجد کا مذہبی سربراہ اسلام آباد کے دیگر مدرسوں سے طلباء کو اپنی مدد کے لئے طلب کر سکتا ہے۔ اسلام آباد کے ہر کونے میں اس قسم کی بے قائدہ فوج چھپی بیٹھی ہو سکتی ہے جو حکم کا انتظار کر رہی ہو۔ یہ صورتحال تباہ کن ہے۔

حکومت کہتی ہے کہ وہ کمزور نہیں بلکہ ہمدردی کا اظہار کر رہی ہے اور اس لئے لال مسجد کے قریب ان دو مدرسوں کے خلاف کارروائی نہیں کر رہی۔ ایسی ہمدردی کا اظہار حکومت نے اس وقت نہیں کیا جب دو سال قبل 2005ء میں پیپلز پارٹی کے کارکن آصف زرداری کا استقبال کرنے کے لئے لاہور میں جمع ہوئے۔ یہ کارکن مکمل طور پر پُر امن تھے، کراچی کے ضمنی انتخابات میں اسی سال فروری میں خواتین کارکنوں پر تشدد کیا گیا، انہیں مارا پیٹا گیا یہاں تک کہ انہیں علاج کے لئے ہسپتالوں میں داخل ہونا پڑا۔ اقوام متحدہ کی خاتون نمائندہ اور ایک جج کی بہن کے ساتھ شرمناک سلوک روا رکھا گیا صرف اس بنا پر کہ وہ پُر امن احتجاج میں شریک تھیں۔ ڈنڈا بردار طالبات نے اسلام آباد کی سڑکوں پر قبضہ کر لیا اور حجاموں، بیوٹی پارلروں اور موسیقی کی دکانوں کو کاروبار بند کرنے

کی دھمکیاں دیں۔

میں مسلمانوں کی اکثریت کی طرح اپنے مذہب اسلام پر فخر کرتی ہوں، تاہم ہم جیسے مسلمان مذہبی رہنماؤں کی جانب سے اسلام کی ایسی تشریح جو دین میں جبر کی دعوت دے، کے خلاف ہیں۔ اسلام فرد پر بندوق کی نالی کے زور پر اپنی مرضی مسلّط کرنے کے خلاف ہے۔ زبردستی، اسلام میں نہیں ہے۔ اسلام سماجی انصاف مہیا کرنے، جہالت اور غربت کے خاتمے کا نام ہے۔ اسلامی معاشرے کی بڑائی یہ ہے کہ اس میں علم وفنون کو ترقی ملی، الجبرا، ریاضی، منطق اور دیگر علوم نے ترقی کی۔ اسلام کی مسجدوں اور مناروں کی عظمت کو وہ لوگ نقصان پہنچا رہے ہیں جو علم سے دور کوتاہ ذہن ہیں اور جن لوگوں کو سوویت یونین کی طاقت کا سامنا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ مسلم اور عالمی برادری 80 کی دہائی کے افغان جہاد کی باقیات کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ اپنی بندوقوں کا رخ مختلف قومیتوں، مذاہب اور عوام کی جانب موڑ دیں۔ اسلام کا نام استعمال کر کے یہ انتہا پسند ایک کے بعد دوسرے مسلمان معاشروں کو تباہ کرنے کے لیے اپنی طاقت استعمال کر رہے ہیں۔

افغانستان اور عراق میں جنگیں، ان انتہا پسندوں کی جانب سے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کا نتیجہ ہیں۔ اس حملے کے بعد پُر امن اور امن پسند مسلمانوں کو متشدد سمجھا جا رہا ہے۔ اس حملے سے عظیم مذہب اسلام کی ساکھ متاثر ہو رہی ہے۔ اس حملے کے بعد لاتعداد معصوم لوگوں کو جاں بحق کر دیا گیا ہے جن میں خواتین اور بچے بھی شامل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے جنگ کے دوران بھی نشانہ بنانے سے منع کیا ہے۔ خودکش حملہ آور سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کی خدمت کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں یہ لوگ مسلمان معاشروں کو تباہ کر رہے ہیں اور شہری آزادیوں کو ختم کر رہے ہیں۔ ان کی کارروائیوں سے اسلام کی خدمت نہیں ہو رہی بلکہ اسلام کو نقصان پہنچ رہا ہے اور خدا کی مخلوق کو نقصان ہو رہا ہے۔ اسلام کے نام پر کیا جانے والا یہ تشدد ان مغربی ممالک میں سماجی ہمہ جہتی اور جمہوریت کو ختم کر دے گا جہاں مسلمان ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کی وجہ سے مغربی ممالک میں مقیم ہر مسلمان کی زندگی، عزت اور فلاح متاثر ہوگی۔ کوئی بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ مسلمان ممالک جیسا کہ پاکستان میں بھی کوئی محفوظ نہیں رہے گا جہاں ڈنڈا بردار اہم عہدوں پر پہنچ جائیں گے، اور بیرونی ممالک میں بھی کوئی محفوظ نہیں رہے گا جہاں ہر مسلمان کو شک کی نظر سے دیکھا جائے گا اور وہ نفرت اور جرائم کا نشانہ بنیں گے۔ یہ انتہا پسند عالمی مالیاتی مارکیٹوں کو اپنی دہشت گردی کا نشانہ بنا دیں گے لیکن ان عالمی مالیاتی مارکیٹوں کی تباہی سے پوری دنیا کا نظام تباہ ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو سب لوگ بشمول مسلمان بھی تباہ ہو جائیں گے۔ یہ اسلام کی خدمت نہیں ہو سکتی۔

ہم ایک گلوبل ویلیج میں زندہ ہیں۔ عالمی اقدار تمام مذاہب کا حصہ ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہنے کے لیے ہمیں اس بات کا احترام کرنا پڑے گا کہ دین میں کوئی جبر نہیں، اور یہی اسلام کی تعلیمات میں شامل ہے، اور ذاتی مذہبی عقائد کے لیے ہم ریاست کے سامنے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہیں۔

پاکستان میں انتہا پسندی کے معاملے میں ریاست کا اختیار کم ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستانی کابینہ، لال مسجد اور جامعہ حفصہ کو مزید مدرسے تعمیر کرنے کے لیے اراضی پیش کر رہی ہے، اور کہا جا رہا ہے کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کو اسلام آباد سے منتقل کرنے کے لیے یہ اراضی پیش کی جا رہی ہے۔ یہ صرف مزید سرکاری زمینیں ہتھیانے کا بہانہ ہے اور بالآخر یہ ہوگا کہ دونوں قطعات اراضی پر ان لوگوں کا قبضہ ہوگا۔

اس وقت جب اسکالروں کی توجہ اسلامی دنیا اور دیگر ثقافتوں میں فرق پر ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم مسلمانوں کے درمیان مختلف اقدار پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ عراق میں مسلمانوں کے درمیان فرق سب سے زیادہ عیاں ہے، جہاں اسلام کے نام پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا خون بہا رہا ہے۔ اسلام آباد میں بھی یہی صورت حال ہے جہاں مسلمان ہی مسلمانوں کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ اگر عسکریت پسندوں کو روکا نہیں جاتا تو یہ انتہا پسندی خونی مذہبی انقلاب میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ عوام کی مرضی کے خلاف فوج کی جانب سے اقتدار پر قبضہ کرنے کی بجائے مذہبی عسکریت پسند بندوق کی نالی کے زور پر اقتدار پر قبضہ کرلیں گے۔

انتہا پسندوں کو قبائلی علاقوں، مالاکنڈ، پاراچنار اور ٹانک میں گھس جانے کی اجازت پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ درہ آدم خیل میں لڑکیوں کے لیے نجی اسکولوں کو بند کروایا جا چکا ہے اور حجاموں سے وعدہ لیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی داڑھیاں نہیں مونڈھیں گے۔ لوگوں کا کاروبار ختم ہو گیا اور عوام سے ان کی مرضی کے مطابق زندہ رہنے کا حق چھین لیا گیا، صرف اس وجہ سے کہ حکومت نے انتہا پسندوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔

ممکن ہے کہ پنجاب اور وفاق کے دیگر علاقوں میں یہ انتہا پسند چھپ کر خاموش بیٹھے ہوں۔ پاکستان اس وقت ایک دوراہے پر کھڑا ہے اور پاکستان کے ساتھ عالمی برادری بھی دوراہے پر کھڑی ہے۔ اسلام آباد سے خطرے کی گھنٹی کی آواز واضح اور دور تک سنائی دے رہی ہے۔

سیاست کا درخشاں ستارہ

جب میں چھوٹی سی بچی تھی، میرے والد مجھے ہوا میں اُچھالتے تھے اور میں خوشی سے کھلکھلاتی تھی۔ میرے والد اپنے بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ہم سب کے لیے وہ انتہائی قابلِ احترام شخصیت تھے اور دل اُن کی محبت میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ عوام اُن سے بہت زیادہ عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ عوام نے اُن کے لیے خود سوزی کی، اپنی جانوں کی قربانیاں دیں، اپنی پیٹھ پر کوڑے کھائے، بجلی کے جھٹکے برداشت کیے اور تشدد برداشت کیا۔ اُن کی تقلید میں عام لوگ عظمتوں کے حق دار ٹھہرے۔ اُن کی شخصیت نے شاعروں اور قلم کاروں کو اتنا متاثر کیا کہ اُن کی تخلیقات امر ہو گئیں اور ہماری ثقافت اور ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ اس عظیم المرتبت شخصیت کو جاننا ضروری ہے، جس کے وجود نے پاکستان پر پچھلی چار دہائیوں سے اپنے اثرات نقوش کیے ہوئے ہیں۔ وہ ایک شرمیلے انسان تھے جن کے ہونٹوں پر مسحور کن مسکراہٹ سجی رہتی تھی۔ میں پچھلے ماہ کیلی فورنیا میں اُن کے ایک ہم جماعت سے ملی جو انہیں اس وقت سے جانتے ہیں جب میرے والد کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ اُن کے مطابق ساری یونیورسٹی اُن پر فریفتہ تھی۔ وہ قد آور، وجیہہ و شکیل، ذہین و فطین اور دل موہ لینے والی شخصیت تھے۔ ایک بہترین مقرر تھے جن کی یادداشت بلا کی تھی۔ خوش لباسی میں وہ یکتا تھے، اُن کے سوٹ برطانیہ سے سل کر امریکہ آتے تھے۔

وہ بہت ہی آسودہ حال خاندان سے تعلق رکھتے تھے، لیکن انہوں نے طبقہ اُمرا سے منہ موڑ لیا تھا جس کی وجہ سے اُمرا کا بااثر طبقہ اُن سے خفا ہو گیا۔ واشنگٹن میں اردن کے ایک وزیر نے مجھے

بتایا کہ قائدعوام کے اقوام متحدہ میں کیے گئے معرکتہ الآرا خطابوں نے سفارت کاروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ دنیا بھر کے سفارت کار اُن کے خطابوں کی وڈیو دیکھتے تھے تا کہ کچھ سیکھ سکیں۔

وہ اتنے اچھے مقرر تھے کہ انہیں کبھی بھی تحریری نوٹس کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی۔ وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے تقریر کرتے تھے۔ اپنے سامعین کو وہ ہنساتے تھے، رُلاتے تھے اور اُن میں جوش و جذبہ پیدا کرتے تھے اور انہیں اتنا متحرک کر دیتے تھے کہ وہ اپنے روزمرہ کے غم بھول کر ایک عظیم قوم کی تشکیل کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ کرغستان اور نیپال میں آزادی اور جمہوریت کی تحریکوں کے سلسلے میں پہلا مظاہرہ قائدعوام کی غیر منصفانہ پھانسی کے خلاف ہوا تھا۔ اُن کے ہم جماعت نے مجھے بتایا کہ پان اسلام ازم (Pan-Islamism) کے لئے اُن میں بے انتہا جوش اور ولولہ تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو اسلامی دنیا کے اتحاد کے لیے خود کو وقف کر چکے تھے۔ دنیا کی دیگر تہذیبوں کی برابری کے لیے وہ اسلامی ایٹمی طاقت اور اسلامی مشترکہ مارکیٹ کے قیام کو ضروری سمجھتے تھے۔ 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ میں انہوں نے پاکستانی فوج عرب ملکوں کی حفاظت کے لیے بھیجی تھی۔ اُن کی تحریک پر اسلامی ملکوں کی آرگنائزیشن (او۔آئی۔سی) نے اسلامی کانفرنس کا انعقاد 1974ء میں لاہور میں کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو اور شاہ فیصل کو تھوڑے ہی وقفہ سے قتل کر دیا گیا اور اس طرح اسلامی تاریخ کو لیڈر شپ سے محروم کر دیا گیا۔ یہ لیڈر شپ مسلمان ملکوں کی تقدیر بدل سکتی تھی۔ یہ ایک تاریخی کانفرنس تھی۔ اسی کانفرنس میں یاسر عرفات کو فلسطینی قوم کا واحد ترجمان تسلیم کیا گیا اور فلسطین کی تحریک میں اتحاد پیدا ہوا۔ اسی کانفرنس سے یاسر عرفات مشرق وسطیٰ میں تصفیہ کے لیے بات چیت کرنے کے مجاز ہوئے۔ اسی کانفرنس کی وجہ سے پاکستان اور بنگلہ دیش علیحدگی کے بعد دوبارہ تعلقات اُستوار کرنے کے قابل ہو سکے۔

شملہ میں ذوالفقار علی بھٹو نے کمال کر دکھایا۔ وہ وہاں ایک ایسی قوم کے لیڈر کی حیثیت سے گئے جسے طاقت کے ذریعہ دولخت کر دیا گیا تھا۔ وہ وہاں اس وقت گئے جب پاکستان کے 90 ہزار فوجی جنگی قیدی بنے ہوئے تھے۔ پاکستانی علاقہ گنوایا جا چکا تھا اور پاکستانی فوج کے افسروں اور جوانوں پر نیورمبرگ طرز کا مقدمہ قائم کرنے کا خطرہ موجود تھا۔ وہ وہاں اس وقت گئے جب جنرل مانک شاہ باقی ماندہ پاکستان کو توڑنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ اپنے ہمراہ دانش، تاریخ کی روشنی اور پاکستانی عوام کی حمایت اور دعائیں لے کر گئے۔ وہ مغربی محاذ پر ہاری ہوئی زمین کو واپس لینے

میں کامیاب ہوئے۔اس کا موازنہ جنرل ضیاء کے دور میں سیاچن کے محاذ پر گنوائے جانے والے رقبہ سے کیا جائے جس کی واپسی کے لیے کئی کوششیں کی جا چکی ہیں۔ وہ بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی سے شملہ معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوگئے جس کی وجہ سے تین دہائیوں سے دونوں مما لک میں امن قائم ہے۔وہ پاکستانی جنگی قیدیوں کو ملک واپس لانے میں بھی کامیاب ہوئے۔اورانہوں نے ملکی وقار بھی قائم رکھااورانہیں جنگی مقدمات سے بچایا۔

وہ ساری دنیا میں ایک نسل پر اثر انداز ہوئے اور استعماریت کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ ویت نام کی جنگ کے خلاف جہاں ایشیائیوں کا خون بہایا جارہا تھا وہ برسرپیکار رہے۔ وہ ایشیائی ہونے پر فخر کرتے تھے اور تیسری دنیا کے لیڈروں سے اُن کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو انہیں اپنے بیٹے کی طرح عزیز رکھتے تھے اور مصر کے صدر ناصراُن سے نہایت محبت کرتے تھے۔صدر ڈیگال، یوگوسلاویہ کے ٹیٹو اور اُس وقت کے بڑے لیڈروں کی نظر میں اُن کا بہت عزت و احترام تھا اور وہ قائدعوام کی حکمت و دانش کے قائل تھے۔ جب وہ صدر کینیڈی سے ملے تو صدر کینیڈی نے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا کہ ''اگر تم امریکی ہوتے تو تم امریکہ کے صدر بنتے۔''

امریکی صدر جارج بش اور قومی سلامتی کے مشیر ہنری کسنجر نے اُن کے تدبر اور دانش کو سراہا۔ چین کے عظیم لیڈر ماؤزے تنگ اور وزیراعظم چواین لائی انہیں اپنے اہلِ خاندان کی طرح سمجھتے تھے۔سعودی عرب کے شاہ فہد انہیں اپنا بھائی سمجھتے تھے اور انہوں نے مجھے کہا کہ ''میں نے اُس وقت بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ اُن کا قتل ناانصافی تھا۔'' شاہ ایران کبھی نہ جان سکے کہ وہ اُن پر رشک کریں، یا اُن کو سراہیں۔اُن کی عقل و دانش، پیش بینی اور قابلیت کی ایک نہ ختم ہونے والی فہرست ہے۔ وہ دوسروں کو اپنے اُصولوں اور ثابت قدمی کی سیاست سے متاثر کرنے کی قابلیت رکھتے تھے۔

اُن کی شخصیت کا سحر ایسا تھا کہ اُن کے پرستار اُن کی ایک جھلک دیکھ کر، یا انہیں ہاتھ لگا کر اپنے ہوش کھو دیتے تھے۔ خواتین اُن پر دل و جان سے فریفتہ ہو جاتی تھیں۔ اُن خواتین میں شہزادیاں، خواتین اوّل اور بین الاقوامی اداکارائیں شامل تھیں۔لیکن وہ اپنے خاندان سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ انہوں نے سب کو نظرانداز کر دیا اور متعدد دل توڑ دیئے۔

ذوالفقار علی بھٹو صدر ایوب کی کابینہ میں شامل ہوئے۔اُس وقت وہ برصغیر کے سب سے کم سن وزیر تھے۔اُس وقت وہ صدر ایوب کا احترام والد کی طرح کرتے تھے،لیکن جلد ہی وہ مایوس

ہو گئے۔ اُن کے خیال میں ایوب خان امریکہ کی بہت زیادہ تابعداری کرتے تھے۔ وہ پرمٹ کی سیاست کو ناپسند کرتے تھے جس کی وجہ سے بائیس خاندانوں کے لیٹرے ٹولہ نے جنم لیا، جس نے پاکستان کے عوام کا خون چوسا۔ جب ایوب خان کے رشتہ داروں نے لوٹ مار کرنی شروع کی تو انہیں سخت ناگوار گزرا۔ تاشقند میں سپر پاور کے کہنے پر پاکستان کے مفادات اور اُس کے سپوتوں کے خون اور قربانیوں سے، جو انہوں نے 1965ء کی جنگ میں دیں، روگردانی کرنے پر انہیں سخت صدمہ پہنچا اور یہی بات اُن کی حکومت سے علیٰحدگی کا باعث بنی۔ حکومت سے علیٰحدہ ہونے کے بعد انہوں نے کچھ وقت غور وفکر میں گزارا۔ ایوب خان انہیں اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے اور ایوب کی مرضی کی خلاف ورزی کرنے والے چند ہی لوگ تھے۔ اُن کی رہائش گاہ 70 کلفٹن کے سامنے کاروں کی لمبی لائن بھی ختم ہوگئی۔ ان حالات میں سب انہیں چھوڑ گئے اور وہ اکیلے رہ گئے۔ انہوں نے خود کو لکھنے میں مصروف کر لیا اور ''آزادی موہوم'' (Myth of Independence) نامی کتاب لکھی۔ وہ ایک فلسفی اور سوشلسٹ تھے۔ برٹرینڈ رسل اُن کے دوست تھے اور اُن کی حوصلہ افزائی کے لیے انہیں خطوط لکھتے تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو دل کی گہرائیوں سے ایک سوشلسٹ تھے۔ وہ ایوب خان کی مخالفت پر کمر بستہ تھے تاکہ عوام کو جاگیرداری اور استعماریت سے نجات دلا سکیں۔ اس لئے 1967ء میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام عمل میں لایا۔ انہوں نے پارٹی کے پیغام کو پھیلانے کے لیے ملک کے طول وعرض کا دورہ کیا۔ وہ اُن دھول سے اٹے گاؤں اور قصبوں تک گئے جہاں ابھی سڑکیں نہیں بنی تھیں۔ انہوں نے سخت گرمی میں، جب سورج آگ برسا رہا ہوتا تھا، اور آندھی اور طوفان میں اپنا پیغام پہنچانے کے لیے سفر کیا تاکہ پاکستان کے غریب عوام اپنی تقدیر بدل سکیں۔ اُن کا پیغام دلوں کو گرما دینے والا تھا جس نے عوام کو متحرک کر دیا اور سرمایہ داروں کے گروہ نے اُن کے خلاف اتحاد کر لیا۔ اُن کا پیغام مساوات انسانی کا پیغام تھا، اُن کا پیغام جاگیرداری، سرمایہ داری اور قبائلی نظام میں پھنسے ہوئے عوام کے لیے آزادی کا پیغام تھا۔

اُن کے دوروں نے عوام میں نئی روح پھونک دی اور قوم کو خواب غفلت سے جھنجوڑ دیا۔ سندھ کے ریگستانوں اور سرحد کے پہاڑوں میں قاتلوں کے ٹولہ نے اُن کا تعاقب کیا، لیکن انہوں نے سب کو شکست دے دی۔ بڑے بڑے فوجی جنرل منہ کے بل گر پڑے جیسے ایوب خان اور یحییٰ خان جنہوں نے قسم کھائی تھی کہ اقتدار بھٹو کو منتقل نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن عوام کے سیلاب کو نہیں روکا جا سکا اور عوام نے اقتدار پر انہیں بٹھایا۔

اپنے دورِ اقتدار میں انہوں نے پاکستان کو متفقہ آئین دیا جس میں بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ یہ ایک لبرل آئین تھا جس میں خواتین اور اقلیتوں کو پارلیمنٹ میں تمام حقوق دیئے گئے تھے۔ صوبوں کو خود مختاری دی گئی اور نظر انداز شدہ قبائل اور شمالی علاقہ جات کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ خواتین کا ماتحت عدالتوں، وزارت خارجہ اور بیوروکریسی میں تقرر کیا گیا۔ قراقرم ہائی وے تعمیر ہوئی، پورٹ قاسم، کامرہ کمپلیکس، ہیوی میکینیکل کمپلیکس، ایٹمی پروگرام اور کینسر کے علاج کے لئے چاروں صوبوں میں سنٹرز کا قیام عمل میں آیا۔ غریب کسانوں کے بچوں کے لیے تعلیم کے دروازے کھولے گئے۔ صحیح معنوں میں یہ پاکستان کی حیاتِ نو تھی۔ پاکستان دنیا کے اہم ممالک میں شامل ہوگیا اور بھٹو کے تدبر نے یہ سب یقینی بنایا۔ ملک میں ترقی اور خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔

تاریخ میں قوموں کے سنہری دور میں ایک وقت زوال بھی آتا ہے۔ ظاہراً پارسا اور نیک جنرل تاک میں بیٹھا تھا، جو اردن میں فلسطینیوں کے قتلِ عام کا مرتکب تھا۔ اس جنرل کے دل میں دھوکہ اور اقتدار کی خواہش چھپی ہوئی تھی۔ جب سرحدوں کے پار سے اُسے اشارہ ملا تو اُس نے اُس کا جواب دیا اور وفاداری اور ادب واحترام کی اسلامی روایات کو یکسر رد کرتے ہوئے اُس نے اپنے محسن سے غداری کی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت اُس شخص نے ختم کی جو غداری اور قتل کا مرتکب ہوا۔ اُس کے ظالمانہ اقتدار نے عوام کو کچل کر رکھ دیا اور اُس وقت تک ظلم کرتا رہا جب تک کہ قدرت نے اُس کے جسم کو فضا میں آگ کے گولہ میں تبدیل نہیں کر دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ہمیشہ برصغیر کے صوفیہ کے مزار پر حاضری دی۔ اجمیر شریف میں اُن کے دستخط حاضری دینے والوں کی کتاب میں موجود ہیں۔ وہ داتا صاحب کے مزار پر باقاعدگی سے حاضر ہوتے رہے اور مشکل وقت میں انہوں نے بادشاہ دستگیر کو یاد کیا۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مسلمانوں کے سب سے بڑے خلیفہ اور اورنگ زیب عالمگیر کو سب سے عظیم مغل بادشاہ سمجھتے تھے۔ وہ سب سے زیادہ عقیدت لال شہباز قلندر سے رکھتے تھے۔ جب وہ نوزائیدہ تھے اور بیمار ہوئے تھے اور ڈاکٹروں نے بھی اُمید چھوڑ دی تھی تو اُن کی والدہ نے لال شہباز قلندر کے مزار پر دُعا مانگی تھی۔ خدائے بزرگ و برتر نے نوجوان ماں کی دُعا قبول کی۔ ماں نے اپنے بیٹے کو بہترین پوشاک پہنائی اور اس کا بستر ریشمی بنایا۔ خدا نے اس ماں کو اس تکلیف دہ حالت سے محفوظ رکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو، عوام کے ہیرو کو جیل میں پھانسی کی کال کوٹھڑی میں دیکھتی۔ لیکن اس کال کوٹھڑی میں بھی جہاں انہیں قتل کرنے سے پہلے ظالموں نے انہیں زندہ نہیں رہنے دیا۔ اُس کی ہمت مینارہ نور

کی طرح جگمگاتی رہی اور عوام کو اس بات کا حوصلہ دیتی رہی کہ وہ ظالموں سے لڑتے رہیں۔ خواتین کو ہمت ہوئی کہ وہ فوجیوں کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں، بچوں کو ہمت ہوئی کہ وہ اس بے رحمانہ اور غیر منصفانہ اسیری پر احتجاج کریں۔ ذوالفقار علی بھٹو کی ذات میں نہ صرف پاکستانیوں بلکہ ساری مسلم دنیا کو اُمید، خوابوں کی تعبیر اور اُمنگیں نظر آئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی غریب، کچلے ہوئے اور محروم عوام کے لیے قربان کی۔ انہوں نے غاصبوں سے کہا کہ وہ اُن کو یہ بتائے گا کہ عوام کا لیڈر کس طرح زندہ رہتا ہے؟ اور کیسے مرتا ہے؟ انہوں نے جو کہا وہ کر کے دکھا دیا۔

انہیں رات کی تاریکی میں بہت رازداری سے قتل کر دیا گیا اور اُن کی میت اُن کی سرزمین پیدائش لاڑکانہ پہنچا دی گئی۔ اور جب ساری قوم سو رہی تھی تو غیر فطری طور پر ریگستانی علاقہ میں ژالہ باری ہوئی اور اس طرح قدرت نے اس شخصیت کی وفات پر آنسو بہائے جس کی عظمت ساری دنیا میں تسلیم کی جاتی تھی۔ اپنی نوجوان بیوی نصرت سے شادی کے وقت ذوالفقار علی بھٹو نے کہا تھا ''میں تھوڑی دیر کے لیے آسمان پر ایک ستارے کی طرح جگمگاؤں گا اور اس کے بعد معدوم ہو جاؤں گا۔'' وہ ایشیا اور عالم اسلام کے چمک دار ترین ستارہ تھے اور اُن جیسا کبھی کوئی اور نہیں ہوگا۔

انصاف کی اپیل

کئی سال قبل جب پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کا تختہ اُلٹا گیا تھا تو اس کے خلاف کرپشن کے الزامات عائد کیے گئے تھے۔ دو سال تک اخبارات میں یہی الزامات بار بار دہرائے جاتے رہے۔ اس دوران پاکستان پیپلز پارٹی کے کسی رہنما کے خلاف (کرپشن کے الزام میں) کوئی مقدمہ عدالتوں میں پیش نہ کیا گیا۔ مڑ کر دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ میڈیا کی اس دو سالہ مہم کا بعض اہم اور قابل عزت شہریوں پر بھی اثر پڑا۔ ان لوگوں نے، جو قانون اور انصاف پر گہرا یقین رکھتے ہیں، کرپشن کے الزامات سے غلط نتائج اخذ کیے۔ دراصل یہ شہری میڈیا کی مہم کے ذریعے اُن کی لاعلمی میں برین واشنگ کے عمل سے گزارے گئے۔ جب اخبارات میں ظلم و جبر، تشدد اور ناانصافی پر مبنی واقعات کی خبریں شائع ہوئیں تو اُن خبروں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ اگر ملک کے خزانہ سے ''اربوں ڈالر'' لوٹ لیے گئے ہیں تو جب تک یہ مال و زر تلاش کر کے واپس ملک میں نہ لایا جائے، قانون تو مذاق بنا رہے گا۔

یہ سب کچھ انصاف کے تقاضوں کے منافی تھا اور اس کے تحت ایک وزیر اعظم اور اُس کے شوہر کو سزا سنا دی گئی۔ جب انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے ایک ادارے نے اُن کے خلاف تحقیقات کو ''سیاسی'' ہونے کے بارے میں خیالات کا اظہار کیا تو اس ادارے کی باتوں کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ ان الزامات کی تحقیقات کرنے والے نے ایک برطانوی اخبار کے نمائندے کے روبرو متکبرانہ انداز میں کہا کہ انہوں نے گواہوں پر تشدد بھی کیا تھا لیکن اسے تو کچھ نہ کہا گیا بلکہ مظلوموں کو ہی سزا دی گئی۔ ایسے خصوصی قوانین بنائے گئے جو ماضی سے موثر قرار دیئے گئے اور

انصاف کے اُصولوں کو ہوا میں اُڑا دیا گیا۔ صفائی کے گواہوں کو تو موقع ہی نہ دیا گیا۔ اخبارات میں ایسے اشتہارات شائع کرائے گئے، جن میں مدعا علیہان کو عدالتی فیصلہ سے قبل ہی مجرم قرار دیا گیا تھا۔

اس سب کچھ کے باوجود اُن لوگوں نے بھی، جو کچھ کہنے کی پوزیشن میں تھے، خاموش رہنے پر اکتفا کیا۔ انہیں تو اخبارات میں شائع کرائی جانے والی مختلف خبروں اور دستاویزات کی اشاعت کے ذریعے خاموش کر دیا گیا۔ انہیں ''غیر ملکی عدالتوں'' کے فیصلے دکھا کر بے حس بنا دیا گیا۔ اس طرح مخالفوں کے بارے میں حکومت کی گپوں اور جھوٹ کو گویا قانونی شکل دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی بیرونی (غیر ملکی) عدالت میں میرے خلاف کوئی مقدمہ زیر سماعت ہی نہیں، فیصلے کہاں سے آئے۔

سوئٹزرلینڈ میں اسلام آباد والوں کے غلط اور جھوٹے الزامات کی بنیاد پر تحقیقات شروع کی گئیں۔ برطانیہ میں اسلام آباد کے حکمرانوں نے حکومت سے درخواست کر رکھی ہے کہ وہاں کے مقامی باشندوں کے بیانات حاصل کیے جائیں۔ ہاں! اس طرح کے (جھوٹے) پراپیگنڈہ کے ذریعے بعض لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا گیا کہ غیر ممالک میں میرے خلاف عدالتی کارروائی ہو رہی ہے۔

قانون کا ایک اہم اُصول یہ ہے کہ کسی بھی شخص کے خلاف آزادانہ اور منصفانہ فضا میں مقدمہ چلایا جانا چاہیے۔ بہت سے مقدمات تو عوامی ماحول کو انصاف کے تقاضوں کے خلاف، خراب کر کے اور ہلّے گلّے کے ذریعے ختم کرا دیئے جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے حکومت کے جھوٹے پراپیگنڈے کے باعث میرے لیے انصاف اور منصفانہ مقدمات کے امکانات ہی ختم کر دیئے گئے۔ میرے خلاف جو الزامات عائد کیے جاتے رہے ہیں، انہیں جھوٹا ثابت کرنے کے لیے شہادتوں کے پہاڑ موجود ہیں، لیکن میرے خلاف پراپیگنڈہ بہت زیادہ کیا گیا اور نفسیاتی جنگ کے ذریعے میرے خلاف عوام میں نفرت پیدا کی گئی۔ صفائی پیش کرنے والوں کو شدید ذہنی دباؤ کا سامنا ہے۔ ہمارے خلاف اسلام کے تصورات اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غلط مقدمات کھڑے کیے گئے، جن کے نتیجے میں ہماری رُسوائی ہوئی اور بے توقیری کی گئی۔

میں نے جب جمہوریت کے حق میں مہم چلانے کے لیے واپس پاکستان آنے کا اعلان کیا تو حکومت نے میرے خلاف دباؤ بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سنا کہ انہوں نے یہ منصوبہ بنالیا ہے کہ میرے خلاف جو سزا سنائی گئی ہے، سپریم کورٹ سے اس کی توثیق کرا دی جائے گی۔ اگرچہ

پاکستان کی سپریم کورٹ میں متعدد دیانت دار اور باوقار، معزز جج صاحبان موجود ہیں لیکن میرے لیے یہ بات باعثِ تشویش تھی کہ مقدمہ منصفانہ انداز میں نہیں سنا جائے گا۔ پاکستان کی عدلیہ تو بڑے دباؤ اور جبر کے ماحول میں کام کرتی ہے۔ جج برطرفی کی تلوار کے نیچے کام کرتے ہیں۔ فوج نے اقتدار پر قبضہ کرتے ہی نصف کے قریب ججوں کو تو گھر بھیج دیا تھا۔ فوجی حکومت نے پراپیگنڈہ اور شدید مخالفت کے ذریعے جو ماحول پیدا کر رکھا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ فوجی حکومت تو جو چاہے گی وہی کرے گی۔

لیکن اللہ تعالیٰ کے کام کرنے کے اپنے انداز ہیں۔ ایک ایسا معجزہ رونما ہوا کہ میں جب بھی اس بارے میں سوچتی ہوں تو مجھ پر اس کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ پاکستان کے انٹیلی جنس بیورو (آئی بی) کے ایک افسر نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کو خطرے میں ڈالتے ہوئے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا۔ اُس نے جب کابینہ کے وزراء اور جج کے درمیان مکالمہ کے ٹیپ سنے تو اُس نے صدر پاکستان کو اس بارے میں (خط) لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ''سنڈے ٹائمنز'' کو بھی یہ ٹیپس مل گئے، جس نے اُن کی بنیاد پر ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع کر دی۔ واشنگٹن میں جب میں پریس سے ملاقات کر رہی تھی، تو مجھے بھی یہ رپورٹ مل گئی، چنانچہ میں نے پریس والوں کو بھی اس کی نقول فراہم کر دیں۔

جنرل مشرف کے پاس تین ہفتوں کا وقت تھا کہ وہ مجھے عدالت کے ذریعے اقتدار میں آنے سے روکنے کے لیے فوجی طاقت کا استعمال کریں۔ غالباً مشرف بھی اُن کہانیوں سے متاثر ہوئے تھے جو انہوں نے سن رکھی تھیں۔ میں نے مطالبہ کیا کہ ججوں اور عدلیہ کے بارے میں اقوام متحدہ سے تحقیقات کرائی جائیں۔ متعلقہ جج اور کابینہ کے وزراء ایسی تحقیقات سے خوفزدہ ہیں، انہوں نے میری بات کی تائید نہیں کی۔ پاکستان میں بھی یہ تحقیقاتی رپورٹ شائع ہوگئی، جس سے ایوانِ حکومت کے در و دیوار ہل کر رہ گئے۔ اس سے ملک کے دانشوروں کے ضمیر بھی جاگے، جنہوں نے فوراً مطالبہ کیا کہ ان ججوں کو (جن کا ٹیپس سے تعلق ہے) مستعفی ہو جانا چاہیئے اور اس پورے معاملہ کی تحقیقات ہونی چاہیے۔

''سنڈے ٹائمنز'' کی تحقیقاتی رپورٹ میں دھما کہ خیز مواد تھا۔ اس سے ججوں اور وزراء کی ٹیپ شدہ بات چیت سامنے آ گئی، جس سے یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ثابت ہوگئی کہ ججوں کو بلیک میل کیا گیا تھا کہ وہ مجھے سزا سنائیں۔ ان (جج صاحب) کی تو اہلیہ کو بھی یقین ہے کہ حکومت ججوں سے چاہتی تھی کہ وہ میرے مقدمہ میں ناانصافی ضرور کریں۔ یہ بڑے صدمے کی بات ہے کہ ملک کے وزیر قانون نے مقدمہ کا چارج سنبھال رکھا تھا۔ کابینہ کا وزیر برائے احتساب ججوں کو فیصلہ لکھوا

رہا تھا اور (مجھے سزا دلانے کے لیے) اُن سے تکرار کر رہا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحب مقدمہ کی سماعت کرنے والے جج کو ہلاشیری دے رہے تھے اور انہیں بتا رہے تھے کہ ''انصاف کو چھوڑو، ورنہ تمہاری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو جائیں گے''۔

یہ افسوسناک کہانی، انصاف کی کہانی ہے، جسے ایک ایسی خاتون کے لیے ''قتل'' کر دیا گیا جو ملک کی وزیراعظم رہ چکی تھی۔ لیکن یہ کہانی انصاف کے ساتھ ارتکابِ جرم کی اُس کہانی سے کوسوں دور تھی جو پہلی بار رونما ہوئی تھی۔ یہ افسوسناک، المناک کہانی وزیراعظم سہروردی کو سزا سنانے سے شروع ہوئی اور اس کا خاتمہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی لگانے پر ہوا۔ اُن پر ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا جو آج بھی زندہ ہے۔

وزیراعظم کے حق میں گواہی کا پہاڑ معزز اور نامور قانون دانوں کی طرف سے آیا ہے، جو دنیا کے تین براعظموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے مقدمہ کی سماعت کرنے والی عدالت کے فیصلے کا بڑی احتیاط سے مطالعہ کیا ہے۔ اس مقدمے کا مواد پہلے پریس میں چھپوایا گیا اور پھر عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس سارے مواد کا مطالعہ کرنے اور کسی بھی معاملہ میں ثبوت پیش کرنے کے اُصولوں کی روشنی میں اس کے تجزیہ کے بعد انہوں نے رائے دی کہ اس مواد کے مطابق تو فردِ جرم کی تیاری بھی محال ہے، پھر مقدمہ کی منصفانہ اور آزادانہ ماحول میں سماعت نہیں ہوئی اور یہ کہ مدعا علیہان دلائل کی بنیاد پر بے گناہ ثابت ہوئے ہیں۔

سابق حکومت نے لوگوں کی جو بات چیت ٹیپ کی، اسے سننے کے بعد بین الاقوامی قانون دانوں کی رائے کی توثیق ہوتی ہے۔ ان قانون دانوں میں، جو امریکہ اور برطانیہ سے تعلق رکھتے ہیں، دو سابق چیف جسٹس، برطانیہ کا ایک سابق اٹارنی جنرل، پاکستان سپریم کورٹ کے ایک جج اور امریکہ و برطانیہ کی ایک معروف قانونی فرم کے لوگ شامل ہیں۔ سچ کا سامنا کرنا گویا ان (جن کو سزائیں سنائی گئیں) کی بریّت کا ثبوت ہے۔ لیکن ان لوگوں کو جو تکلیف پہنچی ہے، جس اذیت سے وہ گزرے ہیں، یہ اس کا درماں تو نہیں ہے۔ یہ شفاف احتساب کا دور ہے۔ انسان ذہنی اذیت بھگت سکتا ہے، برداشت کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کے بعد صاف شفاف منصفانہ عمل ہوتا نظر آئے۔

پاکستان کی عدلیہ میں جو کرپشن ظاہر ہوئی ہے، اس سے عدلیہ کے ادارے کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ اپنا وقار بحال کرے۔ اس مقصد کے لیے ان کرپٹ ججوں کے خلاف کارروائی کی جانی چاہئے، جن کا اس معاملہ سے تعلق ہے۔ اس سے ملک (پاکستان) کو بھی یہ موقع ملا ہے کہ وہ اپنے اداروں کی اس طرح تعمیرِ نو کرے، جس کی اکیسویں صدی میں ضرورت ہے۔

سابق وزیر داخلہ اور سابق چیف جسٹس آف پاکستان نے یہ تسلیم کیا ہے کہ سابق حکومتی زعماء نے ٹیلی فون ٹیپ کرنے کے احکام جاری کیے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ میں جب وزیراعظم تھی تو میرے دفتر بلکہ میری رہائش گاہ کے ٹیلی فون اور بات چیت بھی ٹیپ کی جاتی تھی۔ آج بھی، جب میں یہ سب کچھ لکھ رہی ہوں، میرے شوہر کی بات چیت ٹیپ کی جارہی ہے، اُن کی ویڈیو فلم بنائی جا رہی ہے، حالانکہ وہ جیل کے ایک کمرے میں قید تنہائی میں ہیں جس کی کھڑکیوں کے شیشے سیاہ کر دیئے گئے ہیں۔ کسی کی تنہائی میں یہ بے جامداخلت ختم ہونی چاہیے۔ انٹیلی جنس ایجنسیاں تو ہر ملک کا حصہ ہوتی ہیں، لیکن انہیں قانون کا پابند بنایا اور رکھا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی ایسا ہی کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ایسا ہونا تبھی ممکن ہے، جب اسلام آباد ان ٹیپس کو صدائے جرس تصور کرے اور ریاستی اداروں کی صفائی پر کمر بستہ ہو جائے۔ ادارے تو بہت سے ہیں، جن میں پارلیمنٹ، عدلیہ، انٹیلی جنس ایجنسیاں اور مسلح افواج بھی شامل ہیں۔

اسلام الزام تراشی کی سیاست کا مخالف ہے، لیکن دوسرے سب سے بڑے اسلامی ملک میں جھوٹی الزام تراشی، گپ بازی اور کردار کشی کا کھیل بدستور جاری ہے، جو راست بازی اور انصاف کی کسوٹی پر کبھی پورا نہیں اُتر سکتا۔ اپنے حالیہ دورۂ مغرب کے دوران میں نے دیکھا کہ وہاں کے رہنما صرف مثبت نکتہ چینی کرتے ہیں، جب کہ ذاتی نوعیت کے حملوں سے احتراز کرتے ہیں۔ مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ ری پبلکن حکومت اپوزیشن والوں کو اس بات پر مائل کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ انسانی بھلائی اور باہمی محبت کا ماحول پیدا کرنے کے لیے مل کر کوشش کی جائے۔ امریکہ کے صدر بش نے ڈیموکریٹک سینیٹر کینیڈی کو ایوانِ صدر آنے کی دعوت دی تا کہ وہ مل کر فلم دیکھیں۔ دوستی کا ایسا اقدام یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ سیاست دانوں کے درمیان اختلافات تو ہو سکتے ہیں لیکن انہیں ایک دوسرے کی عزت کرنی چاہئے۔

جب رہنما سیاسی ایجنڈے پر عمل کرنے کے لیے باہمی احترام سے محروم ہو جاتے ہیں تو افراد سے زیادہ انسانی معاشرہ اس سے بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ جب سے میں نے وزارتِ عظمیٰ چھوڑی ہے، ہمارا ملک مالی دیوالیہ پن میں مبتلا ہے۔ اس کے مستقبل پر فوج کا طویل سایہ لہرا رہا ہے۔ جب تک جمہوریت کی گاڑی کو واپس پٹڑی پر نہیں ڈالا جاتا، مستقبل میں مزید سیاسی عدم استحکام پیدا ہوگا۔ ایسے عدم استحکام نے ملک کو اس حد تک کنگال کر دیا ہے کہ ملک کے نوجوان خود کشی کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ یہ بڑی اندوہ ناک بات ہے کہ پاکستان میں ایسے بہت سے غریب لوگ ہیں، جن کے پاس زندہ رہنے کے لیے مالی سکت نہیں ہے۔

سپریم کورٹ کی بلند و بالا عمارت میں، جو میں نے بھاری رقوم صرف کر کے بنوائی تھی اور جس کا میں نے ہی افتتاح کیا تھا، بیٹھنے والے ججوں کو آزادانہ طور پر انصاف کرنے کا موقع فراہم نہیں کیا جاتا۔ انصاف تو پاش پاش ہوتا رہے گا۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ فوج میرے مقدمہ کی از سرنو سماعت کے لیے اسے واپس اسی عدالت میں بھیجنے کو ترجیح دے گی، جس نے اولین فیصلہ سنایا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے مزید دکھوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ وہ مزید خصوصی عدالتیں قائم کریں گے اور سیاسی ادارے مزید ججوں کو بلیک میل کریں گے، میں تو ایسا نہیں چاہتی۔ مجھے باعزت بری کیا جانا چاہیے۔ میں اپنی اپیل میں یہی کہوں گی کہ مجھے میرا حق ملنا چاہیے۔ میری اپیل یہ ہے کہ مجھے باعزت بری کیا جائے۔ انصاف کا مزید مضحکہ نہ اُڑایا جائے، جیسا کہ میرے اور میرے باپ کی روح کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔ میں اُن لوگوں کی روحوں کو اپنے ساتھ، اپنے آس پاس محسوس کرتی ہوں، جو صرف اس لیے موت کے گھاٹ اُتر گئے کہ قانون انہیں زندہ رہنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا۔ ان روحوں کی خاطر اور خود اپنے لیے میں انصاف کی اپیل کرتی ہوں۔

پاکستان میں خلافت

پاکستان کی فوجی حکومت، جس پر دباؤ ہے کہ بیرکوں میں واپس چلی جائے، جھاڑ و پھیر دینے والی آئینی اصلاحات کی منصوبہ بندی کر رہی ہے۔ان اصلاحات کا مقصد قوم کی تقدیر کا کنٹرول فوج کے آئینی شکنجے میں رکھنا ہے، جب کہ تکنیکی اعتبار سے ملک کو غیر فوجی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ایسی آئینی تبدیلیوں سے ملک جمہوری تو کہلا سکے گا لیکن عملی طور پر یہاں آمریت ہوگی۔کیا آمریت ملک کو اس سیاسی طوفان سے نکالنے میں مددگار ثابت ہو سکے گی جس میں وہ اب گھرا ہوا ہے؟ یہ ایک الگ سوال ہے۔

نومبر 1996ء میں جمہوریت کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ جب سے جمہوریت کو پٹڑی سے اُتارا گیا ہے پاکستان خود کو طوفان میں گھرا ہوا محسوس کر رہا ہے۔اسے خارجہ پالیسی کے چیلنجوں، بیمار معیشت، لسانی اور مذہبی اقلیتوں کے درمیان ناموافقت اور سیاسی عدم استحکام جیسی مشکلات کا سامنا ہے۔

1996ء میں حقیقی طور پر منتخب شدہ حکومت کے خاتمہ، 1997ء کے انتخابات میں دھاندلی اور پارلیمنٹ میں غالب اکثریت کے ساتھ ایک کمزور لیڈر کے برسر اقتدار آنے سے ملک بحران کی دلدل میں پھنس گیا۔ جمہوریت کو گرائے جانے کے فوج پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ فسطائیت کے اُبھرنے سے خائف فوج نے اکتوبر 1999ء میں ملک کے انتظامات اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے اس اُمید کے ساتھ اقدام کیا کہ وہ صورتِ حال کو بہتر بنا دے گی۔

عوام اور معیشت کو بزور اپنی مرضی کے مطابق بنانے کے لیے استعمال کیے جانے والے

ظالمانہ طریقوں کی وجہ سے صورتِ حال بہتر ہونے کے بجائے مزید خراب ہوگئی۔لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے مایوس ہوکر ملک سے چلے جانے کا انتخاب کیا۔ وہ بھاری سرمایہ بھی اپنے ساتھ باہر لے گئے تاکہ وہ مغرب کے آسودہ حال ممالک میں اپنی رہائش گاہیں خرید سکیں۔

لاکھوں افراد نے بیلٹ کے ذریعے معزول پاکستان پیپلز پارٹی کو ووٹ دیئے۔ حال ہی میں منعقد کیے جانے والے لوکل انتخابات میں پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ یہ ووٹ موجودہ فوجی حکومت سے مایوسی کا واضح اشارہ ہیں۔

جب لوکل انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو پریس میں رپورٹیں شائع ہوئیں جن میں یہ بتایا گیا کہ حکومت نے عوام کے جذبات و خیالات کے سیلاب کو آئینی دعووٗں کے ذریعے روکنے کی منصوبہ بندی کی ہے، جس میں عوام کے فیصلے کو کوئی اور شکل دے دی جائے گی۔فوج کے منصوبہ میں شامل آئینی ڈیم ملک کے استحکام کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں، جن میں آزادی سلب ہو جائے گی اور معاشی بحران اور زیادہ گہرا ہو جائے گا۔

پہلا منصوبہ تو یہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف کو صدر بنا دیا جائے۔ دوسرا منصوبہ یہ ہے کہ انہیں طاقت ور ہتھیاروں سے مسلح کر دیا جائے اور ان ہتھیاروں میں اپنی مرضی سے وزیرِاعظم کو فارغ کرنے کا اختیار بھی شامل ہے۔

گزشتہ 14 برسوں میں پانچ مرتبہ اسمبلیاں توڑی گئیں۔اس حقیقت کو مدّ نظر رکھا جائے تو کیا پاکستان ماضی کے تجربات دہرانے کے قابل ہے؟ چونکہ وزیرِاعظم کو ہٹانا آسان ہے۔ چنانچہ ہر سال ایک نیا وزیرِاعظم برسرِاقتدار آ سکتا ہے۔

نتیجہ اس کا یہ نکلے گا کہ کرپشن مزید پھیلے گی۔ وزراتِ عظمیٰ کا اگلا اُمیدوار وزیرِاعظم کو ہر وقت محاصرے میں لیے رکھے گا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ اکثریت اور اقلیت کے درمیان کلیدی حیثیت رکھنے والے اراکینِ پارلیمنٹ پر ہمیشہ سے کیا جانے والا انحصار جاری رہتا۔ پارلیمنٹ کے ممبران کی طرف سے شرمناک تقاضے کیے جا سکتے ہیں جس سے بدعنوانی میں اضافہ ہوگا۔

اس سے خارجہ پالیسی ایک تماشا بن سکتی ہے کیونکہ غیر ملکی حکومتیں ایک بے یار و مددگار وزیرِ اعظم سے معاملات کریں گی جس کے سر پر صدر کی طرف سے معزولی کی تلوار ہر وقت لٹکتی رہے گی۔ کیا اس کے طریقِ عمل کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ اس سے پارلیمنٹ ایک نان باڈی بن جاتی ہے جس میں اراکین پارلیمنٹ واحد طاقت ور شخص کے ارشادات پر عمل کرنے کے بدلے میں تنخواہ اور مراعات حاصل کرتے ہیں۔

اس سارے عمل نے پاک فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ بطور ادارہ پاک فوج کا بہت زیادہ احترام کیا جاتا تھا کیونکہ وہ طرز عمل اچھا رکھتی تھی اور آزادانہ انتخابات کراتی تھی لیکن اب اس احترام کو ایک یورش کا سامنا ہے۔ کیونکہ فوج نے ایک ہردل عزیز وزیراعظم کو پھانسی دی، سیاسی پارٹیاں بنائیں، انتخابات کے نتائج کو مرضی کے مطابق بنانے کے لیے دھاندلی کی۔ قومی مردم شماری میں جوڑ توڑ کی، سیاچن اور کارگل میں نقصان اُٹھایا اور ذاتی منافع کے لیے زرعی اور کمرشل زمین کو اپنے قبضے میں کر لیا۔

ایک صدارتی آمر مرضی کے مطابق نہ چلنے والے بے یار و مددگار وزیراعظم کو کڑی آزمائش میں ڈالنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ انتخابات میں دھاندلی کرا سکتا ہے، الیکشن کمیشن اور عدلیہ کے ناتوانوں کو تبدیل کر سکتا ہے۔ وہ ایسا فوج کو انتخابات، یا آپ اسے چناؤ کہہ لیں، منعقد کروانے کے حق کو استعمال کرتے ہوئے کر سکتا ہے۔ منصوبہ کے مطابق اصلاحات کے بعد فوج انتخابات کرایا کرے گی۔

ماضی کے تجربات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ عوام نے مضحکہ خیز انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ 1985ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے ریفرنڈم کرایا تو 5 فیصد سے بھی کم لوگوں نے حق رائے دہی استعمال کیا۔ اسی طرح 1997ء کے متنازعہ انتخابات میں بھی صرف 16 فیصد عوام نے ووٹ ڈالے۔ لوگوں نے گرج دار خاموشی کے ساتھ احتجاج کیا۔

لوگوں کے ایسے ہی احتجاج سے بچنے کے لیے منصوبہ کے مطابق اصلاحات کے ذریعے ووٹ ڈالنے کو لازمی قرار دیا جائے گا اور ووٹ نہ ڈالنے والوں کو جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اختلاف رائے کرنے والوں کو قید کرنے کے لیے نئی جیلیں بنائی جائیں گی۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ ایسا کر کے ووٹ ڈالنے، یا نہ ڈالنے کا گراں قدر حق چھین لیا جائے گا۔ یہ ایک ایسا حق ہے جو بنیادی انسانی حقوق کا جزو بھی ہے۔

فوجی حکومت کا مقصد واضح ہے، یعنی فوج کے علاوہ تمام اداروں کو منہدم کر دیا۔ سیاسی پارٹیاں بھی ایک ادارہ ہیں جنہوں نے ملک کی 54 سالہ تاریخ میں چار مارشل لاء کا مقابلہ کیا۔ اب فوجی برتری کو لاحق اس خطرے کو سیاسی پارٹیوں کو آزادانہ طور پر منظم ہونے کے حق سے محروم کر کے ختم کیا جا رہا ہے۔ الیکشن کمیشن کے ذریعے سیاسی پارٹیوں کے اندرونی طریق کار کے لیے قانون وضع کر کے فوج میل جول کے حق میں مداخلت کرنا چاہتی ہے۔ منصوبہ کے مطابق انتخابات تین سال بعد ہوں گے اور سیاسی پارٹیوں کو اپنے انتخابات ہر سال کرانے ہوں گے۔ قومی انتخابات

ہوں گے، پھر صوبائی، مقامی اور پارٹی انتخابات ہوں گے۔ یعنی سیاست دان ہر وقت انتخابات میں مصروف رہیں اور فوج کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ کسی بھی طرح کے احتساب سے بالاتر ہو کر پاکستان کو ذاتی جاگیر میں تبدیل کر لے۔

عالمی برادری اور پاکستانیوں میں سے کچھ ایک آئینی آمر کے ساتھ مطمئن ہیں۔ جنرل مشرف نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ترکی کے انقلاب پسند اتاترک کی طرز پر مصلح بنیں گے۔ بنیاد پرستوں کو طیش میں لانے کے لیے یہی کافی ہے کہ انہوں نے اپنے پالتو کتوں کے ساتھ تصاویر اُتروائیں جو مختلف اخبارات میں شائع ہوئیں۔ اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ انہوں نے فرقہ پرست لیڈر جھنگوی کو پھانسی دینے کی اجازت دی۔ بھارت کے ساتھ کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت مذاکرات شروع کرنے کا وعدہ کیا اور سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کا عندیہ دیا۔

باوجود اس ساری پیش رفت کے وہ الیکشن کمیشن، عدلیہ، مقننہ، مسلح افواج اور سیاسی پارٹیوں کو اپنے ماتحت کر کے سارے اختیارات فرد واحد کے ہاتھوں میں دے رہے ہیں جو کہ ایک خطرناک عمل ہے۔ اگر کوئی ملک پر قبضہ کرنا چاہے تو اُسے صرف ایک عہدہ پر قبضہ کرنا پڑے گا۔

تشویشناک بات یہ ہے کہ ایک ایسے ملک میں کہ جس کی فوج افغانستان پر بیرونی طاقت کے قبضے کے خلاف افغان جہاد کو آگے بڑھاتی رہی ہے، فرد واحد کے پاس اس قدر آئینی اختیارات مہلک نتائج کے حامل ہو سکتے ہیں۔ اختیارات کا یہ ارتکاز اُن کے لیے بہتر ہے جو زیادہ تر نرم انقلاب کی بات کرتے ہیں۔ جب کہ وہ جو پاکستان کو پورے علاقے اور اقوام متحدہ میں قابل احترام اور پُر وقار جگہ پر دیکھنے کے خواہش مند ہیں، اُن کے لیے اختیارات کا یہ ارتکاز نقصان دہ ہے اور یہ بات زیادہ سنجیدہ تفکرات کا سبب ہے۔

سیاسی انتہا پسندوں نے مذہب کے نام پر جس انقلاب کا وعدہ کیا ہے ہوسکتا ہے وہ نرم انقلاب ہو۔ یہ پاکستان پر دو مراحل میں قبضہ کرنے کا ایک خطرہ ہے۔ پہلے مرحلے میں آرمی چیف کی سربراہی میں اقتدار اپنے ہاتھوں میں ہی لیا گیا، دوسرے مرحلے میں انتہا پسندوں کو اُمید ہے کہ وہ آرمی چیف کو بنیاد پرست کے طور پر مامور کر دیں گے۔ بنیاد پرست آرمی چیف طالبان لیڈر ملاّ عمر کی طرز پر اپنے خلیفہ اسلام ہونے کا اعلان کر دے گا۔ سیاست دان مہمل اور بے معنی انتخابات پر لڑتے رہیں گے جب کہ خلیفہ طالبان کی طرز پر اسلام کو پھیلانے کی طرف توجہ دے گا۔

پاکستان اور اس کی سمت اسلامی دنیا کی سمت کے بارے میں ناقدانہ ہے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جس کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار موجود ہیں۔ اگر پاکستان ایسی بنیاد

پرست قوتوں کے قبضے میں آ گیا جن کا منصوبہ اسلام کو پھیلانے کا ہوا تو متعدد اسلامی ملک عدم استحکام کا شکار بن سکتے ہیں۔

بلاشبہ یہ منصوبہ جنرل مشرف کے سامنے سیاسی پارٹیوں، بیلٹ اور عوام کو کنٹرول کرنے کے ایک ذریعے کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ زیادہ خطرناک عمل اختیارات کا ایک ہی فرد کے پاس ارتکاز ہے۔ آپ ذرا سوچیں پاکستان میں جہاد کی حامی قوتوں نے نواز شریف اور اُن کی پارٹی کے ذریعے آئین کو قبضے میں لینے کی کوشش کی۔ نواز شریف نے دو مرتبہ مذہبی حکومت قائم کرنے کا وعدہ کیا۔

سینیٹ میں آئینی اکثریت نہ ہونے کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے۔ اپوزیشن نے انہیں اس ارادے سے روکے رکھا۔ نواز شریف طالبان کی تعریف کرتے رہے اور یہ وعدہ بھی کہ جب بھی انہیں سینیٹ میں اکثریت حاصل ہوئی وہ مذہبی حکومت کا اعلان کر دیں گے لیکن دو مرتبہ انہوں نے ایسی کوشش کی اور دونوں ہی مرتبہ معزول کر دیئے گئے۔

پاکستان میں ایک مرتبہ پہلے بھی بنیاد پرستوں نے مذہبی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جب 1995ء میں جونیئر آفیسرز نے انقلاب لانے کی کوشش کی جسے ناکام بنا دیا گیا تھا۔ اس انقلاب کی قیادت بریگیڈیئر مستنصر نے کی تھی۔ اب ملک کو مذہبی ریاست بنانے کی اُمیدیں جنرل مشرف سے وابستہ کر لی گئی ہیں۔ لیکن یہ نظریہ تکشیریت کے حامی معاشرہ میں موجود عناصر کو بے وقعت کرنے کی ایک چال ہے، تاکہ آئینی آمریت کو عمل میں لایا جا سکے جسے بعد میں طالبان کے طرز حکومت کی شکل دے دی جائے جس کی قیادت ایک پوشیدہ ملاّ عمر کرے۔ یہ عمل نہ صرف یہ کہ پاکستان کے عوام بلکہ جنوبی ایشیا اور اسلامی دنیا کے لیے بھی خطرناک ہے۔

سیاست، شخصیّات اور کارکردگی

جنرل پرویز مشرف اور اُن کے ساتھیوں نے جمہوری حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار پر قبضہ کیا تو عام تاثر یہی تھا کہ فوج کے برسرِاقتدار آنے سے عام آدمی کی زندگی اور زیادہ محفوظ ہو جائے گی، اور جب حکومت نے معیشت کی بحالی کے عزم کا اظہار کیا تو اس تاثر کو اور زیادہ تقویت ملی۔ سمندر پار کے کامیاب پاکستانی اقتصادی ماہرین کو یہاں بلایا گیا اور کہا گیا کہ میرٹ اور صلاحیت سے وہ عام پاکستانیوں کی زندگی میں بہتری لائے گی۔ لیکن یہ نظریہ گمراہ کن تھا جیسا کہ وقت نے ثابت کر دیا۔ شوکت عزیز صاحب اور جن دوسرے لوگوں نے پاکستان سے باہر دوسرے ممالک میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور کامیابی کے جھنڈے گاڑے، اُن کی اس کامیابی میں اُن کی ذاتی صلاحیت کا عمل دخل کم ہے جب کہ وہاں کے متحرک اور جان دار سسٹم کا زیادہ ہے۔ ذاتی صلاحیت اور کوشش کے بجائے متحرک سسٹم نے اُن کی کامیابی میں زیادہ اہم کردار ادا کیا۔ جب اُن کامیاب لوگوں نے پاکستان میں صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے کام کا آغاز کیا تو انھوں نے صورت حال کو بہتر بنانے کے بجائے اسے گھمبیر بنا دیا۔ اس کی وجہ سسٹم کی کمزوری ہے۔ ذرا اُن بھاری قرضوں کا مشاہدہ کیجیے جو انتہائی زیادہ شرح سود پر حاصل کیے گئے۔ یہ قرضے فاروق لغاری کے عبوری دور میں عالمی بینک کے ایک افسر نے ہم پر مسلّط کیے۔ اس سے وزارتِ خزانہ کی ناکامی کا مشاہدہ کیجیے حالانکہ سٹی بینک کا ایک اعلیٰ افسر اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہا ہے۔ دوسرے ممالک کے ساتھ اعلیٰ سطحی تجارتی، مالیاتی اور بینکنگ کے روابط سے عام آدمی کی زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صورت حال پہلے کی نسبت بدتر ہو گئی ہے۔

گزشتہ دہائی کی دو جمہوری حکومتوں کے ابتدائی برسوں کی کارکردگی کا اگر بڑے پیمانے پر تقابل کیا جائے تو شدید دھچکا لگتا ہے۔ 1989ء اور 1993ء میں معیشت نے اپنے ابتدائی سالوں میں کامیابی کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ 1989ء میں نج کاری، نئے منصوبہ جات اور ڈی ریگولیشن کا عمل شروع ہوا، جب کہ 1993ء میں توانائی اور سافٹ ویئر کی پالیسی متعارف کروائی گئی۔ یہ پالیسیاں معیشت کے لیے ایندھن ثابت ہوئیں جس سے معیشت نمو پانے کے قابل ہوئی، لوگوں کو روزگار کے مواقع ملے، جائیداد کی قیمت میں اضافہ ہوا، مارکیٹ میں رقم کی گردش شروع ہوئی اور فی کس آمدنی میں اضافہ ہوا۔

اس کے برعکس بالواسطہ یا بلا واسطہ فوجی حکومتوں اور عبوری ادوار میں ہمیشہ کھینچا تانی ہوتی رہی، حکومتی معاملات کو نظر انداز کیا گیا اور ان معاملات کو نام نہاد ٹیکنو کریٹ کے ہاتھ میں سونپ دیا گیا، جن میں سیاسی بصیرت نام کو نہ تھی اور وہ سیاسی پروگرام سے بھی نابلند تھے، اور اُن کا دل انتخاب کنندگان کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ نتیجتاً وہ توازن نہ رکھ سکے اور ناکام ہو گئے۔

عوامی رائے تشکیل دینے والے یہ سادہ سا یقین رکھتے ہیں کہ تمام مسائل کا حل صرف اور صرف میرٹ میں مضمر ہے۔ سیاسی طور پر منتخب ہونے والے لوگوں کا اقربا پروری اور دوست نوازی کے نام پر مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ اگر میرٹ ہی سب کچھ ہے تو یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد ہر طالب علم کو آئن سٹائن ہونا چاہیے۔ لیکن واضح طور پر ایسا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ اور برطانیہ نے بھی بہت عرصہ قبل منتخب سیاسی لوگوں کی اہمیت پہچان لی تھی۔ جب بھی امریکی حکومت تبدیل ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہزاروں آدمی بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ حالیہ تاریخ میں برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے کسی دوسرے وزیر اعظم کی نسبت سب سے زیادہ سیاسی افراد کو سیاسی کارکن کی حیثیت سے پارٹی میں شامل کیا۔ (انہوں نے یہ کام نیو لیبر کے نعرے کے تحت کیا)۔

منتخب سیاسی لوگ غیر معمولی جوش و جذبے کے ساتھ میدانِ عمل میں اُترتے ہیں، اُن کے اس جذبے کا ٹیکنو کریٹ کے جذبے سے تقابل نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی سیاسی کارکن ہو، اس کی وفاداری سیاسی پروگرام کے ساتھ رہتی ہے۔ سیاسی حیوان ہونے کے ناطے سیاسی کارکن ہمیشہ سماجی انعامات کو مالیاتی انعامات پر ترجیح دیتا ہے اور یہ رویہ ٹیکنو کریٹ کے رویے سے بالکل مختلف ہے کیونکہ ٹیکنو کریٹ پیسے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ منتخب سیاسی فرد اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس کی مدتِ اقتدار کی کامیابی سے وابستہ ہے جب کہ ٹیکنو کریٹ اپنی مدتِ اقتدار کو اقتصادی مارکیٹ میں اپنے مستقبل کو روشن بنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ترقی اور جمہوریت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ بات پاکستان کی صورتِ حال کے حوالے سے صحیح ہے۔ اب ہم پاکستان کی صورتِ حال کے حوالے سے جمہوری حکومت اور آمر کی حمایت یافتہ حکومت کی کارکردگی کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ پھر اس تجزیے کو ہم مخصوص مفاد پرست گروپوں کو تعلیم دینے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں کہ منتخب جمہوری افراد کی اہمیت کیا ہے۔ کامیابی کے لیے پہلے ہی سے کامیاب نظام کی نقالی ضروری ہوتی ہے، جیسے امریکہ کا نظام۔ اُن کی انتظامیہ کا انحصار طاقت اور منتخب سیاسی افراد کی جانب سے مہیا کردہ قوت پر ہوتا ہے۔ انہیں اپنی ٹیم کے ساتھ کام کرنے کی آزادی دی جاتی ہے اور انہیں مجہول، غیر متحرک، متشکّک اور خشک مزاج لوگوں کے ساتھ کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا جو کسی بھی پالیسی کو اس وقت ناکام بنا دیتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ اس پالیسی سے اُن کے مفادات پر زد پڑتی ہے۔

ایک اور غیر جمہوری نعرہ یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ ملک کو چلانے کے لیے تیسری پارٹی کو چانس دینا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ ملک کے دونوں سابق وزراءِ اعظم دو دو بار اقتدار میں آ چکے ہیں لہٰذا انہیں اقتدار سے باہر کیا جانا چاہیے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں وزراءِ اعظم کو کیا طبقہ عدیدیہ (امرائے شاہی) نے ووٹ دیئے تھے، یا اقتدار میں لایا تھا۔ یہ بات واضح ہے کہ جمہوریت میں انتخاب کنندگان ہی یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کسے منتخب کرنا ہے۔ لیکن جب طبقہ اشرافیہ نے رائے دہندگان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تو پھر نااہلی کا کنگ ڈرامہ رچایا گیا۔ اور اس طرح سیاسی اکھاڑے میں شعبدہ باز کرپشن کی خوشنما اور خوش رنگ گیندوں سے شعبدہ بازی دکھانے لگے۔

اس عمل سے سیاسی کلاس کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ جیسے یہ عمل ذاتی تباہی کی منفی قوتوں کو Unleash کرتا ہے۔ منفی سوچ سے خود تباہی کا منفی چکر پیدا ہوتا ہے۔

اس سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ سیاست بھی کیسینو (Casino) کی مانند ہے کہ اگر آپ کی قسمت بہت تیز ہے تو آپ اقتدار حاصل کر سکتے ہیں۔ درحقیقت اقتدار، یا طاقت لاٹری کے نظام سے قطعی مختلف ہے۔ اقتدار ایک مقدس امانت ہے اور اختیارات کو وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جن پر لاکھوں لوگ آزادی کی فضا میں اپنی اُمیدوں کے ساتھ یہ ذمہ داری عائد کرتے ہیں۔ صرف اور صرف ووٹرز ہی اس بات کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں کہ کسے اقتدار میں لایا جائے اور کسے اقتدار سے آؤٹ کیا جائے۔ ووٹرز اس کے لیے اُن کی کارکردگی کو بنیاد بناتے ہیں۔

ووٹرز کے اس حق میں ڈنڈی مارنا انہیں اُن کی آزادی، رزق اور اپنی قسمت کے کنٹرول سے محروم کرنا ہے۔ اس عمل سے مراد اُن کا یہ حق چھین لینا ہے جو اللہ نے انہیں دیا ہے کہ وہ اپنے

نمائندے اللہ کے نائب کے طور پر منتخب کریں۔ جمہوری اور وفاکش لوگوں کے لیے آزادی سے اپنے نمائندوں کا انتخاب اُن کے ضمیر میں ناقابلِ تنسیخ اُصول کے طور پر پیوست ہے۔ ملک آج جس صورت حال سے دوچار ہے اور اسے جس بحران کا سامنا ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ لوگوں سے اُن کے نمائندوں کے انتخاب کا حق چھین لیا گیا ہے۔

جمہوریت اور جمہوری عمل کو سبوتاژ کرنے، آئین کو پس پشت ڈالنے اور مجروح کرنے اور ریاستی اختیارات کے ناجائز استعمال پر پردہ ڈالنے کی گہری سازشیں ناکام ہوگئیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی سچائی اور مفاہمت کمیشن کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کے لیے مشتہرہ اعترافات کو منظرِ عام پر لانے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان اعترافات میں سلامتی کے ایک ادارے کی طرف سے 1988ء میں ایک پارٹی بنانے، 1990ء کے انتخابات میں سٹیٹ بینک کو لوٹنے کا عمل، جس کا مقصد اُمیدواروں کو رقم مہیا کرنا تھا اور یہ اعتراف کہ گزشتہ عوامی انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کو مینڈیٹ نہیں ملا تھا جب کہ تمام پولنگ بوتھوں پر فوج موجود تھی۔

یہ وہ اقدام ہیں، جو اسلامی اُصولوں، وفاق اور جمہوریت کے اُصولوں کے خلاف ہیں اور انہی کی وجہ سے چھوٹے صوبوں میں احساسِ تنہائی بڑھا ہے۔ معیشت زبوں حالی کا شکار ہوئی ہے۔ مسلح اور متشدّد گروپوں کو فروغ ملا ہے، سماجی طور پر کمزور گروپوں کے خلاف تعصب پیدا ہوا ہے اور بین الاقوامی طور پر ملک تنہائی کا شکار ہوا ہے۔

مسلح افواج کا امیج ان افسران کی وجہ سے بڑی مشکل سے مجروح ہونے سے بچا ہے، جنہوں نے سیاسی جماعتیں تشکیل دیں، انتخابات میں دھاندلی کی اور سٹیٹ بینک سے رقم چرائی۔ ان چند افسران کے اپنے عہدے کے حلف سے غداری کے عمل سے فوج کے خلاف پریشان کن بدشگونی پیدا ہوئی۔ فوج نے 1997ء کے جن انتخابات کے انعقاد میں مدد دی اور نگرانی کی، ان انتخابات کے نتائج سے متعلق شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ فوج کے متعلق یہ تاثر تیزی سے اُبھر رہا ہے کہ فوج ریاست کے اندر ایک ریاست کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کہ منتخب حکومتیں فوج کے سامنے بے بس ہوتی ہیں۔ اس طرح کے تضادات ایک ایسے ادارے کے بارے میں اچھا تاثر قائم کرنے میں کوئی مدد نہیں کرتے جس نے 1965ء کی جنگ کے دوران مردوں اور عورتوں کے دل مسرتوں سے بھر دیئے تھے۔

پاکستان کے سماجی طبقے میں ملک کی مسلح افواج ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مسلح افواج میں ملک کی بہت بڑی تعداد ملازمت کرتی ہے۔ فوج ایک ایسا ادارہ ہے جو محروم اور پسماندہ طبقوں

کے سماجی تحرک کوفروغ دیتا ہے۔ امن کے قیام کے لیے پاکستان کی مسلح افواج کی پیشہ ورانہ صلاحیت کی ایک دنیا نے تعریف کی ہے۔ اس کے جوانوں نے شہادت کے لہو سے دلیری اور بہادری کی کئی کہانیاں رقم کی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلح افواج اس بات کا تعین کرے کہ اس وقت اس کی کیا حیثیت ہے اور جنگ کے بعد کے دور میں اس کی منزل کیا ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ پاکستان کو کامیابی سے وہ فرد ہم کنار کرے گا جو گھوڑے پر بیٹھ کر آئے گا۔ لیکن اس کے علاوہ ایک دوسرا نقطۂ نظر بھی ہے کہ شہسوار جب تک گھوڑے کو واپس نہیں کرتا۔ یہ شہسوار ریاست کو ایک ایسے عہد میں لے جائے گا جہاں آمریت کی کوئی جگہ نہیں۔

آج کا دور شفافیت کا دور ہے۔ جنرل پرویز مشرف نے دفاعی اخراجات میں کمی کر کے ایک دلیرانہ قدم اُٹھایا ہے اور تنقید کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ اس طرح اُن کا یہ عمل اور زیادہ اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔ لیکن حکومت مقررہ بجٹ کے اندر رہنے کے اپنے کیے گئے وعدے میں ناکام رہی۔ فوجی پنشن کے بجٹ کو بڑی آسانی سے سول بجٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح بجٹ میں کمی ایک سراب ثابت ہوئی۔ اس طرح کے سرابوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی مسلح افواج نے نئے عالمی نظام میں اپنا کردار ادا کیا ہے، اس لیے فوج کو ضرورت ہے کہ وہ جدید اقدار سے ہم آہنگ رہے۔ ان اقدار میں اور زیادہ شفافیت، نوآبادی طرز انداز سے پہلوتہی، غیر سیاسی کردار اور معاہدات کی شفافیت شامل ہیں۔

آخر کار قوم کو کسی نہ کسی مرحلے پر کرپشن کے معاملات پر آنکھیں بند کرنے کے بجائے انہیں سامنے لانا پڑے گا۔ ٹیکس اور بیئرر سرٹیفکیٹس کی وجہ سے لوگوں نے اپنی رقم خفیہ رکھی ہوئی ہے۔ موجودہ حکومت بھی اپنی پیش رو حکومت کی طرح ٹیکس لاگو کر رہی ہے۔ اگر چہ حکومت کرپشن سے نمٹنے سے متعلق بہت شور مچا رہی ہے، اس طرح بہتری کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔ محتسب کے طرز پر کرپشن کی تحقیق کے لیے نظام نہایت ضروری ہے۔ عہدے پر رہنے کے حق اور تفتیش کرنے کے حق کے مابین فرق کرنا بہت ضروری ہے۔ کرپشن پھیلتی جا رہی ہے اور ساتھ ہی وبائی مرض کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ جب تک ایسا کوئی نظام وضع نہیں کر لیا جاتا جس سے عام پاکستانیوں کو امیگریشن اور کسٹم کے ذریعے لٹنے سے بچایا جا سکے، اُس وقت تک کرپشن پھیلتی رہے گی۔

اگلے عشرے کی طرف پیش قدمی کے لیے لازم ہے کہ ماضی سے تعلق توڑ لیا جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ طویل عرصہ سے ہم نے جو تعصّبات کی عینک چڑھا رکھی ہے، اُسے اتار دیں۔ اور سیاسی گروہوں سے متعلق ہمارے اندر جو تعصب پایا جاتا ہے اُسے بھی ختم کر دیں۔ اس کا مطلب

ہے کہ سیاسی حکومت کو اپنی ٹیم کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا جانا چاہیے اور اس کا جائزہ شخصیت کے بجائے اُس کی کارکردگی سے لینا چاہیے۔

ہم شخصیات سے متعلق خبط کا شکار ہیں۔ یہ خبط آمریت کا نتیجہ ہے اور اسی خبط نے ہمیں حکومتوں کی کارکردگی سے متعلق اندھا کر رکھا ہے۔ جب حکومت کا عروج اور زوال شخصیات اور تعصب کے بجائے کارکردگی کا مرہونِ منت ہوگا، اس وقت پاکستان اپنی ترقی کے عروج پر پہنچ جائے گا۔ جس کا نظارہ اس کے تمام باشندے کریں گے۔

پاکستانی معیشت کی تباہ حالی

فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف نے اکتوبر 1999ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد وعدہ کیا تھا کہ معیشت میں نئی جان ڈال دیں گے۔ لیکن اقتصادی صورت حال بہتر بنانے کے خواب بکھر گئے ہیں کیونکہ وزیرخزانہ نے اعتراف کیا ہے کہ قومی پیداوار نچلی ترین سطح پر آ گئی ہے۔ اس مایوس کن کارکردگی پر صرف حکومت ہی ہے، جو حیرت میں مبتلا ہے، ورنہ سیاسی تجزیہ نگاروں نے تو گزشتہ برس کے بجٹ کے وقت ہی پیشین گوئی کر دی تھی کہ معیشت مزید تباہ حال ہو جائے گی۔ وہ جو تاریخ سے سبق نہیں سیکھتے، اپنی غلطیاں دہراتے رہتے ہیں۔ یہی مسئلہ فوجی حکومت کی طرف سے پیش کردہ مالی سال 02-2001ء کے بجٹ کے ساتھ بھی ہے۔

بجٹ کی کہانی ایک ملک کی کہانی ہے، جہاں معاشی تنزل کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ بھاری بھرکم قرضہ ایک غیر معمولی بوجھ ہے۔ بہت پرانا قصہ نہیں ہے، چار پانچ برس پہلے کی بات ہے۔ 1996ء میں پاکستان کی معیشت تیزی سے ترقی پذیر تھی کیونکہ ملک اقتصادی لحاظ سے وسطی اور جنوبی ایشیا کے چوراہے پر کھڑا تھا۔ جمہوری حکومت کے خاتمے اور پھر یکے بعد دیگرے آنے والی فاشسٹ حکومتوں کی وجہ سے ایک ایسے ملک کی معیشت تیزی کے ساتھ تنزل کا شکار ہوئی جس کے پاس تباہ کن جوہری ہتھیار اور ساڑھے سات لاکھ فوج موجود ہے۔ چار سال پہلے تک پاکستان کی کل قومی پیداوار کی شرح 6.76 فیصد تھی۔ یہ شرح ترقی پذیر دنیا میں دوسرے نمبر پر تھی۔ آج اس ملک کی کل پیداوار کی شرح 2.8 فیصد ہو چکی ہے جو کہ دنیا بھر میں کم ترین ہے۔

پیداوار کی شرح میں کمی کا تعلق براہ راست غربت سے ہوتا ہے۔ جب پیداوار کی شرح میں

کمی واقع ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی لوگوں کی قوت خرید بھی کم ہو جاتی ہے۔قوت خرید میں کمی کا عمل معیشت کو مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے۔ دکانیں خریداروں سے خالی ہو جاتی ہیں اور لوگوں کے گھروں میں اشیائے صرف کی قلت پیدا ہو جاتی ہے۔ کرنسی کی گردش رُک جاتی ہے، جس سے غربت اور تباہ حالی کو سر اُبھارنے کا موقع ملتا ہے۔ 1996ء میں کل سرمایہ کاری جی ڈی پی کا 19 فیصد تھی۔ جواب کم ہو کر آدھی رہ گئی ہے۔ اس سے سرمایہ کاری کے شعبے میں کم وبیش 150 بلین روپے کی کمی واقع ہوئی ہے۔ سرمایہ کاری میں اس حد تک کمی نے اقتصادی صورت حال مزید خراب کر دی ہے۔

اس کے باوجود پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو کہ سرمایہ کاروں کے لیے کشش کا باعث ہو سکتا ہے۔ چار برس پہلے تک اوسط براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری تقریباً ایک بلین ڈالر تھی جب کہ 22 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری جلد ہی فراہم کی جانے والی تھی۔ صدر نے جب جمہوریت کو پٹڑی سے اُتار دیا تو اتنے کثیر سرمایہ کا اندرون ملک بہاؤ یک دم رُک گیا۔ حتیٰ کہ جنرل کے سینے پر سجے تمغے بھی سرمایہ کاروں کو اپنی طرف راغب کرنے میں ناکام رہے کیونکہ انہوں نے ویت نام، بغداد، تریپولی اور برما جیسے نظام کی بات کی تھی۔ باہمی سمجھوتوں کی پرانی یادداشتوں کی وجہ سے سرمایہ کاری اب بھی کی جا رہی ہے لیکن یہ 200 ملین ڈالر سے بھی کم ہو چکی ہے۔ ملکی سرمایہ کار بھی اپنا سرمایہ خلیج کی ریاستوں اور کینیڈا وغیرہ میں لگانے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ان کا خون پسینے سے کمایا ہوا سرمایہ ایسے ممالک میں زیادہ محفوظ ہے، جہاں قانون کی حکمرانی ہے اور جہاں کی حکومت ایمان دار ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ گزشتہ مسلسل تین برسوں سے ایک بھی نئی کمپنی نے کراچی اسٹاک ایکسچینج میں شمولیت اختیار نہیں کی ہے۔ ملک کے طول وعرض میں کلیریکل تحریک کو جنم دینے والی غیر جمہوری اقدار کے خلاف عوام کی عدالت میں یہ شدید ترین باضابطہ فرد جرم ہے۔ گزشتہ نومبر میں زرمبادلہ کے ذخائر میں خطرناک حد تک کمی نے اسلام آباد کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ آئی ایم ایف کے ساتھ نیا اقتصادی معاہدہ کرے۔ پاکستان کے وزیر خزانہ ایک پرائیویٹ بینکر ہیں اور انہیں تعلقاتِ عامہ کا تجربہ بھی ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھا جائے تو یہ بات باعثِ حیرت محسوس نہیں ہوتی کہ اسلام آباد نے ناموزوں، زیادہ قیمت والا، مختصر مدت کا سٹینڈ بائی پروگرام منتخب کیا ہے۔ اقتصادی اُمور اور عالمی اقتصادی اداروں کے طریق کار سے پوری طرح آگاہ ایک تجربہ کار روز یرکو اس سے کہیں زیادہ پُرکشش پیکج کا انتخاب کرنا چاہیے تھا۔ آئی ایم ایف غربت میں سہولت کے پروگرام کی پیشکش بھی کر سکتا ہے۔ معاہدہ وقتی ضروریات پوری کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس سے حکومت کو جلد ہی پیرس

کلب کے ساتھ ری شیڈ ولنگ کی ضرورت پیش آ جائے گی۔

پیرس کلب کے پاس قرضوں سے نجات دلانے کے بہت سے پیکج ہیں، جو مختلف شرائط پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ پاکستان کے لیے قرضے کی ری شیڈ ولنگ زیادہ بہتر شرائط پر کی جائے گی۔ قرضے کی دوسری مرتبہ ری شیڈ ولنگ انہی شرائط پر زیر عمل لائی گئی ہے جن شرائط پر نواز شریف نے پیکج پر بات چیت کی تھی۔ اس وقت اسلام آباد نادہندہ ہونے کے قریب تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیرس کلب کو فوجی حکومت اور اس کی پیش روحکومت میں کوئی فرق نظر نہیں آیا ہے۔ اسلام آباد والوں نے محض تھوڑی مہلت حاصل کی ہے اور جلد ہی قرضوں پر واجب الادا رقوم کا بوجھ حکومت پر پڑنے والا ہے۔ سٹینڈ بائی مدت کے خاتمہ کے بعد ری شیڈول ہونے والا قرضہ اکٹھے ہونے والے سود میں شامل کر لیا جائے گا۔ اس وقت اسلام آباد اقتصادی لحاظ سے بدترین حالت میں ہوگا۔

عالمی اقتصادی معاہدوں میں واضح پیغام موجود ہے کہ عالمی برداری موجودہ نظم و نسق کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتی ہے۔ اسلام آباد کو زندہ تو رکھا گیا ہے، لیکن اس کی رسیاں کس دی گئی ہیں اور انہیں کھولے جانے کی اُس وقت تک اُمید نہیں ہے جب تک کہ جمہوریت بحال کرنے کے تقاضوں پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کر دیا جاتا۔

جرنیلوں نے وعدہ کیا تھا کہ اداروں کو مضبوط بنائیں گے اور پبلک انٹر پرائزز کی تشکیل نو کریں گے۔ اُن کو دی گئی آدھی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے اور کسی بھی ادارے میں بہتری کے آثار نمودار نہیں ہو رہے ہیں۔ پولیس، نظام تعلیم، سول سروس، ٹیکس ایڈمنسٹریشن میں فوجی افسروں کو شامل کرنے سے فوجی آفیسرز تو یقیناً خوش ہوئے ہوں گے لیکن اس سے سول ملازمین کا مورال گر گیا ہے۔ پرائیویٹائزیشن پروگرام، جس کی حد سے زیادہ تعریفیں کی جاتی رہی ہیں، متنازعہ ہو گیا ہے اور اس کے معاملات میں کرپشن کے عمل دخل کے الزامات عائد کیے جا رہے ہیں۔

پہلے تو عوام کو آئین سے محروم کر دیا گیا، پھر جج اپنے حلف کھو بیٹھے اور اب بجٹ نے عوام سے آس اُمید رکھنے کا حق بھی چھین لیا ہے۔ گزشتہ برس کی طرح موجودہ مالی سال کے بجٹ میں بھی رجائیت پسندانہ اعداد و شمار کے کرتب دکھائے گئے ہیں اور کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ پانی کی شدید قلت ملک کے ایک حصے کو قحط زدہ کر رہی ہے۔ بجٹ میں اس سلسلے میں یہ کہا گیا ہے کہ پانی سے متعلق کچھ منصوبوں کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ جاری منصوبوں کو فنڈز کی کمی کا سامنا ہے۔ ایسی صورت میں اس امر کا امکان نہیں ہے کہ ترجیحات کو تیزی کے ساتھ تبدیل کیا جا سکے۔ یہ نشاندہی بھی نہیں کی گئی ہے کہ ان منصوبوں کے لیے سرمایہ آئے گا کہاں سے؟ اس سے صرف یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ

تعلقاتِ عامہ اُستوار کرنے کی ایک چال ہے۔

ٹیکسٹائل انڈسٹری کو البتہ کچھ سہولت ضرور حاصل ہو جائے گی کیونکہ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (WTO) معاہدے کی وجہ سے ڈیوٹیوں میں کمی پر سوچ بچار کی گئی ہے۔ لیکن بامقصد طریقے سے پیداوار بڑھانا ممکن نہیں ہوگا۔ زراعت، جو پاکستانی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، کے شعبے میں اہداف پورے کرنے میں ناکامی ہوئی ہے۔ جمہوری دور میں زرعی شرح پیداوار سات فیصد سے زیادہ جا رہی تھی، جو اب کم ہو کر منفی کی طرف جا رہی ہے۔ سرکاری ملازمین کو تنخواہوں میں پچاس فیصد اضافے کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے چیک لینے جائیں گے تو انہیں پتہ چلے گا کہ اُن کے ساتھ ایک اور کھیل کھیلا گیا ہے۔

گزشتہ برس جرنیلوں نے فوج کے ذریعے ٹیکس سروے کرایا جو ناکام ہو گیا تھا کیونکہ ریونیو کے اہداف پورے نہیں کیے جا سکے۔ گزشتہ سال ٹیکس اصلاحات کا وعدہ کیا گیا تھا، جن کا اعلان ہونا ابھی تک باقی ہے۔ اس رپورٹ کو گزشتہ سال دسمبر میں ریلیز کیا جانا تھا۔ چھ ماہ مزید گزر جانے کے بعد عوام آج بھی اس کے منتظر ہیں۔

پاکستان کی معیشت اب بھی مقتل میں پڑی ہے جب کہ ملک اتھاہ گہرائیوں میں گرتا جا رہا ہے۔ کم پیداوار، کم ریونیو، کم سرمایہ کاری جیسے عوامل عالمی برداری میں پاکستان کے مقام کو منفی طور پر متاثر کر رہے ہیں۔ داخلی طور پر غربت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اب بھی پاکستان کم پیداواری شرح اور بھاری قرضوں کے جال سے نکل سکتا ہے، بشرطیکہ اس میں جمہوریت بحال کر دی جائے۔ لیکن جرنیل اس کے لیے تیار نظر نہیں آتے ہیں۔

کیا ایک بار پھر جنگ ہوگی؟

رومن شہنشاہ جولیس سیزر کو Ides of March کے دن قتل کیا گیا تھا اور اس کے بعد سے یہ دن کیلنڈر میں ایک خصوصی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ جنوبی ایشیا میں بھارت اور پاکستان نے اپنا Ides of March حاصل کر لیا ہے اور یہ مئی کا مہینہ ہے۔ جب موسم بہار موسم گرما میں تبدیل ہوتا ہے اور شدید گرمی کی آمد آمد نظر آنے لگتی ہے۔ گزشتہ سال مئی میں دونوں ممالک کارگل کی برف پوش پہاڑیوں پر برسر پیکار تھے، جب کشمیری مجاہدین نے غیر متعین لائن آف کنٹرول پار کر لی تھی۔ یہ ٹکراؤ اتنا شدید تھا کہ ایٹمی تصادم نزدیک نظر آنے لگا تھا۔

اس سے ایک سال پہلے دونوں ملکوں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ بھارت نے پانچ ایٹمی دھماکے کیے، سختی سے جواب دیتے ہوئے پاکستان نے چھ ایٹمی دھماکے کر ڈالے۔ دنیا بے بس اور خوفزدہ ہو کر دیکھنے لگی! اس کے بعد پابندیاں لگ گئیں۔ پھر دونوں ملکوں نے اعلان کر دیا کہ وہ کمپری ہینسو ٹیسٹ بین ٹریٹی (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کریں گے۔ یہ مقدس اعلانات اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں سنجیدگی سے کیے گئے۔ دنیا کے جذبات ٹھنڈے پڑے تو یہ اعلانات بھی اقوام متحدہ کے محافظ خانے میں چلے گئے، جہاں ایسی قراردادیں رکھی جاتی ہیں، جن پر عمل درآمد نہ ہو سکے۔ ان قراردادوں میں کشمیر کے مسئلے سے متعلق قرارداد بھی شامل ہے، جو دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کا باعث بنی ہوئی ہے۔

مارچ میں صدر کلنٹن نے جنوبی ایشیا کے دورے کے دوران دونوں ملکوں پر زور دیا کہ وہ اعتماد کی بحالی کے اقدامات پر مذاکرات شروع کریں تا کہ علاقے میں امن کے قیام میں مدد مل سکے۔

دونوں ملکوں نے نیکی نیتی سے مذاکرات پر اتفاق کیا۔ گزشتہ ہفتے پاکستان کی نیشنل سکیورٹی کونسل نے موجودہ سکیورٹی کی صورتِ حال پر غور کیا۔ انہوں نے لائن آف کنٹرول پر کشیدہ صورتِ حال پر بحث کی، جہاں دونوں ملکوں کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہیں۔

اجلاس جاری تھا تو پاکستان کے ایک ترجمان نے بھارت پر توپوں سے گولہ باری کا الزام لگایا جس سے تین افراد شہید اور بہت سے زخمی ہوگئے تھے۔ پاکستان سیکرٹری خارجہ نے اعلان کیا ''اگر نئی دلّی نے کشمیری مجاہدین کا بہانہ بنا کر پاکستان پر حملہ کیا تو منہ توڑ جواب دیا جائے گا۔'' ایک غیر واضح اشارے کے طور پر انہوں نے مزید کہا، ''ہم اپنی مکمل دفاعی صلاحیتوں کا استعمال کریں گے۔''

گزشتہ مئی میں کارگل مہم کی تکلیف سے کراہتے ہوئے بھارت کے لیے پاکستان ایک پرکشش ہدف ہے۔ بین الاقوامی طور پر یہ ملک تنہا ہو چکا ہے۔ جرنیلوں نے جنہوں نے، گزشتہ اکتوبر میں غیر عوامی آمر کا تختہ اُلٹا تھا، جمہوریت کی بحالی کے ٹائم ٹیبل کا اعلان نہ کر کے وقت کا ساتھ نہیں دیا۔ ٹیکنو کریٹس کی مبالغہ آمیز حد تک مشہور کی گئی ٹیم، جسے فرائض سونپے گئے ہیں، وہ اپنے ہی لگائے ہوئے زخموں کی طرف توجہ دے رہی ہے۔

اس زمرے میں مالیاتی ٹیم بھی شامل ہے۔ اس کے روشن دماغ لوگوں کو آئی ایم ایف سے رقم کی ضرورت تھی، جو قرضے کی سہ ماہی قسطیں دے کر پاکستان کی معیشت کو رواں دواں رکھتی ہے۔

اپنے گھر کا نظم و نسق درست کرنے کے بجائے انہوں نے یہ انکشاف کر کے مزید رقم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا کہ گزشتہ حکومت نے اعداد و شمار خصوصاً دفاعی اخراجات پیش کرنے میں بددیانتی کی تھی لیکن اس کے باوجود مزید رقم کے بجائے انہیں ہلکی سی آتش ملی ہے۔ آئی ایم ایف نے ملک پر 55 ملین ڈالر کا جرمانہ کر دیا ہے۔ اس مہلک غلطی پر کسی کو برطرف نہیں کیا گیا، جس کی وجہ سے ملک اعتماد، سرمائے اور زرمبادلہ سے محروم ہو گیا۔ سفارت کاروں کی کارکردگی بھی اچھی نہیں رہی۔ صدر کلنٹن کے پاکستان کے دورے کے وہ اتنے مشتاق تھے کہ انہوں نے واشنگٹن کی طرف سے ملنے والے اشاروں کو بھی نظرانداز کر دیا۔ یہ اشارے واضح طور پر اور مسلسل پریس اور تھنک ٹینکس کے ذریعے آتے رہے تھے۔ پیغام تسلسل سے ایک ہی تھا، پاکستان کو امریکی خارجہ پالیسی کے اس الزام سے بچانے کے لیے اقدامات کرنا ہوں گے کہ یہ فوجی آمروں کی حمایت کرتی ہے، ورنہ صدر کلنٹن نے اگر دورہ کیا بھی، تو وہ چند گھنٹوں کا دورہ ہوگا اور پھر وہ جو کچھ کہیں گے حکومت اسے پسند نہیں کرے گی۔

صدر کلنٹن نے پاکستان کا دورہ کیا اور جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے، حکومت نے اسے پسند نہ کیا۔ سچائی اکثر تلخ ہوتی ہے۔ لیکن اگر پاکستان دوستانہ جذبے کے تحت کشادہ دلی سے کہے گئے الفاظ کو نظر انداز کرنا چاہتا ہے، تو اس سے صرف بھارتی جرنیلوں ہی کو فائدہ پہنچے گا جو گزشتہ موسم بہار سے بدلہ لینے کے لیے تلملا رہے ہیں۔

سیاست میں ملوث کی گئی سکیورٹی ایجنسیاں سکیورٹی کی صورت حال کو سنبھالنے میں ناکام ہیں۔ گزشتہ ہفتے امریکی حکومت پاکستان کو ایک دہشت گرد ملک قرار دینے میں ایک قدم ہی پیچھے رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود حکومت ان گروپوں کے متعلق مسلسل لاپرواہی کا مظاہرہ کر رہی ہے، جو اپنے ارکان کو مذہبی تشدد اور دہشت گردی کی تربیت دے رہے ہیں۔

ایک تکلیف دہ واقعہ یہ ہے کہ ایک ناکام بغاوت کے فوجی لیڈر کو رہا کر دیا گیا ہے اور ایک رپورٹ کے مطابق اسے گزشتہ مراعات بھی دی گئی ہیں۔ 1995ء میں میجر جنرل ظہیر الاسلام نے صدر، وزیر اعظم اور آرمی چیف کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ ان کا منصوبہ تھا کہ جی ایچ کیو پر قبضہ کرنے کے بعد قوم سے خطاب کریں گے اور پاکستان کو ایک ایسی مذہبی ریاست قرار دیں گے، جو اسلامی ملکوں کے درمیان سرحدیں تسلیم نہیں کرے گی۔

میجر جنرل کو جو نرم سزا دی گئی، وہ اپنی سختی میں اس سلوک کے بالکل برعکس تھی، جو اب سابق انٹیلی جنس چیف لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل صاحب سابق وزیر اعظم کی اس کوشش میں مدد کرنے پر جیل میں تکلیف دہ زندگی گزار رہے ہیں کہ ایک وفادار کے تقرر کے ذریعے آرمی میں جوڑ توڑ کیا جائے۔ جنرل ظہیر، جنہیں اسلامی بھائی چارے کے نام پر بغاوت کے جرم میں سزا دی گئی تھی، کو سابقہ مراعات کے ساتھ رہا کرنے کی رپورٹ اگر درست ہے، تو اس سے موجودہ حکومت کے اعلیٰ طبقے میں طالبان کے حامی عناصر کے لیے ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔ پاکستان کے فوجی حکمران جنرل مشرف اپنے دعوے کے مطابق آزاد خیال ہیں۔ انہیں شاذ و نادر ہی ایک ایسا طاقت ور شخص کہا جاتا ہے، جتنا ان کے فوجی پیش رو جنرل ضیاء تھے، تاہم جب تک جنرل مشرف اپنی قیادت میں پاکستان کی منزل کی وضاحت نہ کر دیں تو یہ ملک ایسی مشکلات کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا ہے جس کا انجام تصادم ہے۔ فوجی حکومت تو اپنی ضد پر قائم ہے، دوسری طرف بھارتی قیادت اس قسم کی لچک دکھا رہی ہے جسے چند لوگ ہی ممکن سمجھتے ہیں۔

سیاسی مہارت دکھاتے ہوئے بھارتی قیادت نے قلابازی کھا کر آل پارٹیز حرّیت کانفرنس کو حقیقت میں تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے۔ حرّیت کانفرنس حد بندی کے اس پار کشمیری پارٹیوں کا ایک

ملغوبہ ہے، جو کشمیری عوام کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بھارتی ''عقاب'' وزیر داخلہ ایڈوانی نے ڈرامائی طور پر آل پارٹیز حرّیت کانفرنس کو مذاکرات کی دعوت دی ہے۔ کانفرنس کے متعدد لیڈروں کو جیل سے رہا کر دیا گیا ہے۔ بھارت کشمیری قیادت کو ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے جب کہ اسلام آباد غلط، یا درست طور پر سرکاری، یا غیر سرکاری سطح پر ایسا نظر آتا ہے، جیسے وہ کشمیری قیادت کی جگہ کثیر النسل مسلح عسکری گروپوں کو لا رہا ہے۔ ان میں حرکت المجاہدین، لشکر طیبہ اور افغانوں اور عربوں پر مشتمل گروپ اور دوسرے گروپ شامل ہیں، جو جہادی گروپوں کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ صدر کلنٹن کے دورے کے بعد اپنے ملکوں کی سمت متعین کرنے کے متعلق اسلام آباد کے دو غلے پن کے مقابلے میں نئی دلّی کا شفاف پن واضح نظر آ رہا ہے۔

دہشت گردی پر اسلام آباد کو تنبیہہ کرنے اور اسے دہشت گرد ممالک کی فہرست میں شامل کرنے سے باز رہتے ہوئے امریکہ نے پاکستان کو بتا دیا ہے کہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ کشمیری مجاہدین کو رہا کر کے اور کشمیری لیڈروں کو مذاکرات کی دعوت دے کر نئی دلّی نے واشنگٹن کو بتایا دیا ہے کہ وہ مسئلے کے حل پر تو نہیں، البتہ مسئلے کی وجہ پر بات کرنے کے لیے تیار ہے۔ اسلام آباد کی طرف سے ابھی امریکہ کو آگاہ کرنا باقی ہے۔ اس کی خاموشی سے اعلیٰ حلقوں میں یہ تاثر پھیلتا جا رہا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر بھارت تو ''ایک بنیادی کردار'' کی حیثیت سے آگے آ رہا ہے، جب کہ پاکستان ''ایک بنیادی مسئلہ'' بنتا جا رہا ہے۔

اسی تاثر کی وجہ سے بھارت کو حوصلہ مل رہا ہے کہ وہ لائن آف کنٹرول پر توپوں سے گولہ باری کرے، جب کہ وہ کشمیریوں کے ساتھ امن کی کوشش بھی کر رہا ہے۔ یہی خاموشی ہے، جو پاکستان کو تنہا کر رہی ہے، جب کہ اس کی سرحدوں پر گولہ باری کے ساتھ اس کی معیشت پر بھی حملے ہو رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے، ''جب سردی آتی ہے، تو کیا پھر بہار دور رہ سکتی ہے؟'' جب مئی کا مہینہ آتا ہے مصیبت سر اُٹھا لیتی ہے۔ پاکستان کے جرنیلوں کے لیے یہی وقت ہے کہ وہ ترجیحات ترتیب دیں۔ وہ جمہوریت کے ٹائم ٹیبل کے لیے سیاسی لیڈروں کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں۔ تاکہ صورت حال کا مقابلہ سیاست دان کریں، یا پھر وہ اپنے مشیروں کے ساتھ کام کرتے رہیں، جن کے پاس عقل و شعور کی کمی ہے۔ یہ ایک المیہ ہو گا اگر موسم بہار صرف ایک اجاڑ اور سنسان موسم سرما کی علامت بن کر آئے۔

سقوطِ کابل کے بعد پاکستان کے لیے لائحہ عمل

تاریخ پاکستان اور اس کے ہمسایہ ملک افغانستان پر گہرے اثرات مرتب کر رہی ہے۔ القاعدہ کے مشکوک افراد کی بابت سیاسی سمجھوتہ میں ناکامی کے باعث علاقے پر سیاہ بادل منڈلا رہے ہیں۔ 11 ستمبر کے واقعات نے سیاست کا ناک نقشہ بدل کے رکھ دیا ہے۔ امریکہ کے بی 52 ایک ایسے ملک پر بمباری کر رہے ہیں، جسے جنگ سے تو بہت زیادہ واسطہ پڑا ہے، لیکن امن کے دن دیکھنا نصیب نہیں ہوئے۔

عوام کے اندر افغانیوں کے لیے ہمدردی و قربانی کے پُرجوش جذبات پیدا ہو گئے ہیں، جنہیں کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ بعضوں نے تو جوش میں آ کر عمر بھر کی جمع پونجی جہاد فنڈ میں دے دی، جب کہ بہت سی ماؤں نے اپنے نوجوان نورِ نظر جہادِ اسلام میں حصہ لینے کے لیے محاذِ جنگ پر بھیج دیئے۔ انہیں یہ یقین دلایا گیا تھا کہ زمینی لڑائی شروع ہونے کی صورت میں فتح اُن کی ہوگی۔ دنیا کی واحد سپر پاور کو شکست دینے کے جذبہ سے سرشار ہزاروں نوجوان مجاہدین کیمپوں میں پہنچ گئے، جہاں انہیں فتح و نصرت کی خوشخبریاں سنائی گئیں۔ لڑائی شروع ہونے کے بعد نتیجہ کا کسی کو اندازہ نہیں تھا، خود اسلام آباد کا یہ حال تھا کہ نوجوان بارڈر پار کر کے افغانستان میں داخل ہو رہے تھے اور یہاں طالبان کے بعد کی صورتِ حال پر غور کیا جا رہا تھا۔

نہتّے اور ضروری ساز و سامان سے محروم طالبان کی سپر پاور کے ساتھ لڑائی کا انجام صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ شکست سے دوچار ہوں گے۔ ہمارے جو نوجوان کابل پہنچے، انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔ افغان ملیشیا تو جنگ شروع ہوتے ہی دیہات میں چلی گئی، البتہ عرب مجاہدین نے ڈٹ کر

مقابلہ کیا اور صورتِ حال کو نازک دیکھا تو غاروں اور پہاڑوں کی طرف نکل گئے۔ پاکستانی وہاں کے جغرافیائی خدوخال سے بے خبر تھے، اس لیے کہیں نہیں جا سکے۔ وہ بے چارے یا تو گرفتار کر لیے گئے، یا مار دیئے گئے۔ جن پاکستانی لیڈروں نے انہیں جوش دلا کر سرحد پار بھیجا تھا، وہ گھروں میں ''نظر بند'' ہو کر بیٹھ رہے۔

جب شمالی اتحاد نے پیش قدمی شروع کی تو پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد ماری گئی۔ نہ کسی نے انہیں جانے سے روکا تھا، نہ کوئی اُن کی لاشیں قبول کرنے پر تیار ہوا۔ انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ عرب بیواؤں اور یتیموں پر کیا گزری، کسی کو معلوم نہیں۔ شکست اپنے تلخ نتائج رکھتی ہے۔ زمینی جنگ پر فتح کے سہانے خواب جلد ہی ہوا ہو گئے اور کافروں کے خلاف جہاد کی حمایت میں نکلنے والے جلوس نکلنا بند ہو گئے۔ پورے ملک پر خاموشی چھا گئی۔ بعض حلقوں کی طرف سے اُن لوگوں کا محاسبہ کرنے کا مطالبہ کیا جانے لگا، جنہوں نے نوجوانوں کو بھڑکا کر محاذ جنگ پر بھیجا تھا۔ بعض لوگ اُن ماؤں سے اظہار ہمدردی کرنے لگے، جن کے جوان بیٹے لڑائی میں کام آ گئے تھے، یا نوجوان بیواؤں اور یتیموں کے لیے ہمدردانہ جذبات کا اظہار ہونے لگا۔

دوسری افغان وار دنیائے اسلام کے لیے دوہرا سانحہ ہے۔ یہ ایسی بے مقصد اور بے معنی لڑائی ہے، جو کبھی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ بہرحال جنرل ضیاء کے دور میں جو مدرسے قائم ہوئے تھے، اُن کے لیے یہ جنگ تباہی، بربادی کا اور شرم وندامت کا سامان لے کر آئی ہے۔

طالبان نے سیاسی تصفیہ کی پیش کش کو ٹھکرا کر کچھ حاصل نہیں کیا۔ جو لوگ پہلے اُن کے حامی تھے، اب خاموش، بلکہ غمزدہ ہیں۔ فتح کے ہزاروں باپ ہوتے ہیں، جب کہ شکست کی حیثیت ایک یتیم کی سی ہوتی ہے۔ جو لوگ طالبان کی غیر دانش مندانہ حکمتِ عملی کی حمایت کر رہے تھے، وہ اخلاقی اور سیاسی طور پر واقعات کے ذمہ دار ہیں۔ وہ اُن ہزاروں پاکستانیوں کے سامنے جواب دہ ہیں، جنہیں بلا شیری دے کر بلا مقصد جنگ میں جھونک دیا گیا۔

طالبان جنگ کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اسلام آباد کے حکمرانوں کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھا، تاہم تاریک بادل بدستور چھائے ہوئے ہیں۔ دنیا کی توجہ دہشت گردی پر مرکوز ہے۔ اگر ہماری فوجی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ ہمدردی کی موجودہ لہر کے نتیجہ میں پاکستان کے مسائل حل ہو جائیں گے تو وہ سخت غلطی پر ہے۔

جنرل ضیاء کے دور میں پوری دنیا پاکستان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی رہی لیکن ہمارے سیاسی ومعاشی بحران کا حل تلاش کرنے میں کسی نے ساتھ نہیں دیا۔ ہمدردی کی موجودہ لہر بھی ہماری

قسمت نہیں سدھار سکے گی۔ آخر کار ہر قوم کو اپنے پاؤں پر خود ہی کھڑا ہونا پڑتا ہے، مگر جب تک اندرونی استحکام میسر نہ ہو، بیرونی ہمدردیاں کسی کام نہیں آسکتیں۔

ہماری حکومت نے جب عالمی کولیشن میں شرکت کا فیصلہ کیا تو وہ عوام کے لیے کوئی معاشی فوائد حاصل نہیں کر سکی۔ مغربی دُنیا پہلے تو یہ پوچھتی تھی کہ "ہم اسلام آباد کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟" بون سمجھوتہ کے بعد انہوں نے یہ سوال کرنا شروع کر دیا ہے کہ "ہم کابل کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟" یہ سوچنا سراسر حماقت ہے کہ اربوں، کھربوں ڈالر جو کابل کو ملنے والے ہیں، وہ پاکستانی ٹھیکیداروں کی جیبوں میں آ جائیں گے۔ اسٹیبلشمنٹ کی افغان پالیسی نے شمالی اتحاد کے ساتھ ساتھ بہت سے پشتون لیڈروں کو بھی پاکستان سے دور کر دیا ہے، اس لیے وہ پاکستانی ٹھیکیداروں پر ہرگز اعتماد نہیں کریں گے۔

11 ستمبر کے بعد امریکہ کی سرگرم حمایت دیکھ کر ہماری فوجی حکومت نے بھارت کو آنکھیں دکھانا شروع کر دی تھیں۔ اسلام آباد کے لیے یہ جنگ بہت جلد ختم ہوگئی۔ جنرل دوستم نے جنوب میں طالبان کو پسپائی اور سرنڈر پر مجبور کر دیا۔ پاکستان اب بھی بیرونی طاقتوں سے آس لگائے بیٹھا ہے، مگر اندرونی بحران کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔ فوجی آمریّت میں کوئی سرمایہ دار سرمایہ کاری نہیں کرتا۔ تجارت معاشی ترقی کی کلید ہوتی ہے۔ یہ کلید مدرسوں میں گم ہوگئی ہے۔ آج کل مدرسوں میں طلباء تجارتی اور کاروباری اُصول سیکھنے کے بجائے بندوق چلانے کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ بہرحال بیسویں صدی کا سبق یہی ہے کہ خود کو معاشی طور پر مضبوط بناؤ۔ اقتصادی مفادات پُرامن تعلقات کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا کی ترقی پذیر منڈیوں کو عالمی تجارت اور پیداوار میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ انگریزوں کے انڈیا پر قبضہ سے پہلے یہ خطہ دُنیا کے مال دار ترین خطوں میں سے ایک تھا۔ اگر یہاں تنازعات سے قطع نظر کرتے ہوئے امن قائم کر دیا جائے تو یہ خطہ دوبارہ خوشحال و ترقی یافتہ بن سکتا ہے۔

دنیا کی آبادی کا ایک چوتھائی جنوبی ایشیا میں آباد ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس کی مجموعی آمدنی عالمی آمدنی کے 2 فیصد سے بھی کم ہے۔ اس کی 430 ڈالر فی کس آمدنی دنیا کی آمدنی کا اوسطاً 10 فیصد بنتی ہے۔ جو بہت زیادہ بھوک، افلاس اور بیماری کی مظہر ہے۔ 45 فیصد آبادی غربت و افلاس کا شکار ہے اور اس کی یومیہ آمدنی ایک ڈالر سے کم ہے، جب کہ دو ڈالر سے کم آمدنی والوں کی تعداد تو کروڑوں میں ہے۔

ترقی یافتہ ممالک تنازعات کو ایک طرف رکھ کر متفقہ ویلیو سسٹم اپنا لیتے ہیں۔ جس میں لوگوں کی خواہش، قانون کی بالا دستی، منصفانہ الیکشن اور منصفانہ عدالتی نظام کا احترام شامل ہے۔ پاکستان میں اس قسم کی متفقہ سوچ ابھی نہیں اُبھری۔ یہاں بہت سے لوگ دھاندلی والے الیکشن، یا بے ایمانی پر مبنی فیصلوں کو ''قومی مفاد'' میں قبول کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ قومی مفاد کا تعین وہ لوگ کرتے ہیں، جو اپنے ساتھ شکست اور رسوائی لیے پھرتے ہیں۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان میں ''قومی مفاد'' کے حوالے سے کس طرح کا عمل کیا گیا، پھر 1979ء میں ایک وزیراعظم کو پھانسی دے دی گئی۔ 1988ء میں سیاچن کھو دیا۔ 1999ء میں کارگل کی فتح کو شکست میں بدل دیا۔ پھر مستقبل سے بے پرواہ ہو کر طالبان کی سرپرستی کی گئی، گویا قومی مفاد پر عمل کرنا اسٹیبلشمنٹ کا استحقاق ہے۔ چنانچہ بحث کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں، پارلیمنٹ معطل پڑی ہے اور جو لوگ اس نام نہاد قومی مفاد کو چیلنج کرتے ہیں، انہیں غدار قرار دے دیا جاتا ہے، انہیں شہریت سے محروم کرنے کی تدبیر کی جاتی ہے، اس قسم کی ناقابلِ برداشت پالیسیاں عدم تحمل اور عدم رواداری کے کلچر کو ہی فروغ دیتی ہیں۔ ہمیں اس کلچر کو چیلنج کرنا ہوگا، ورنہ پاکستان اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ جدید کاروباری نظام میں طلباء کو پڑھایا جاتا ہے کہ گاہک ہمیشہ حق پر ہوتا ہے۔ اسی طرح سیاسی نظام میں ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ ووٹر ہمیشہ حق پر ہوتا ہے۔ جو جرنیل لوگوں کے حق رائے دہی کو مسترد کرتے ہیں، وہ ملک کے لیے مسائل پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

جنوبی ایشیا میں امن قائم ہو جائے تو اقتصادی ترقی کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ انسانی ترقی اس خطہ کو معاشی لحاظ سے خوش حال بنا سکتی ہے۔ اس وقت پاکستان دنیا کے سٹریٹجک حصہ میں ہے اور اسی صورت حال سے فائدہ اُٹھا کر اپنی قسمت بنا سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے چوٹی کے جرنیل تباہ کن پیشین گوئی کرتے ہیں۔

1990ء میں بعض جرنیلوں نے کہا کہ عراق امریکہ کے لیے ویت نام ثابت ہوگا۔

1999ء میں کارگل کے معرکہ کی بابت کہا گیا کہ ہمارے لیے عزت و وقار کا موجب بنے گا۔

حالیہ افغان جنگ کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ طالبان امریکہ کو سبق سکھا دیں گے۔

اس کے برعکس سیاسی لیڈروں کی یہ بات درست نکلی کہ ایک برتر فوجی قوت اپنے سے کم تر قوت پر غالب رہے گی۔ چنانچہ 1990ء میں کویت پر قبضہ، 1999ء میں کارگل کے معرکہ اور 2001ء کی افغان جنگ کی بابت جرنیلوں کے سارے اندازے غلط نکلے۔ تاریخ کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جنگ ایک ایسا سنجیدہ کاروبار ہے جو تنہا جرنیلوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

پاکستان کے لیے مغرب کے حمایت یافتہ اورنوکرشاہی کے حمایت یافتہ ڈکٹیٹر کے مابین تیسرا آپشن بھی ہونا چاہیے۔ 1979ء میں آیت اللہ خمینی کے انقلاب کی کامیابی میں تیسرے آپشن کے فقدان نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ پاکستان کے عوام کے لیے سیاسی استحکام اور معاشی بحالی کی منزل اس وقت شروع ہوگی، جب جرنیل واپس بیرکوں میں چلے جائیں گے اور اس حقیقت کو تسلیم کرلیں گے کہ ''ووٹر ہمیشہ حق پر ہوتا ہے''۔

پاکستان نے موقع گنوادیا

پاکستان کے سرکاری حلقوں نے اس وقت بہت خوشی کا اظہار کیا جب آئی ایم ایف سے معاہدے کے بعد پاکستان پر ایک بلین ڈالر مزید قرضے کا بوجھ ڈال دیا گیا۔ اس بات پر خوشی نہ منائی جاتی تو بہتر ہوتا۔

پاکستان پر بے تحاشا قرضے ہونے کی وجہ سے فیصلے کرنے کے بارے میں اس کی سیاسی آزادی ختم ہو چکی ہے۔ بار بار فوجی مداخلت کی وجہ سے ملکی اقتصادیات قرضوں کے بوجھ تلے دبتی چلی گئی۔ اب جب کہ حکومت کا ہر فیصلہ قرض دینے والے ملکوں کے مفادات سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے، پاکستان اپنی آزادی کھو بیٹھا ہے۔

پاکستان کی راہ میں ایک سنہری موقع آیا تھا کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کر لیتا۔ یہ موقع ایک سانحہ کے نتیجہ میں ملا تھا۔ جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کے بعد دنیا کا ردّعمل سامنے آیا تھا۔ اسی قسم کے بحرانوں میں اردن اور مصر نے اپنے قرضے معاف کروا لیے تھے لیکن موجودہ حکومت نے صرف قرضے واپس کرنے کو مؤخر کروایا۔ جمہوری حکومت، جس نے ایک ارب ڈالر کا قرضہ ادا کیا تھا، کے مقابلہ میں فوجی حکومت مسلسل قرضہ لے رہی ہے۔ اس موجودہ فوجی حکومت میں ملک پر قرضہ جی ڈی پی کا 120 فیصد ہو گیا ہے۔ بیرونی ٹوٹل قرضہ ملک کی برآمدات کا 230 فیصد تک پہنچ چکا ہے۔

جمہوریت نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان کے پاس اس بات کا موقع نہ ہونے کے برابر ہے کہ واپس اقتصادی میدان میں ترقی کر سکے۔ اکیسویں صدی میں جو سوال اُبھر کر سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ کیا وہ قومیں واقعی آزاد ہیں جو قرضے کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہیں۔ بیسویں صدی استعماری

نظام سے نجات حاصل کرنے کی صدی تھی۔ جو روایات غیر منتخب حکمرانوں نے متعدد ملکوں میں چھوڑی ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ قومیں صرف کہنے کو آزاد ہیں جب کہ حقیقی طور پر وہ آزادی سے محروم ہیں۔

پاکستان کو انتظامی طور پر چلانا ہی پاکستانی فوج کا اہم کردار رہا ہے اور پاکستان کے دفاعی اخراجات بھی آسمان سے باتیں کر رہے ہیں اور اُن کا کوئی حساب کتاب بھی نہیں دیا جاتا۔

یو این ڈی پی پاکستان کے لیے کہتا ہے کہ پاکستان میں انسانی ترقی کی رفتار سب سے کم ہے۔ پیدائش کے وقت زندہ رہنے والے بچوں کی تعداد سب سے زیادہ اور بالغوں کی تعلیم سب سے کم ہے۔ حقیقی طور پر فی کس سالانہ آمدنی جو 1996ء میں 457 ڈالر تھی۔ 2001ء میں جنرلوں کی حکومت میں صرف 396 ڈالر رہ گئی۔

اسلام آباد کی حالیہ اقتصادی پالیسی یہی ہے کہ وہ قرض دینے والوں کی نظر میں اچھا بنا رہے اور قرضہ دینے والوں کا نقطۂ نظر سیاسی واقعات پر منحصر ہے۔ اس وقت قرضہ دینے والے ممالک اسلام آباد کی ڈکٹیٹر شپ پر مہربانیوں کی بارش کرنے کے موڈ میں ہیں جب کہ دوسری جانب اس کی وجہ سے جو چیلنج سامنے آسکتے ہیں آسانی سے حکومت کو ڈانواں ڈول کر سکتے ہیں۔ بیرونی قوتوں نے نئے سیاسی طریقوں کو متعارف کروایا جس کی وجہ سے فوجی حکومت کو اپنے نہایت عزیز مقاصد ترک کر دینا پڑے۔

ان میں سے پہلا پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور طالبان حکومت کے درمیان رومانس کو ختم کرنا پڑا۔ ایسا کرنا ان پر لازم ہوا جیسا کہ جنرل مشرف نے بھی اپنے قوم کے نام خطاب میں کہا اور جنرل نے بین الاقوامی اتحاد کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ اسلام آباد نے طالبان سے خود کو دور کر لیا اور بالآخر کابل کے زیر ہونے کے بعد اُن سے تعلقات ختم کیے۔ اس کے بعد اسلام آباد نے شمالی اتحاد اور سابق شاہ کی رائے معلوم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ قدم اُس وقت اُٹھایا گیا جب واقعات کسی نتیجہ پر پہنچ گئے۔ اگر پہلے ایسا کر لیا جاتا تو کچھ بہتری کی صورت نکل سکتی تھی۔ ایسی صورت حال اُس وقت بھی ہوئی جب فوجی حکمرانوں نے امریکہ سے اس بات پر مدد مانگی کہ شمالی اتحاد کو کابل میں داخل ہونے سے روکا جائے۔ یہ بے کار سعی اسلام آباد کی قابلیت اور صلاحیت کی نشاندہی کرتی ہے جو وہ سیاسی نتائج کے بارے میں پیشین گوئی نہ کرنے کے بارے میں رکھتا ہے۔

مشرف حکومت کا دوسرا بڑا مقصد وہ پالیسی تھی جو کہ حکمتِ عملی کی گہرائی کہلاتی ہے یعنی Strategic Depth۔ دو عشروں تک انسانی جانیں، اموال اور وسائل اسی حکمتِ عملی کی گہرائی کی

نذر کیے گئے لیکن حکومت اسے نہ بچا سکی۔ اس کے علاوہ حکومت رمضان میں حملہ نہ کرنے کی اپیلیں بھی کرتی رہی جو کہ نہ مانی گئیں۔ بین الاقوامی برادری نے اپنی نظریں جنوب میں جنرل مشرف سے ہٹا کر شمال میں جنرل دوستم پر مرکوز کر دیں۔ کابل رمضان سے پہلے ہی زیر ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی حکمتِ عملی کی گہرائی بھی زیر ہو گئی۔

حکمتِ عملی کی گہرائی میں اپنائی گئی پالیسی کی بنیاد یہ تھی کہ ایک جانب اپنا سارا وزن ڈال دیا جائے۔ اس کے پیچھے یہ سوچ تھی کہ مغرب میں ایک دوستانہ طالبان حکومت ہونے کی وجہ سے ہماری مغربی سرحدیں محفوظ رہیں گی کیونکہ پاکستان کی اپنی مشرقی سرحد پر بھارت کے ساتھ مستقل چپقلش کی صورتِ حال ہے۔ طالبان کی حمایت کی پالیسی کی وجہ سے پاکستان میں سیاست پر اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ جس میں فوج، مذہبی اور انتہا پسند گروپوں میں تعلق بنا۔ اب اس تعلق میں وقفہ آنے سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ وقفہ مستقل ہے اور صرف کابل کے واقعات کی وجہ سے ہے، یا یہ وقفہ، یا لاتعلقی مستقل ہے۔ کیونکہ اس کے بعد کشمیر کی آزادی کی جدوجہد پر اثرات مرتب ہوں گے۔

اب تک بہت کم ترجیحات اور جوابات دیئے گئے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں اسلام آباد کی حیثیت بین الاقوامی برادری کے ساتھی کی حیثیت سے عجب صورت حال اختیار کر گئی ہے کہ وہ ساتھی ہے بھی اور نہیں بھی۔ اس حکمتِ عملی کی گہرائی کے نظریہ اور پاکستانی سیاست کے درمیان یہ رشتہ تھا کہ اس حکمتِ عملی کی گہرائی کی پالیسی کی وجہ سے پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی کو اقتدار سے الگ کیا گیا اور مستقل اقتدار سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ پیپلز پارٹی نے مذہبی سیاسی پارٹیوں کا مقابلہ کیا تو اس کی وجہ سے وہ فوجی اسٹیبلشمنٹ کا اعتماد کھو بیٹھی۔ فوجی اسٹیبلشمنٹ نے اپنی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی مدد سے متعدد سیاسی پارٹیاں قائم کیں تا کہ پیپلز پارٹی کو اقتدار سے باہر رکھا جا سکے۔ جنرل (ر) حمید گل نے اس بات کا برملا اظہار کیا کہ انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی) اس مقصد کے لیے قائم کیا تھا جب 1988ء میں وہ آئی ایس آئی کے سربراہ تھے۔

نواز شریف بھی اسلامی جمہوری اتحاد کے بطن سے نکلے تھے اور جب مشرف حکومت نے نواز شریف سے رشتہ توڑا تو آئی ایس آئی اور اس کے سربراہ جنرل محمود کو ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ایک نئی سیاسی پارٹی بنائیں اور اسی طرح پنجاب میں ہم خیال اور دیگر علاقوں میں پارٹیاں بنائی گئیں۔ طالبان اور کابل میں اپنی حکمتِ عملی کی گہرائی کی پالیسی ترک کر دینے کے بعد مشرف حکومت کا تیسرا

امتحان یہ ہوگا کہ کیا وہ ملک کے اندر اپنے تعلقات مذہبی انتہا پسندوں سے ختم کرتے ہیں، یا نہیں۔

فوجی حکومت مذہبی پارٹیوں کے ساتھ تعلق کو اس لیے جائز قرار دیتی ہے کہ کشمیر کی وادی میں تنازع موجود ہے۔ اس لیے مشرف حکومت کے لیے چوتھا امتحان یہ ہوگا کہ وہ کشمیر میں مذہبی پارٹیوں کے خلاف کارروائی کرتے ہیں، یا نہیں۔

جب پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف مہم میں شمولیت کی تھی تو بڑی اُمیدیں تھیں کہ امریکہ پاکستان کی مدد اقتصادی طور پر کرے گا اور پاکستان کی خواہش کی بنیاد پر کشمیر کا تنازع حل کروائے گا لیکن اسلام آباد کی توقعات سے کہیں پہلے افغانستان میں جنگ ختم ہوگئی۔ اسلام آباد کی اہمیّت جلد ختم ہوگئی اور موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

پاکستان کے لیے ڈیورنڈ لائن افغانستان کی طرف سے ایک چیلنج ہوسکتا ہے۔ پشتون آبادی کو الگ تھلگ کرنے اور افغانستان کی جنگ کے مضمرات کی وجہ سے ایک نیا نسلی مسئلہ کھڑا ہوسکتا ہے۔ پشتونوں میں جنگ جُو یانہ رجحان اور قومیّت پرستی زور پکڑ رہی ہے۔ 1980ء میں افغانستان اور پاکستان کے درمیان سرحدیں بھی باقی نہیں رہی تھیں۔ پشتون کوئٹہ سے قندھار اور پشاور سے جلال آباد آنے جانے کے عادی ہوگئے۔ ایک اور مسئلہ پاکستانی لڑاکاؤں کا افغانستان میں مارا جانا، یا گرفتار ہونا ہے۔ حکمتِ عملی کی گہرائی کی پالیسی کے تحت فوجی حکومت کے اُن لڑاکاؤں اور اُن کے گروپوں سے قریبی تعلقات تھے۔ اب جب کہ اسلام آباد کی پالیسی ختم ہوگئی ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن لڑاکا افراد کا کیا بنے گا، اُن کی لاشوں کا کیا ہوگا اور جو کابل کی جیل میں گرفتار ہیں اُن کا کیا مستقبل ہوگا؟ اُن کے خاندانوں کو کیا جواب دیا جائے گا؟ یا انہیں بھی اسی طرح بے یارو مددگار چھوڑ دیا جائے گا جیسا کہ کارگل میں کیا گیا تھا۔

جنرل مشرف اپنے صدر رہنے کے ارادہ کو چھپانے کی ذرہ برابر بھی کوشش نہیں کرتے۔ حالانکہ انہوں نے اپنے لیے جو بنیاد ڈالی تھی وہ بکھر رہی ہے۔ سیاسی پارٹیوں نے اُن کا اُس وقت ساتھ دیا جب کہ وہ اُن کی حکومت ختم کرسکتی تھیں۔ اور وہ عوام کو سڑکوں پر نہیں لائیں۔ ان پارٹیوں سے اب تک حکومت کا اختلاف ہے۔ حکومت سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لیے اپنی شرائط پر اڑی ہوئی ہے اور نہ ہی سیاسی مفادات کے لیے قائم کیے ہوئے مقدمات ختم کرنے پر تیار ہے اور نہ ہی انتخابات کے آزادانہ اور منصفانہ ہونے کو یقینی بنانے کے لیے کوئی اقدامات کر رہی ہے۔ مشرف سیاست پر اپنا قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔

مشرف کا فوج کا سربراہ رہنا آئندہ سال اکتوبر میں ہونے والے انتخابات کے اہم

کرداروں اور فوجی حکومت کے درمیان ایک بڑی خلیج ہے۔ مذہبی پارٹیاں بھی غصہ میں ہیں۔ انہیں یہ احساس ہے کہ اسٹیبلشمنٹ نے انہیں دھوکہ دیا ہے اور انہیں بے سہارا چھوڑ دیا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ نے جو نئی پارٹیاں بنائی تھیں وہ بھی نہیں چل سکیں۔ قومی موڈ تلخی کا ہے۔ اس بات پر غصہ ہے کہ پاکستان جو کہ فرنٹ لائن سٹیٹ تھا اس کے حکمرانوں نے بد انتظامی کا مظاہرہ کیا اور وہ پچھلی صدی کے ایف۔16 بھی حاصل نہ سکے۔

ہر شکست کو قربانی کے بکرے کی ضرورت پڑتی ہے اب جب کہ مشرف سیاسی لیڈروں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں وہ فوجی افسروں اور جوانوں پر الزام نہیں لگا سکتے۔ ایک قوم اور ایک فوج جس نے افغانستان میں طالبان کی پالیسی کی حمایت کی اور اس کے مذہبی گروپوں کی مدد لی، اس بات کے جوابات تلاش کر رہی ہے کہ کیا غلطی ہوئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ کارگل کے مسئلہ پر جس طرح نواز شریف کو ڈکٹیٹ کیا گیا تو یہ فوج کے مورال اور عزت و وقار کے لیے خطرہ ہوگا۔ اب غلط پالیسی چھوڑنے کے بعد ایک قربانی کے بکرے کی ضرورت ہے۔ فوجی حکومت کو قربانی کے لیے خود کو پیش کر دینا چاہیے۔

پاکستان میں عوام کو مزید خرابیاں پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ اس خطرے کو دل میں محسوس کیا جا رہا ہے کہ افغانستان کے خلاف جنگ، پاکستان میں مدرسوں کے خلاف جنگ کی صورت نہ اختیار کر لے۔ فوجی حکومت ان حالات کو فوج کے مقاصد کی تبدیلی کے لیے استعمال کر سکتی ہے اور فوج کو سیاسی مقاصد سے ہٹا کر اکیسویں صدی میں دنیا میں امن قائم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

پاکستانی فوج کے امیج کو بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کو ڈکٹیٹر شپ سے دور کرے اور عوام سے ٹکر نہ لے۔ پاکستان، پاکستانی آئین اور منتخب حکومت کو مقدم رکھے کیونکہ اسی سے پاکستانی فوج کا امیج بہتر ہو سکتا ہے اور وردی میں ملبوس پاکستانی فوج کا وقار اور احترام بڑھ سکتا ہے۔

پاکستانی فوج کے نئے مقاصد کا رشتہ ایک نئے ماحول سے وابستہ ہے جس سے پاکستان کے نیوکلیئر اثاثے بھی محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اس خدشہ کا اظہار کیا جاتا رہا ہے کہ پاکستان کے ایٹمی ہتھیار، مذہبی انتہا پسندوں کے ہاتھ میں جا سکتے ہیں اور بریگیڈیئر مستنصر باللہ کی جانب سے بغاوت کی کوشش بھی ان خدشات کو جنم دینے کی ایک وجہ ہے۔

جنرل مشرف نے جنرل محمود اور جنرل عثمانی کو ہٹا دیا ہے لیکن انہیں کسی اصلاح کے لیے نہیں ہٹایا گیا۔ جنرل مقبول کی حالیہ تقرری اس نظریہ کی تائید کرتی ہے۔ جنرل مقبول، جنرل رحیم الدین

کے سابق ملٹری سیکرٹری رہ چکے ہیں۔ جنرل رحیم سوویت یونین کے خلاف جہاد میں بلوچستان کے انچارج تھے۔

1979ء میں سوویت یونین کے افغانستان میں داخل ہونے کے بعد فوجی اسٹیبلشمنٹ افغانستان کی سیاسی صورت حال میں ملوث رہی ہے۔ اب 2001ء میں حامد کرزئی کے نگران حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے حلف اُٹھانے کے بعد پاکستانی فوج کا کردار ختم ہوگیا ہے۔

پاکستان کی حفاظت کے لیے حد سے زیادہ تشویش کے ایجنڈا نے پاکستان کی اقتصادیات کو زیر بار کر دیا ہے۔ اب کچھ لوگ اس بات پر آنسو بہا رہے ہیں کہ افغانستان میں طالبان حکومت نے جس حکمتِ عملی کی گہرائی کی پالیسی کا وعدہ کیا تھا وہ ختم ہوگئی لیکن پاکستانی عوام پر ڈالا جانے والا ایک بوجھ ختم ہوگیا۔

اب خراب اقتصادی صورتِ حال کی وجہ سے پاکستان ایک آزاد ملک کی حیثیت سے کام کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوگیا ہے۔ اب یہ سانحہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجا جانے والا ایک موقع بن سکتا ہے کہ کشکول پھینک کر پاکستان کی اقتصادیات کو بحال کیا جائے۔ کابل سے اُٹھنے والی موج پاکستان کی سیاست کے گند کو بہائے لے جا رہی ہے جس کی وجہ سے پاکستان مصیبت میں پھنس سکتا ہے۔

مشرف حکومت اُمید لگا سکتی ہے کہ مغرب اس کی سیاسی مدد کرسکتا ہے لیکن مغرب کابل کے حالات میں پھنسا ہوا ہے اور اس پر بڑی ذمہ داری ہے۔ فوجی حکومت جس نے طالبان سے رشتہ توڑ لیا اور حکمتِ عملی کی گہرائی کی پالیسی بھی ترک کردی ہے، اب جنگ جوؤں اور مدرسوں سے پیچھا چھڑانے پر بھی عمل کیا جائے گا۔ جس سے مذہبی گروپوں اور فوجی اسٹیبلشمنٹ کے تعلقات متاثر ہوں گے۔

جنرل مشرف ایک وقت میں جنرل ضیاء کے اہم مددگار ساتھی تھے اور کہا جاتا ہے کہ جنرل ضیاء کی موت سے ذرا پہلے ہی جنرل ضیاء کے ملٹری سیکرٹری بننے والے تھے۔ اب انہیں فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ماضی کی قوتوں کے ساتھ رہنا پسند کریں گے، یا سارے تعصّبات کو چھوڑ کر مستقبل کی قوتوں کا ساتھ دیں گے۔

انٹیلی جنس افسروں کا غلبہ

رفیق احمد تارڑ نے 15 اگست 2000ء کو کابینہ کے چار نئے وزیروں سے حلف لیا۔ جنرل پرویز مشرف کی طرف سے فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے کے ایک سال سے کم مدت بعد کابینہ میں ردّ و بدل کیا گیا ہے۔ کابینہ میں ردّ و بدل سے پاکستان کی سیاست میں انٹیلی جنس افسروں کا اثر و رسوخ ظاہر ہوتا ہے۔ اس اثر و رسوخ کا آغاز گزشتہ فوجی آمر کے دور میں ہوا تھا۔

ایک بیرونی طاقت کی طرف سے 1979ء میں افغانستان پر قبضے سے، جنرل ضیاء کے اقتدار حاصل کرنے کے دو سال بعد پاکستان کی سیاست کا رُخ تبدیل ہو گیا۔ آخری دموں پر آئی ہوئی آمریت پھر سے جی اُٹھی، جو ایک منتخب وزیراعظم کو وحشیانہ طریقے سے پھانسی دینے اور ہزاروں نوجوانوں کو سنگدلی سے کوڑے مارنے کی وجہ سے قابلِ نفرت بن گئی تھی۔

افغانستان پر بیرونی قبضے کی وجہ سے پاکستان آزاد دنیا کو درپیش جنگ میں ایک اہم ملک بن گیا۔ اس طرح امریکہ سمیت بہت سے ملکوں کے خفیہ اداروں کی سرگرمیاں پاکستانی سرزمین پر شروع ہو گئیں۔

اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ امریکہ کی سی آئی اے نے کس طرح اربوں ڈالر سوٹ کیسوں میں بند کر کے اس ملک میں پہنچائے۔ سی آئی اے نے خود بھی فراخدلی سے نذرانے اور عطیات دیئے، دولت مند اسلامی ملکوں اور وہاں کے امیر خاندانوں کو بھی ایسا کرنے کے لیے کہا گیا اور منشیات کے کاروبار اور اسلحہ کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی کی طرف سے آنکھیں

بند رکھیں۔ایک کتاب میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ جنرل ضیاء کوخوش رکھنے کے لیے سی آئی اے کا سربراہ ڈالروں سے بھرے ہوئے بریف کیس لے کرخود باقاعدگی سے پاکستان آتا تھا۔

جنرل ضیاء اور اُن کے انٹیلی جنس افسروں کے ٹولے کے لیے یقیناً یہ ایک خوشگوار دور تھا۔ چند ایک کی اولاد اب بہت زیادہ امیر لوگوں میں شمار ہوتی ہے۔رقم نقدی کی شکل میں آتی تھی اور اس کا آڈٹ نہیں ہوسکتا تھا۔ بنڈل جہاں ضرورت ہوتی تھی اور جہاں ضرورت نہ بھی ہوتی تھی ، وہاں پہنچا دیئے جاتے تھے۔

آرمی کا کردار بتدریج کم ہوتا گیا، کیونکہ میونسپل ادارے مقامی معاملات نمٹاتے تھے اور انٹیلی جنس سکیورٹی کی دیکھ بھال کرتی تھی۔افغان جنگ اور چار ارب ڈالر سے زائد سرکاری طور پر ملنے والی امداد (جس میں نقد رقوم شامل نہیں) ملک کی خارجہ، دفاعی اور داخلہ پالیسی کے اجزا تھے۔

ایک افواہ ہے کہ انٹیلی جنس کو علم تھا کہ اگست میں ضیاء کا انتقال ہوجائے گا۔اس نے جنرل کو بتا بھی دیا کہ وہ 8اگست 1988ء کو مر جائیں گے۔ 8اگست 1988ء بخریت گزر جانے کے بعد جنرل ضیاء نے اخبار ''دی نیشن'' کو ایک انٹرویو میں بڑے فخر سے بتایا کہ وہ اس خوفناک تاریخ کے بعد بھی زندہ ہیں۔

نو دن بعد 17اگست 1988ء کو ضیاء مر گئے۔اُن کی تجہیز و تکفین کے بعد جب اُن کی لاش ملی تو انٹیلی جنس نے حکم دیا کہ اسے پوسٹ مارٹم کے بغیر خفیہ طور پر دفنا دیا جائے۔قومی تعلق کے حوالے سے ملک ابھی چند روز پہلے ہی اسلام آباد میں اُن کی سرکاری تجہیز و تکفین سے فارغ ہوا تھا۔

طیارے کے حادثے میں جنرل ضیاء کے مرنے کے بعد انٹیلی جنس کچھ زیادہ ہی فعال ہوگئی۔ کور کمانڈروں کے فوری طور پر بلائے گئے اجلاس میں انٹیلی جنس نے تجویز پیش کی کہ آئین پر عمل کرتے ہوئے سینیٹ کے چیئر مین کو صدر بنا دیا جائے۔ یہ انٹیلی جنس ہی تھی، جس نے اُس وقت صدر کے لیے کابینہ تشکیل دی، ضیاء کی حامی طاقتوں پر مشتمل ایک سیاسی جماعت بنائی اور ایک معلق پارلیمنٹ یقینی بنانے کے لیے پارلیمنٹ کی تقریباً دس فیصد نشستوں میں ہیرا پھیری کی گئی۔

ہیرا پھیری کے باوجود جب پاکستان پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی تو انٹیلی جنس نے پینترا بدلا۔اس نے پی پی پی کے اُن لیڈروں کو وزارتِ عظمیٰ کی پیش کش کی جو اپنے گروپ سے دس ووٹ توڑ سکتے تھے۔ پی پی پی میں کسی نے بھی اسے قبول نہ کیا۔انٹیلی جنس افسروں کو اس وقت مایوسی ہوئی، جب پی پی پی نے طاقت ور انٹر سروسز انٹیلی جنس کے سربراہ کے طور پر ایک ریٹائرڈ جنرل کو منتخب کر لیا۔ایک ریٹائرڈ جنرل کو ایسی دھمکیاں نہیں دی جاسکتی تھیں، جو بصورت دیگر جی ایچ

کیوکو اطلاعات پہنچا کر حاضر سروس افسروں کو دی جا سکتی ہیں۔

جلد ہی ایک راستہ ڈھونڈ لیا گیا۔ ملٹری انٹیلی جنس کو آرمی چیف کی سرکردگی میں نیا نام دے کر اس کی کارکردگی کو وسیع کر دیا گیا۔ ظاہر ہے نئے نظام نے مزید ترقی کی، جب 1971ء میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کا اقتدار سنبھالا تو آئی ایس آئی کا سربراہ ایک بریگیڈیئر تھا۔ ملٹری انٹیلی جنس کا سربراہ ایک کرنل تھا۔ جلد ہی ایک میجر جنرل کو آئی ایس آئی اور ایک بریگیڈیئر کو ملٹری انٹیلی جنس کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ 1990ء میں جب پی پی پی حکومت کو برطرف کیا گیا تو عبوری وزیر اعظم جتوئی نے انٹیلی جنس کے کام کے لیے ایک پوری کور کی اجازت دے دی۔ اب آئی ایس آئی ایک لیفٹیننٹ جنرل اور ایم آئی ایک میجر جنرل کی سربراہی میں آ گئی ہے۔

زیادہ انتہا پسندانہ کارروائی انٹیلی جنس کا پھیلاؤ تھا۔ ماضی میں انٹیلی جنس ڈویژنوں تک محدود تھی، اب اسے ضلعوں اور تحصیلوں تک پھیلا دیا گیا۔ جلد ہی انٹیلی جنس بڑھنا شروع ہو گئی۔

کور کمانڈروں کے تحت انٹیلی جنس زیادہ وسیع اور زیادہ با اثر ہو گئی۔ فیلڈ انٹیلی جنس یونٹس اور فیلڈ انٹیلی جنس ٹیمیں تشکیل دی گئیں۔ آخر میں تحصیل سطح تک تقریباً سات مختلف انٹیلی جنس ادارے قائم ہو چکے تھے۔

ان سب چیزوں کا مطلب ہے زیادہ تنخواہ، زیادہ انتظامی اخراجات، زیادہ دیکھ بھال اور زیادہ اثر و رسوخ۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ اب انٹیلی جنس مسلح افواج کی سوچ پر چھائی ہوئی ہے اور افواج کے واسطے سے ملک کے بیشتر حصوں پر بھی چھائی ہوئی ہے۔

1990ء میں انٹیلی جنس نے نواز شریف کی پہلی حکومت کی پشت پناہی کی۔ تاہم نواز شریف اور انٹیلی جنس کے درمیان جھگڑا پیدا ہو گیا کیونکہ نواز شریف نے انٹیلی جنس کے پرنس جنرل حمید گل کو چیف آف آرمی سٹاف بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ نواز کو اپنی پہلی حکومت کے نقصان کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرنا پڑی۔

اس بدقسمت دن کے بعد سے ضیاء کے خوابوں کے مطابق انٹیلی جنس ماضی کی نسبت زیادہ پھیلی، مگر وہ ایک نئے سیاسی لیڈر کی تلاش میں رہی۔ اُن کا خیال تھا کہ صدر لغاری کی صورت میں انہوں نے یہ لیڈر تلاش کر لیا ہے۔ بہر حال وہ آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے، اُن کا تعلق ایک ایسے قبیلے سے تھا، جو بلوچستان، پنجاب اور سندھ کی مشترکہ سرحد پر آباد ہے اور اسلامی بھائی چارے کے مرکز اچھرہ سے اُن کے تعلقات تھے۔ وہ مذہبی تنظیم ''تبلیغی جماعت'' کے اجلاسوں میں شرکت کرتے تھے، آسانی سے بات ماننے والے اور تعاون کرنے پر تیار تھے۔

تاہم جب لغاری نے 1997ء کے انتخابات ملتوی کرنے کے متعلق ضمیر کی خلش محسوس کی، تو اُن کی روشنی مدھم ہونا شروع ہوگئی۔ تنقید سے پریشان ہوکر کہ وہ جنرل ضیاء ہی کا ایک اور روپ، یعنی فاروق الحق ہیں، لغاری نے انتخابات کے انعقاد پر اصرار کر کے اپنی قسمت پر مہر لگا دی۔ انٹیلی جنس کے ساتھ کسی کو بھی تکرار نہیں کرنی چاہیے۔ وہ جو کہیں، کرنا پڑتا ہے...... یا پھر اس کی قیمت دینا پڑتی ہے۔

نواز شریف نادم اور اصلاح کے لیے تیار تھے اور اپوزیشن پاکستان پیپلز پارٹی انتخابات کا بائیکاٹ کرنے سے انکار کر چکی تھی، چنانچہ اُمید کا چوغہ ایک بار پھر نواز شریف کو پہنا دیا گیا۔ تاہم نواز شریف نے انٹیلی جنس پر کبھی اعتبار نہ کیا اور اپنی بنیاد بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ ایسا کرنے سے وہ انٹیلی جنس کی حمایت کھو بیٹھے اور پھر اپنے آپ کو عہدے سے معزول پایا۔

اگست میں جن نئے وزیروں نے حلف اُٹھایا، سب کے انٹیلی جنس سے رابطے تھے۔ ڈاکٹر عطیہ عنایت اللہ، جو ویسے تو ایک اچھی خاتون ہیں، جنرل ضیاء کے ساتھ کام کر چکی ہیں اور اُن کے طریق کار سے واقف ہیں۔ ڈاکٹر غازی، یہ بھی ایک اچھے شخص ہیں اور ضیاء دور کے ساتھ وابستہ رہنے کی وجہ سے اُن پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ جنرل جاوید قاضی خود آئی ایس آئی کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ کرنل ٹریسلر بھی ضیاء دور کی یادگار ہیں اور اُس دور میں فارن سروس میں کام کر چکے ہیں۔

اگر کابینہ میں انٹیلی جنس کا غلبہ ہے تو سفیروں کی تعیناتی میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ خلیج کے ایک ملک کے سفیر جنرل اسد درانی بھی آئی ایس آئی کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ منظر بھی آئی ایس آئی سے وابستہ ہے، اور دوسرے کئی سفیروں کی طرح وہ آئی ایس آئی انٹرنل کے سربراہ تھے۔

اقتدار کے ایوانوں میں ضیاء کی روح مسلسل گونج پیدا کر رہی ہے کہ اب مشرف کی باری ہے۔ مگر یہ تعاون مشکل نظر آتا ہے کہ ایک طرف جہاد کرنے والی روح ہے اور دوسری طرف ایک ایسا جرنیل جو ترک مصلح اتاترک کے خواب دیکھتا ہے۔

پاکستانی اتاترک کے اردگرد جمع ہونے والے لوگ، جو انہیں صحیح راستے پر چلانے والے ہیں، بھی ضیاء کے پسندیدہ ہیں۔ ضیاء کے وزیر قانون شریف الدین پیرزادہ واپس آ گئے ہیں۔ ضیاء کے اٹارنی جنرل عزیز منشی بھی اٹارنی جنرل کے طور پر واپس آ گئے ہیں۔ ایک کیپٹن نے ایک چیف جسٹس کو گھر بھیجا تا کہ نیا چیف جسٹس آ سکے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ضیاء کا لاء سیکرٹری اب نیا چیف جسٹس ہے۔ وہ ایک ذہین شخص ہیں اور ملک میں انہیں پسند کیا جاتا ہے۔

صوبہ سرحد، جہاں بہت سے مدرسے ہیں اور جس کی سرحدیں افغانستان سے ملتی ہیں، میں

ایک آئی ایس آئی کے افسر کو گورنر مقرر کیا گیا ہے تا کہ وہاں معاملات ٹھیک طور پر چلتے رہیں۔ وہ کوہاٹ کے رہنے والے ایک مقبول جنرل افتخار ہیں۔

نواز شریف کے پرانے قریبی ساتھی اور آئی ایس آئی کے ایک اور سربراہ جنرل جاوید ناصر اب مالی منفعت والے پراپرٹی ٹرسٹ کے سربراہ ہیں۔ اگر محتاط رہ کر کام کیا گیا تو اس سے ملکی سرگرمیوں کے لیے بڑی بڑی رقمیں مل سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جنرل مشرف نے انہیں پاکستان میں سکھوں کے متبرک مقامات کی دیکھ بھال کے لیے بھی کہا ہے۔ جو کوئی بھی یہ سوچتا ہے کہ خدا سے ڈرنے والے جنرل جاوید ناصر پاکستان اور بھارت کی سرحد کو گرم کرنے کے لیے سکھوں کو استعمال کر سکتے ہیں، وہ ایک غدار ہے اور بھارت کی ''را'' کے لیے کام کرتا ہے۔

دیگر انٹیلی جنس افسر بھی کلیدی عہدوں تک پہنچے ہیں۔ 10 کور کے کور کمانڈر جنرل گل فراز آئی ایس آئی میں اپنی من مانی کرتے ہیں۔ چیف آف جنرل سٹاف کی دوہری ساکھ ہے۔ وہ جنرل ضیاء کے سٹاف آفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے چکے ہیں اور آئی ایس آئی میں بھی کام کر چکے ہیں۔ چیف آف سٹاف جنرل غلام احمد، جو جنرل مشرف تک رسائی کا ذریعہ ہیں، کا پس منظر بھی انٹیلی جنس ہے۔

ضیاء دور کے تجربہ کار لوگوں کو دوبارہ رکھا گیا ہے اور کچھ کو دل کش تنخواہیں دی گئی ہیں۔ ایک صاحب حکومت میں تمام تقرریوں اور تبادلوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ انٹیلی جنس کے بعض دیگر افسر قومی احتساب بیورو، یا آئی ایس آئی کے تحقیقاتی سیل میں کام کرتے ہیں۔ وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کسے پکڑا جائے اور کسے چھوڑ دیا جائے۔

اگر سویلین بیوروکریسی آئی ایس آئی کے افسروں کی امداد کی ضرورت محسوس کرے تو مزید انٹیلی جنس افسر مل سکتے ہیں۔ سندھ کے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات، جنہیں سابق وزیراعظم کی شریک حیات کی نگرانی کا مشکل کام دیا گیا ہے، بھی آئی ایس آئی کے ایک افسر ہیں۔ دیگر بہت سے لوگ ہیں، جو پولیس، انتظامیہ اور مانیٹرنگ کے عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔

اگر کوئی یہ خیال کرے کہ آئی ایس آئی کے یہ تمام لوگ ضیاء کے حمایتی جرنیلوں کے وفادار ہیں جنہوں نے افغان جنگ لڑی تھی اور اب یہ غیر اعلانیہ بادشاہ گر پارٹی بن گئے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ''غدار'' ہے اور ''غیر ملکی آقاؤں'' کا تنخواہ دار ہے۔

1988ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی کامیابی کو سانحہ سمجھنے والے ضیاء کے حامی آئی ایس آئی افسروں نے ایک بار پھر کمان سنبھالی ہے۔ ایک بار پھر مارشل لاء لگ گیا ہے۔ وہ کوئی بھی ضابطہ

بدل سکتے ہیں، جس سے اُن کو مشکل پیش آئے۔ وہ پھر ایک اور سیاسی پارٹی تشکیل دے سکتے ہیں اور ایک اور ''نواز شریف'' تلاش کر سکتے ہیں۔ اقتدار حاصل کر لینا حکمرانی کا صرف ایک رُخ ہے۔ اقتدار کو نبھانا ایک دوسرا پہلو ہے۔

بہت سے لوگ جو افغان جہاد میں شریک تھے، اُن کے لیے اقتدار کو نبھانا ایک مقدس فریضہ ہے۔ اُن کے نزدیک ایک مسلمان لیڈر کو اقتدار میں ہونا چاہیے اور باقی سب اُس کے وفادار ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ جہاد اقتصادی پابندیوں سے مقدم ہے۔ پچھلی بار ضیاء کے حامی انٹیلی جنس افسروں نے افغانستان میں کافروں کے خلاف جہاد کیا اور اس کا خرچہ انکل سام نے اُٹھایا۔

اب سوال یہ ہے کہ اب خرچہ کون برداشت کرے گا؟ اگر ایسا نہ ہوا تو کیا عوام مطمئن رہیں گے، یا وہ اُٹھ کھڑے ہوں گے جیسا کہ وہ ماضی میں فوجی مداخلتوں کے خلاف کرتے رہے ہیں۔

اس سوال کے جواب پر ضیاء کے حامی افسروں کی قسمت اور مستقبل کا انحصار ہے، جنہوں نے جہاد کے تصور کو دل کش بنا دیا ہے۔ انہوں نے ضیاء کے بعد کی دہائی میں پاکستان میں دو جماعتی نظام کو ختم کر کے آدھی جنگ جیت لی ہے۔ انہوں نے یہ جنگ جیت تو لی، مگر اس کی قیمت پاکستان میں جمہوریت، معیشت اور حکمرانی کے زوال کی صورت میں ادا کرنا پڑی، مگر انہیں ابھی آدھی جنگ اور جیتنا ہوگی۔

پاکستان کی سیاسی صورت حال

12 اکتوبر 1999ء کو پاکستان میں فوج نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ جب کہ چیف آف آرمی سٹاف کو چیف ایگزیکٹو بنا دیا گیا۔ وزیراعظم نواز شریف کی اقتدار سے رُخصتی کا مختلف سیاسی گروپوں نے خیر مقدم کیا۔ لیکن یہ سیاسی حمایت اس وقت ختم ہونا شروع ہوگئی، جب لوگوں نے دیکھا کہ قیادت میں تبدیلی کے باوجود پالیسی میں کوئی تبدیلی دیکھنے میں نہیں آرہی۔ عرب ممالک کے کئی دوروں کے باوجود خاطر خواہ سیاسی اور اقتصادی حمایت حاصل نہ ہوسکی۔ مغربی ممالک کے ساتھ باہمی تعامل بھی ثمر آور ثابت نہ ہوا۔ بنیادی مسائل جوں کے توں رہے۔ ان مسائل میں کئی ایک یہ ہیں:

1- اسامہ بن لادن کی گرفتاری: جنرل مشرف کے دورہ افغانستان اور ملاّ عمر کے ساتھ بات چیت کے وعدوں کے باوجود ابھی تک اعلیٰ سطح کے مذاکرات شروع نہ ہو سکے۔

2- بھارت کے ساتھ امن مذاکرات: پاکستان کی طرف سے بھارت کے ساتھ کسی بھی جگہ پر کسی بھی وقت مذاکرات کی پیش کش کے بعد اگر چہ مذاکرات کا سلسلہ جاری ہے لیکن ابھی تک ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ بھارت ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ بھارت کارگل مہم کا ذمہ دار جنرل مشرف کو ٹھہراتا ہے۔ اس لیے بھارت جنرل پرویز مشرف کے ساتھ مذاکرات کے لیے تیار نہیں ہے۔

3- مغرب جمہوری اور فوجی حکومت کے دور میں ہونے والے بین الاقوامی معاہدات کے حوالے سے شفافیت میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ان کی کمپنیاں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو

رہی ہیں۔ جب کہ ان کی حکومتیں کاروبار کو وسعت دینا چاہتی ہیں۔ موجودہ حکومت فوجی آلات کی خریداری میں کک بیکس میں ملوث فوج کے اعلیٰ عہدیداران کو ابھی تک گرفتار کرنے میں ناکام رہی ہے۔ علاوہ ازیں یہ حکومت بجلی پیدا کرنے والی نجی کمپنیوں کے بنیادی سیاسی مسائل کو حل کرنے میں بھی ناکام رہی ہے۔

4- اگرچہ موجودہ فوجی حکومت نے اس سال کے آخر تک سی ٹی بی ٹی یعنی ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی کے جامع سمجھوتے پر دستخط کرنے کا اعلان کیا ہے لیکن جب تک اس معاہدے پر دستخط نہیں کر دیئے جاتے اس وقت تک مغرب کی طرف سے سیاسی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔

5- مغرب، جو جمہوریت کی بحالی چاہتا ہے، نے جمہوریت کی بحالی کے قطعی پروگرام کا مطالبہ کیا ہے۔ اس حوالے سے فوجی جرنیلوں نے دو طرح سے ردِّعمل ظاہر کیا ہے:

اوّل: لوکل باڈیز کے انتخابات کا اعلان، اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ لوکل باڈیز کے الیکشن عموماً انتخابات کا متبادل نہیں ہو سکتے۔

دوسرا: ردِّعمل سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے۔ جس میں سپریم کورٹ نے موجودہ حکومت کو تین سال کے اندر اندر انتخابات کروانے کا ٹائم فریم دیا ہے۔

فوج سے وفاداری کے حوالے سے ججوں سے جو نیا حلف لیا گیا ہے۔ اس سے امریکہ اور برطانیہ نے اپنے سرکاری بیان میں عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ داخلی طور پر موجودہ حکومت کم اہمیت کے حامل گروپوں کی سیاسی حمایت پر انحصار کر رہی ہے۔ ان میں اصغر خان کی تحریک استقلال، عمران خان کی تحریک انصاف اور فاروق لغاری کی ملت پارٹی شامل ہیں۔ صاف ستھرے سیاست دانوں کے ساتھ ملاقات کا مقصد بڑی سیاسی جماعتوں کے حصوں کو علیحدہ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس سے حکومت، جو آزاد خیالی اور حریت پسندی کے دعوے کرتی ہے اور خفیہ مذہبی اداروں کے مابین تفاوت اُبھرتا نظر آتا ہے۔ دونوں کے مابین یہ بُعد آزاد خیالی (لبرل ازم) کے ان وعدوں سے ظاہر ہوتا ہے، جن پر پسپائی اختیار کی گئی۔ ان میں پیپلز پارٹی کے خلاف شروع کی گئی الزام تراشی، جس پر کسی صورت میں یقین نہیں کیا جا سکتا، نااہل احتساب بیورو، سیاسی ایجنڈے کا فقدان اور جمہوریت کی بحالی کے ٹائم شیڈول میں ناکامی، تحفظ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور غیرت کے نام پر قتل کے قانون میں ترمیم پر پسپائی اور ریاست کی نظروں سے دور انتہا پسندوں کے ان اداروں پر چھاپے مارنے میں ناکامی جنہیں باہر سے امداد ملتی ہے اور وہ اپنے آدمیوں کو تربیت

دے کر مسلح کرتے ہیں۔ دورُخی پالیسی کی وجہ سے غیر یقینی کی فضا پیدا ہوئی ہے۔ ناتجربہ کار ٹیم اخلاقی قدروں کے نظام کے ساتھ کمٹمنٹ کے بجائے اختیارات اور قوت کے حصول میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ موجودہ حکومت کے تسلسل کی بنیاد دو وعدوں پر ہے:

1- کرپشن کا خاتمہ

2- معیشت کی بحالی

احتساب بیورو میں اس قدر رجان نہیں ہے کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کے طاقت ور افسروں کے خلاف کارروائی کرے گا۔ اور جہاں تک معیشت کا تعلق ہے بجلی پیدا کرنے والی نجی کمپنیوں کے جاری تنازعات، جمہوری سوچ اور جمہوری رویوں کے فقدان کی وجہ سے موجودہ حکومت (جو اچھی حکومت کا دعویٰ کرتی ہے) اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے مابین کشمکش جاری نظر آتی ہے۔

آخر کار معیشت نے ہی قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہے اور موجودہ حکومت کا فیصلہ بھی معیشت ہی کرے گی۔ ٹیکس چوروں کے خلاف کریک ڈاؤن اور تاجروں کی ہڑتال سے جس انداز میں نمٹا گیا، قحط زدگان کو نظر انداز کرنے، پانی کی کمی پر تاخیر سے ردِّعمل ظاہر کرنے، متنازع کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے منصوبے کا پھر سے اعلان کرنے اور بڑے پیمانے پر ملازمین کی چھانٹی سے بے چینی پھیلے گی۔ خزانے کی کیفیت یہ ہے کہ وہ قرضے جو ہم نے سرما تک ادا کرنے ہیں، وہ ہم ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے ساری صورتِ حال پیچیدہ ہوگئی ہے۔ یہ وقت ہے کہ حکومت سیاسی طور پر غیر اہم حلقوں کی طرف سے سسٹم کو خراب کرنے کی سوچ کو رد کر دے۔ بلکہ یہ وقت ہے کہ بڑی سیاسی جماعتوں اور اُن کے حلیفوں کے ساتھ جمہوری عمل اور جمہوریت کی بحالی اور فوجی حکومت کے خاتمے کی حکمتِ عملی پر مذاکرات شروع کئے جائیں۔

جمہوری عمل کو نومبر 1996ء میں پٹڑی سے اُتارا گیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک کرپشن اور احتساب کے نعروں نے معیشت کی تنزلی اور ملازمین کی چھانٹی کو جنم دیا ہے۔ اگر جمہوریت کو چار سال قبل جڑ سے اکھاڑ پھینکا نہ گیا ہوتا تو ملک ترقی کر چکا ہوتا۔

درحقیقت بتدریج تنزلی اس بات کا ثبوت ہے کہ غیر اہم سیاسی گروپ جو انتہائی منظّم ہیں، وہ ذاتی تباہی کی سیاست کے ذریعے حکومتوں کو اقتدار سے باہر لا پھینکتے ہیں۔ لیکن خود سے حکومت نہیں کر سکتے، کیونکہ اس حوالے سے کسی بھی پروگرام کے لیے سیاسی حمایت اور سیاسی جواز ضروری ہوتا ہے۔

آگرہ کانفرنس، کیا کھویا کیا پایا؟

بہت سی توقعات اور بہت سے اظہارِ محبت کے بعد نام نہاد ''تاریخی کانفرنس'' اختتام پذیر ہوگئی۔ جنرل پرویز مشرف کے مینڈیٹ کے بغیر دورہ آگرہ پر جانے کے عمل کو ہدفِ تنقید بنانے والوں کو بھی اُمید تھی کہ ایک مشترکہ اقرار نامے کا اعلان کیا جائے گا، لیکن وہاں ایک مشترکہ بیان تک جاری نہ ہوسکا۔

بھارت میں موجود کچھ افراد فوج سے مغلوب ہوجانے پر پاکستانی سیاست دانوں کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اب فوج کے ساتھ معاملات کرلینا ہی بہتر ہے۔ اُنہوں نے خود اعتراف کرنے والے بے اختیار آرمی چیف کو سانچے میں ڈھال لیا ہے، جس نے دعویٰ کیا کہ اگر اُنہوں نے ڈیکلریشن پر دستخط ہی کرنے ہیں تو بہتر ہے کہ وہ بھارت میں اپنی پرانی نہر والی حویلی میں رہائش اختیار کرلیں۔ سویلین قیادت نے شملہ، اسلام آباد اور لاہور کے معاہدوں پر دستخط کیے۔ یہ سب کے سب معاہدے قابلِ تعظیم ہیں۔

ڈپلومیسی امکان پذیر ہونے کا فن ہے۔ سیاسی لیڈر لینے اور دینے کے فن میں ماہر ہوتے ہیں۔ جنرل مشرف ایک فوجی آمر ہیں۔ جب وہ بات کرتے ہیں تو دوسرے فوراً اُن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ غیر منتخب فرمانبرداروں میں گھرے جنرل مشرف اچھے ارادوں کے اعلان کے باوجود ہر بڑے امتحان میں الجھن کا شکار ہوجاتے رہے ہیں، جیسا کہ انتخابات کے لیے تاریخ کا اعلان، لوگوں کو سیاسی طور پر قربانی کا بکرا بنانا، معیشت کی بحالی اور اب خارجہ پالیسی۔

یہ بات بڑی تعجب خیز تھی کہ جب بھی بھارتی کوئی ایسا تقاضا کرتے جس سے کسی وعدے کے

حقیقی ہونے کا ثبوت ملتا تو بچگانہ حد تک دادا گیری کا مظاہرہ کیا جاتا رہا۔ وقت ہمیشہ کم پڑ جاتا اور پھر اس میں اضافہ کیا جاتا رہا۔ سب سے پہلے ناشتہ پر پریس کے آدمیوں سے بات چیت ہوئی۔ پھر مذاکرات کے ختم ہونے میں دیر لگی۔ اجمیر شریف کا دورہ بھی منسوخ کرنا پڑا۔ اسلام آباد اس وقت برہم ہوگیا جب بھارتی ذرائع نے یہ بھید ظاہر کر دیا کہ مذاکرات اگلے روز بھی جاری رہ سکتے ہیں۔ کانفرنس کے لیے دستاویز کی تیاری مکمل نہ ہوسکی۔ حتیٰ کہ خوراک میں مزاج خوشگوار بنانے کے لیے استعمال ہونے والی خصوصی جڑی بوٹیوں کے بارے میں قدیمی علم بھی کسی کام نہ آسکا۔

دورے میں جنرل پرویز مشرف نے بڑی بڑی غلطیاں کیں۔ وہ جائز سیاسی طاقتوں کا اندرونی اتفاق رائے قائم کرنے میں ناکام رہے۔ وہ پاکستان کی انتہا پسند پارٹیوں کے آسرے پر بھارت گئے۔ ان پارٹیوں کے افراد دورے سے پہلے اُن کے ساتھ پوز بناتے رہے تھے۔ انہوں نے ایک نااہل ٹیم پر انحصار کیا۔ یہ ٹیم انہیں پہلے بھی ناکام کر چکی ہے۔ انہیں اچھا مشورہ دیا گیا ہوتا تو وہ مزید ایک روز وہاں قیام کرتے اور بھارت کے صبر کا اپنے تحمل کے ساتھ موازنہ کرتے۔ دوسرے کو تھکا دینا ایک ابتدائی ڈپلومیٹک حربہ ہے۔ اس کے برعکس وہ طیش میں آکر خود واپس چلے آئے۔

اسلام آباد والے واضح طور پر ایک اقرار نامے کی خواہش کررہے تھے اور نئی دلّی والے اُن کی اس خواہش سے واقف تھے۔ اس کا انکشاف وفد میں شامل ایک رُکن نے ''گلف نیوز'' سے بات چیت کرتے ہوئے کیا۔ اُس نے بتایا ''میں جسونت سنگھ کے پاس گیا اور انہیں کہا کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں لکھ سکتے ہیں، ہم تسلیم کر لیں گے۔'' یہ بات غیر معمولی ہے۔ یہ بات باعث حیرت نہیں ہے کہ وزیر خارجہ جسونت سنگھ مذاکرات کے لیے ایک مزید دن چاہتے تھے تاکہ وہ اپنی خواہشات، یا تقاضوں پر مبنی فہرست پیش کرسکیں۔ یہ ایک کیس سٹڈی بھی ہے کہ کیوں جرنیلوں کو سرحدوں کی دیکھ بھال کرنی چاہیئے اور سیاست دانوں کو ڈپلومیسی کے ذریعے معاملات حل کرنے دینا چاہیئے۔

پاکستان کی سوچ کے مطابق کشمیر مرکزی معاملہ تھا جب کہ بھارت والوں کی سوچ کچھ اور تھی۔ دورے کا مقصد خلیج کو کم کرنا تھا۔ اس کانفرنس سے اگر کوئی چیز حاصل ہوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ مشرف نے نئی دلّی کو موقع فراہم کیا ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کے موقف کا اپنے ''سرحد پار دہشت گردی'' کے موقف کے ساتھ موازنہ کرسکے۔ 1993ء میں بھارتی سفارت کار ڈکشٹ نے سائپرس میں ہونے والی دولت مشترکہ کی کانفرنس میں پاکستان کو پیش کش کی تھی کہ کشمیر کو ایک علیحدہ ایجنڈا کے طور پر لیا جائے۔ تب سے بھارت کشمیر کو بنیادی مسئلے کے طور پر تسلیم کرنے پر

رضا مند رہا ہے، لیکن اس جھگڑے کا مطلب پاکستان کے نقطۂ نظر سے مختلف تھا۔ پاکستان میں حکومتوں اور دفترِ خارجہ کے مستقل نہ رہنے کی وجہ سے یہ اہم پیش رفت نظر انداز ہوتی رہی ہے۔

مسودۂ بیان میں لفظوں پر توجہ مرکوز کر دینے سے بڑی تصویر پر سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ ڈپلومیٹ عام طور پر یہ جوڑ توڑ زیادہ کامیابی کے ساتھ کر لیتے ہیں۔ یہ تصویر جوہری قابلیت کی حامل دو ریاستوں کے درمیان کشیدہ صورت حال ہے۔ جب کہ دونوں ریاستیں تین جنگیں بھی لڑ چکی ہیں اور متنازعہ وادی کشمیر میں لائن آف کنٹرول پر تشویشناک صورتِ حال اب بھی جاری ہے۔ اضطراب کی شکار عالمی برادری نے دونوں لیڈروں کو مجبور کیا کہ وہ مذاکرات کی میز پر آئیں تاکہ جنوبی ایشیا میں تناؤ کم کیا جا سکے۔

کچھ لوگوں نے یہ قیاس کیا کہ شیروانی میں ملبوس جنرل مشرف امن قائم کرنے والے فرد کے طور پر اُبھرے ہیں لیکن اُن کا ماضی اور فوج پر اُن کا انحصار کرنا اُن کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا۔ اُن کے پاس مینڈیٹ نہیں تھا اور وہ اپنی قوم کے سب سے اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے خواہش مند تھے۔ اُن کے کندھوں پر کارگل آپریشن کے دوران ہونے والے 3 ہزار سپاہیوں کی ہلاکت کا بھاری بوجھ بھی ہے۔ جہاں تک اُن کے ایجنڈے، عزائم، فوج، امریکہ اور افغانستان کا تعلق ہے تو مشرف نے اپنے کارڈ اچھے طریقے سے کھیلے ہیں۔ سوائے اس کے کہ رات گئے وہ واپس لوٹ آئے۔

بھیس بدلنا کمانڈو کی دوسری فطرت ہوتی ہے اور اس کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ اُنہوں نے شیروانی میں وہاں لینڈ کیا۔ اس طرح انہوں نے اس فوجی کو چھپا لیا، جس نے ذاتی طور پر دو محاذوں پر بھارت کے خلاف لڑائی لڑی۔ جلد ہی شیروانی کی جگہ چھوٹی آستینوں والے غیر رسمی لباس نے لے لی۔ پیغام یہ تھا کہ ''میں اپنے گھر پر ہوں اور آرام دہ حالت میں ہوں، آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔''

بھارتی صدر نے بھی یہی کچھ کہا۔ اپنی تقریر میں انہوں نے جنرل مشرف کو ''بھارت کے ممتاز و معتبر سپوتوں میں سے ایک قرار دیا، جو نصف صدی کے بعد اپنے شہر کے پہلے دورے پر آیا۔'' یہ خیالات تبدیل کرنے کا ایک حیرت انگیز عمل تھا۔ وہ آدمی جس کے کارگل آپریشن کی وجہ سے بہت سے بھارتی سپاہیوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا، اس وقت معزز و ممتاز سپوت کے طور پر قبول کر لیا گیا جب کہ اُس نے لچک دار ہونے پر رضامندی کا اشارہ دیا۔

موقع ملنے پر جنرل مشرف نے آل پارٹیز حریت کانفرنس کے لیڈروں سے ملاقات کی۔ یہ اظہار یک جہتی تھا۔ اُنہوں نے بھارتی وزیراعظم کی بھی تعریف کی۔ اُن کے لیے عزت و احترام

ظاہر کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ وہ آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ جنرل مشرف نے اُس وقت تک نمائشی انداز اختیار کیا جب تک کہ رات کے وقت اُن کا تحمل جواب نہ دے گیا۔ اُنھوں نے کانفرنس کے دوران عالمی توجہ اور نیک خواہی حاصل کی۔ اُنھوں نے صدارت پر قبضہ جمانے، استبدادانہ طاقتوں کو نیشنل سکیورٹی کونسل کے ماتحت کرنے، آئی ایم ایف سے قرضے کی ایک اور قسط حاصل کرنے اور مخالفین کو شکار بنانے کے لیے بھی اسی نیک خواہی کا استعمال کیا تھا۔ نئی دلّی میں انھوں نے بھارتی وزیراعظم کو پاکستان کے دورے کی دعوت دی، جو قبول کر لی گئی۔ ایک اور کانفرنس کے وعدے سے بھی اُن کو اپنی کوششوں میں مدد ملے گی۔

اکتوبر 2002ء تک ملک کے اندر کوئی سیاسی خاکہ تشکیل دینے کے لیے تربیت دی جارہی ہے۔ اہمیت کی حامل اس کانفرنس کے ذریعے پاکستان میں ڈوبتی ہوئی معیشت اور اُبھرتی ہوئی طالبانائزیشن پر سے توجہ ہٹا دی گئی ہے۔ بھارتی دفتر خارجہ اچھی منصوبہ بندی کرتا ہے لیکن مشرف نے انہیں اپنی گیم کے ذریعے مات دے دی۔ سوائے آخری لمحات کے، جب وہ جلدی میں واپس آ گئے تھے۔ دن میں کئی مرتبہ لباس تبدیل کر کے انھوں نے پریس کو نامناسب تبصرے کرنے کا موقع دیا۔ دراصل وہ خود کو ایک گھل مل جانے والا اور سادہ سپاہی ظاہر کررہے تھے۔ لیکن اس کانفرنس نے 14 کروڑ پاکستانیوں پر حکمرانی کرنے والے جنرل کے پس منظر اور اُن کی شخصیت میں پائی جانے والی تباہ کن خامیوں کو آشکار کر دیا ہے۔ مثلاً اُن کا جلد بازی میں آدھی رات کے وقت اسلام آباد واپس آنا، اس کے علاوہ پاکستان اور بھارت دونوں کے کئی زخم ہرے ہو گئے ہیں۔ تینوں مسلح افواج کی نمائندگی کرنے والے بھارتی ایئر چیف نے انہیں سلیوٹ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جنرل مشرف نے بھی واجپائی کے دورہ لاہور کے موقع پر انہیں سلیوٹ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح بھارتی ایئر چیف نے اُن کا بدلہ چکا دیا۔

پاکستان میں کارگل آپریشن کے دوران مرنے والے افراد کی روحیں جنرل مشرف کو دیکھتی رہیں۔ 1971ء میں سقوط ڈھاکہ کے بعد پاکستان کے لیے یہ سب سے بڑی پسپائی تھی۔ فاتح ہونے کی حیثیت سے بھارت نے چوٹیوں پر قبضہ کرلیا۔ یک طرفہ پسپائی ذلت آمیز تھی۔

جنرل مشرف نے آگرہ میں چائے پی، کیک کھائے اور تاج محل کے سامنے کھڑے ہو کر تصویریں اُتروائیں۔ اب واجپائی اسلام آباد جائیں گے، چائے پئیں گے، کیک کھائیں گے اور قائداعظم کے مزار کے سامنے تصویریں اُتروائیں گے۔ ان چائے پارٹیوں کے باوجود خون رنگ وادی کشمیر میں عورتیں اور مرد ہلاک کیے جارہے ہیں۔ تو پھر اس سارے عمل کے فائدے اور

نقصانات کیا ہیں؟ جوہری طاقت کی حامل دو ریاستوں کے رہنماؤں نے گہری خاموشی توڑ دی ہے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کا اندازہ لگا لیا ہے۔ اُنہوں نے پھر ملنے کا وعدہ کیا ہے لیکن اس کے لیے ہمیں بھاری قیمت چکانا پڑی ہے۔ دو جنگ بندیاں ختم کر دی گئی ہیں۔ ایک جنگ بندی پاکستان نے کی تھی جب کہ دوسری جنگ بندی بھارت نے کی تھی۔ اس دوران بھی جب مشرف ایک بڑے صدارتی عشائیے میں یہ کہہ رہے تھے کہ فوجی حل بطور آپشن اُن کے سامنے نہیں ہے، ایک نئے جھگڑے میں 80 سے زیادہ افراد اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ گولیوں کی آواز کبھی نہیں رُکی۔

کانفرنس کی ناکامی نے پاکستانی سیاست دانوں کی طرف سے جمہوریت کی بحالی کے لیے دی جانے والی کال کو ایک نئی قوت بخشی ہے تا کہ نمائندہ حکومتیں ڈپلومیسی کے ساتھ معاملات طے کر سکیں۔ کانفرنس نے مؤثر طور پر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ سیاست دان معاہدے بھی کر سکتے ہیں لیکن جرنیلوں کے لیے مشترکہ اعلامیے حاصل کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ

غیر سرکاری طور پر حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی اشاعت سے پاکستان میں ایک زبردست بحث شروع ہوچکی ہے۔ اس رپورٹ میں 1971ء میں پاکستانی مسلح افواج کے ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالنے اور نتیجتاً بنگلہ دیش کی تخلیق کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ڈھاکہ کے ریس کورس میں ہتھیار ڈالے جانے کی ویڈیو اور فلم کلپس ابھی تک عام پاکستانیوں نے نہیں دیکھیں کیونکہ انہیں نشر کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا تھا۔ یہیں سے انکار کی سیاست کی طرح پڑی۔

1971ء کی شکست کے وقت حالات یہ تھے کہ فوج کی حکمرانی تھی اور ملک عالمی سطح پر الگ تھلگ تھا۔ کمیونسٹ چین کے ساتھ تعلقات کی بنا پر پاکستان نے اپنی سٹرٹیجک اہمیت کا غلط اندازہ لگایا اور سمجھا کہ چین اسے بچالے گا۔ امریکہ اور چین کے درمیان مفاہمت کے لیے ڈکٹیٹر جنرل یحییٰ خان اہم کردار ادا کررہا تھا، لیکن اس کے باوجود ڈھاکہ میں ڈھائے گئے ظلم کی داستانوں کے باعث دنیا نے پاکستان کے ساتھ سردمہری روا رکھی۔

اپنے ملک کے دوسرے لوگوں کی طرح ایک طالب علم کے طور پر میں بھی قتل عام کی ان باتوں کو ''بھارتی پراپیگنڈہ'' سمجھتی تھی۔ جرنیلوں کے طرزِ عمل کو نشانہ تنقید بنائے جانے پر میں کالج میں اپنے ساتھی طالب علموں اور پروفیسروں کے ساتھ لڑ پڑتی تھی۔ ہمارے خیال میں اس سب کے پیچھے بھارت تھا کیونکہ ہماری مسلح افواج اس درجہ بربریت اور بہیمیت کا مظاہرہ نہیں کرسکتی تھیں۔ مجھے اس وقت کوئی خاص احساس نہیں ہوا کہ یہ نسلی امتیاز تھا، جب طلباء کو یہ پڑھایا جاتا کہ ''مغربی پاکستان کے لوگ لمبے اور گورے ہیں اور گندم کھاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے لوگ پستہ قد اور کالے ہیں اور

چاول کھاتے ہیں۔'' ہماری علیحدگی کا بیج ہمارے تعلیمی نصاب کے ذریعے بودیا گیا تھا۔

اس وقت ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالنے والے جرنیل سقوط ڈھاکہ کے لیے کسی بھی قسم کی ذمہ داری سے انکاری ہیں۔ وہ کسی حد تک ٹھیک ہیں کیونکہ سیاسی طور پر تنہا ہونے کا عمل بہت عرصہ پہلے شروع ہوگیا تھا۔ لیکن اپنے طرزِ عمل کی ذمہ داری سے پہلوتہی کر کے یہ جرنیل جنوبی ایشیا کے اب تک رِستے ہوئے زخموں پر نمک پاشی کررہے ہیں۔ کچھ افسروں کے بھونڈے اور سفاکانہ اقدامات نے بنگالیوں کے لیے اور کوئی چارۂ کار نہیں چھوڑا۔ زنا، لوٹ مار، بزدلی کا مظاہرہ کرنے اور بدعنوانی جیسے الزامات پر اب بھی غور کیا جانا چاہیئے۔ یہ الزامات بین الاقوامی ذرائع ابلاغ اور حقوقِ انسانی کی تنظیموں جیسے دوسرے ذرائع کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں۔

ساری ذمہ داری سیاست دانوں پر دھرنے والے متعلقہ جرنیل ایک بات نظرانداز کردیتے ہیں کہ سیاسی تنہائی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ سیاست دانوں کے بجائے جرنیل اس ملک پر حکمرانی کرتے رہے۔ ان میں جنرل ایوب اور جنرل یحیٰی شامل ہیں، جن کی حکومتوں میں سویلین افراد ایسے ہی غیراہم تھے جس طرح آج جنرل پرویز مشرف کی کابینہ ہے۔ جو اپوزیشن میں ہوتے ہیں وہ تو اور بھی کم اہم سمجھے جاتے ہیں۔ جب ذمہ داری سے پہلوتہی کر کے ہتھیار ڈالنے کو ترجیح دی جائے اور قتلِ عام کی وارداتوں کو نظرانداز کردیا جائے تو اس کا نتیجہ بزدلی ہی ہوسکتا ہے۔

پاکستانی عوام کے لیے مزید دُکھ اور تکلیف کا باعث ہتھیار ڈالنے والوں کی تعداد تھی۔ مسلح افواج میں اَن گنت ایسے لوگ ہیں، جنہوں نے اپنی داستانیں خون سے رقم کیں اور شہید ہوکر امر ہوگئے، لیکن دسمبر کے اس تلخ مہینے میں ڈھاکہ میں موجود فوجیوں کے لیے ایسا نہیں کہا جاسکتا۔

میرے بچپن کے دنوں میں ہمارا گھر وزیرِخارجہ بوگرہ کے گھر کے ساتھ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ بنگالیوں کے ساتھ امتیاز برتے جانے پر بہت سیخ پا ہوا کرتے تھے۔ جب بنگالیوں کو حقارت سے بنگو کہا جاتا تو بڑی بدمزگی ہوتی تھی۔ بلحاظ آبادی اکثریت میں ہونے کے باوجود بنگالیوں کو اکثریتی نمائندگی نہیں دی گئی۔ مغربی پاکستان کی وفاقی اکائیوں کو اکٹھا کر کے دوسرے نسلی گروپوں میں مزید احساسِ محرومی پیدا کردیا گیا۔ سارا سرمایہ ملک کے مغربی حصے میں مرتکز تھا اور مغربی پاکستانیوں کو بینکوں سے قرضے اور کاروباری مواقع دستیاب تھے۔

پچاس کی دہائی میں بنگالی زبان کے مسئلے نے صورتِ حال کو مزید پیچیدہ بنادیا۔ بنگالیوں کے لیے اُردو بولنا مشکل تھا، جس کے باعث انہیں انتظامی مواقع دینے سے محروم رکھا گیا۔ بنگالی رہنما اور وزیرِاعظم سہروردی کو کرپشن کے الزام کے تحت نااہل قرار دیئے جانے سے بنگالی مزید

برافروختہ ہوئے۔ اُنہوں نے اسے عدالتی زیادتی قرار دیا۔ اس کے بعد بھی سیاسی، اقتصادی، سماجی اور عدالتی، غرض ہر قسم کی زیادتیوں اور محرومیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اسلام آباد آج بھی انکار کی روش اختیار کیے ہوئے ہے اور بنگالیوں سے، جو بھی اس کا حصہ تھے، یہ پوچھنے سے بھی گریزاں ہے کہ ہم سے غلطی کیا ہوئی۔ بنگالی کسی غیر مناسب، یا غیر یقینی انداز میں جواب تو نہیں دیں گے۔

کچھ پاکستانیوں کا خیال ہے کہ مارچ 1971ء میں شروع ہونے والے کریک ڈاؤن کے ذریعے علیحدگی کو روکا جاسکتا تھا۔ جنرل ٹکا نے مسلح عام بغاوت کا کامیابی سے سدباب کیا، لیکن اُن کی واپسی کے بعد حالات قابو سے باہر ہوگئے۔ اکتوبر 1971ء میں ذوالفقار علی بھٹو پہلے مغربی پاکستانی لیڈر تھے، جنہوں نے مسئلے کے سیاسی حل پر زور دیا۔ لیکن اُن کے مطالبے کو نظر انداز کر دیا گیا اور دسمبر میں جب ڈھاکہ جل رہا تھا تو بھٹو کو نیویارک جا کر چین کو فوجی، یا سیاسی مداخلت پر آمادہ کرنے کو کہا گیا۔ بھٹو کے وہاں پہنچتے ہی مشرقی کمان نے شکست تسلیم کر لی۔ اگرچہ یہ فیصلہ واپس لے لیا گیا، لیکن پاکستان پر اس کے دوستوں کا اعتماد ختم ہوگیا تھا۔ اقوام متحدہ میں، میں اپنے والد کے ساتھ تھی۔ اُنہوں نے عالمی تنظیم کے رویے پر سخت تنقید کی اور کہا کہ اس موقع پر عدم مداخلت کی پالیسی انتہائی غلط ہے۔ عالمی برادری کی طرف سے ڈھاکہ میں جنگ بندی کے بعد مسئلے کے مذاکراتی حل سے انکار پر اُنہوں نے اپنے نوٹس پھاڑ ڈالے اور احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے۔

جب وہ وزیراعظم بنے تو اُنہوں نے بنگالی رہنما کو پھانسی دیئے جانے کے مطالبے کے باوجود انہیں جیل سے رہا کر دیا۔ بھٹو نے پاکستان کو بچانے کی ایک آخری کوشش کی۔ وہ گفتگو ٹیپ کی گئی تھی اور اسے ملک میں کہیں موجود ہونا چاہیئے۔ مجیب الرحمٰن نے اپنے طور پر کوشش کرنے کا وعدہ کیا، لیکن بعد میں اُنہوں نے پیغام بھیجا کہ اب یہ ناممکن ہے کیونکہ بہت زیادہ خون بہایا جا چکا ہے۔ وزیراعظم مجیب الرحمٰن کی طرف سے جنگی جرائم کے مقدمے چلانے کے مطالبے کی واحد وجہ بھی یہی تھی۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے سیاسی مہارت کے ذریعے بھارت اور بنگلہ دیش کو اس مطالبے سے دستبردار ہونے پر راضی کر لیا۔ اُنہوں نے ایسا جرنیلوں کی نسبت معصوم فوجیوں اور افسروں کو بچانے کی خاطر کیا۔

وزیراعظم بھٹو 90 ہزار جنگی قیدیوں کو عزت اور جنگی جرائم کے ٹریبونلز کا سامنا کرائے بغیر واپس پاکستان لانے میں کامیاب رہے۔ ظلم یہ ہوا کہ جنہیں اُنہوں نے بے عزتی سے بچایا وہی انہیں موت سے بچانے سے انکاری ہوگئے۔ بھٹو انہیں جنگی قیدیوں کے کیمپوں سے واپس لائے اور اُنہوں نے اُن کے خاندان کے تقریباً ہر فرد کو جیل خانوں میں پہنچا دیا۔

انتہائی ظالمانہ انداز میں نجات دہندہ کو ہی تباہی کا باعث قرار دے دیا گیا۔ یہ طرزِ عمل بھی حقائق کو تسلیم نہ کرنے کی سیاست کا اظہار ہے۔ تقریباً تین دہائیوں بعد بھی جرنیل اپنی ذمہ داری اور کردار کو قبول کرنے سے انکاری ہیں۔

بھٹو کو قتل کیے جانے سے چند گھنٹے قبل اُن کی رہائش گاہوں پر ایجنسیوں نے چھاپے مارے اور حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ چھاپے اور تلاشی کے بعد یہ خبر پھیل گئی کہ اس رپورٹ میں ترمیم پر مجبور کیا گیا اور مزاحمت پر بھٹو پر تشدد کیا گیا، جس کے نتیجے میں انہیں شدید زخم آئے۔ انہیں سٹریچر پر مقررہ وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی پھانسی کے تختے پر پہنچا دیا گیا۔

خارجی حالات کے ادراک اور داخلی معروضی عوامل کے محتاط اور عمیق تجزیے کے نتیجے میں خارجی پالیسی کا تعین کیا جاتا ہے۔ ہر قوم عالمی سطح پر مفاد کے حصول کی تلاش میں ہوتی ہے اور صحیح توازن کے حصول کے بعد ہی کوئی بڑا فیصلہ کرتی ہے۔ 1971ء میں یہ متوازن پالیسی موجود نہیں تھی۔

جرنیلوں کا بھارت سے جنگ جیت لینے کا خیال اندازے کی بہت بڑی غلطی تھی جب کہ ہمارے 90 ہزار فوجی ایک ہزار کلومیٹر کی دوری پر تھے۔ انہیں مسئلے کے حل کی طرف دیکھنا چاہیئے تھا۔ اس کے بجائے اُنہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور مداخلت کو دعوت دی۔ اُن کا خیال تھا کہ مشرقی محاذ پر جنگی نقصانات کو مغربی محاذ پر دشمن علاقے فتح کر کے پورا کیا جا سکے گا۔ مشرقی پاکستان کو اقتصادی لحاظ سے کم مفید گردانا جاتا تھا۔ اگر اس وقت واقعی یہ سوچ تھی تو یہ بہت خطرناک بات ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہی کھیل دوبارہ بھی دہرایا جا سکتا ہے اور اس مرتبہ کشمیر میں سٹرٹیجک فائدے کے لیے سندھ اور رحیم یار خان کے علاقوں کو جنگی نقصانات کی نذر کیا جا سکتا ہے۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے میں نے جب بھی جی ایچ کیو کا دورہ کیا، مجھے یہی تاثر ملا۔

سقوط ڈھاکہ کے حادثے کی تاریخ میں کہیں گم ہو جانے کے باوجود وہاں قتل عام کے الزام نے پاکستان کا پیچھا نہیں چھوڑا اور یہ بات ملک کے لیے بہت پریشان کن ہے۔ 1988ء میں میرے وزیر اعظم بننے سے پہلے مجھے بتایا گیا تھا کہ ضیاء دور میں ہونے والی ہلاکتوں کی تفتیش کرائے جانے سے مسلح افواج کا مورال متاثر ہوگا۔ میں نے ماضی کو پیچھے چھوڑ دیا، لیکن ماضی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ سقوط ڈھاکہ کے تھوڑے عرصے بعد بلوچستان میں بغاوت پھیل گئی۔ بلوچ سردار عطاء اللہ مینگل کے بیٹے کو اغوا کرنے کے بعد خفیہ طور پر قتل کر کے ٹھٹھہ میں دفن کر دیا گیا۔ ایک بریگیڈیئر، جسے بعد ازاں جنرل ضیاء کے دور میں ایک سرکاری کارپوریشن کا چیئرمین بنایا گیا تھا، مبینہ طور پر اس واردات کا ذمہ دار تھا۔ اس بغاوت کو دبانے میں مصروف باقی ماندہ فوج کے مورال کو بچانے

کے لیے اس معاملے کی تفتیش نہیں کرائی گئی۔

اَسی کی دہائی میں سندھیوں کی طرف سے بھی قتل عام کے الزام عائد کیے گئے۔ بار ہا پُر امن اور غیر مسلح مظاہرین پر فائرنگ کی گئی۔ 1983ء کے ایک واقعہ میں صغیر نامی ایک بریگیڈیئر نے جنرل ضیاء کے دورے کے دوران احتجاجی مظاہرہ کرنے والوں پر فائرنگ کا حکم دیا، جس میں 275 سندھی ہلاک ہوگئے۔ اب بریگیڈیئر صغیر کو ایک سندھی وزیراعظم کو عدالت کے ذریعے ختم کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔

نوّے کی دہائی میں بہت سے اپوزیشن ارکانِ پارلیمنٹ کو اُٹھالیا گیا اور انہیں وفاداری بدلنے پر مجبور کرنے کے لیے بُری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس قسم کا بہیمانہ سلوک روا رکھے جانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ میں جس سانحہ کے مختلف پہلوؤں سے پردہ اُٹھایا گیا ہے، اس سے ابھی تک سبق نہیں سیکھا گیا۔ ان الزامات کی تحقیقات کے لیے سچائی اور مصالحت کمیشن (Truth and Reconciliation Commission) کے قیام کے لیے آوازیں اُٹھائی جارہی ہیں۔ اگر یہ الزامات ثابت ہوجائیں تو اُن کے ذمہ دار اور مرتکب لوگوں کو اپنی غلطیاں اور زیادتیاں مان کر متاثرین سے معافی مانگنی چاہیئے۔ کچھ دوسرے گروپوں کی طرف سے بھی اسی طرح کے الزامات سامنے آئے ہیں۔

مسلمانوں کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے۔ لیکن اس کے باوجود لوگ اپنی غلطیوں پر پشیمان ہونے اور معافی مانگنے سے جھجکتے ہیں۔ اگر ہم رحم دلی کا مظاہرہ کریں تو شاید پچاس برسوں کے زخم بھرنے میں کافی آسانی ہوگی۔

ان زخموں میں ایک معصوم، بے گناہ وزیراعظم کے قتل کا ایک زخم بھی ہے۔ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بانی اس شخص کو، جس نے ملک کو مزید ٹوٹنے سے بچایا، پھانسی پر لٹکا دیا گیا، حالانکہ سپریم کورٹ کے کبھی ججوں نے متفقہ طور پر جنرل ضیاء سے اس فیصلے کو بدلنے کی استدعا کی تھی۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے منظر عام پر آنے سے بنگلہ دیش میں ہلچل ہوئی ہے، جہاں شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی کی حکومت ہے۔ بنگلہ دیش نے اس رپورٹ کی ایک نقل مانگی ہے اور پاکستان کو سمجھ نہیں آرہی کہ اس مطالبے کا کیا جواب دے۔ لیکن ایک حقیقت واضح ہے جب تک قتل عام کے ملزم اپنے فعل پر ندامت کا اظہار نہیں کرتے اور معافی نہیں مانگتے، جنوبی ایشیا میں ایک بہت بڑا اور اہم مسئلہ زندہ رہے گا۔ جنوبی ایشیا یقیناً بہتری کا مستحق ہے۔

عدالتی بُحران

قانونی حلقوں میں حیرت کا باعث بننے والے ایک اچانک اقدام میں چیف جسٹس آف پاکستان اور دیگر چودہ ججوں کو آمرانہ انداز میں فارغ کردینے کا عمل بھی شامل ہے۔ عدلیہ کا یہ سفاکانہ قتل ایک ایسے وقت کیا گیا جب کہ برطرف وزیراعظم نواز شریف کی بحالی کے لیے ایک درخواست کی سماعت ہونے والی تھی۔

عدلیہ کے کچھ عناصر کی بُری طرح سیاست زدہ ہونے کی حقیقت اب مزید راز نہیں رہی۔ اگر فوجی حکمران عدلیہ کے متنازعہ ارکان کو ہی ہدف بناتے تو عوامی سطح پر بھی انہیں پذیرائی ملتی۔

اس کے بجائے عدلیہ کے چند آزاد ارکان کو برطرف کر کے فوجی حکمرانوں نے ایسے افراد کو بحال رکھا ہے، جن کی شہرت فوائد اور مراعات حاصل کرنے کے حوالے سے داغ دار رہی ہے۔ حکومت پر فوج کے قبضے کے تین ماہ بعد عدلیہ کے سینئر ارکان کے خلاف اس اچانک اقدام سے واضح طور پر نئی حکومت کی بوکھلاہٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ عوامی حلقوں، خصوصاً بار ایسوسی ایشنز اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے بھی اس کی مذمت کی ہے۔

عدالتی قتل کا ارتکاب پاکستان میں گردش کرنے والی ان رپورٹوں کے باعث عجلت میں کیا گیا جن کے مطابق پاکستانی عدلیہ میں بے انتہا اختیارات کے حامل چیف جسٹس جرنیلوں سے بحالی جمہوریت کے لیے ٹائم ٹیبل کا تقاضا کر کے انہیں خفت کا شکار کرنے والے تھے اور اس پر جرنیل آمادہ نہیں تھے۔ چیف جسٹس سعید الزمان صدیقی نے جرنیلوں کے نئے لیگل آرڈر کے تحت حلف اُٹھانے سے انکار کر کے نئی حکومت کی آئینی حیثیت کو چیلنج کیا اور ایک مرتبہ پھر اس کے جائز ہونے کے متعلق

سوالات اُٹھا دیئے۔ اُنہوں نے واضح طور پر کہا کہ ''وہ صرف آئین کے تحت کام کریں گے۔''

دلچسپ امر یہ ہے کہ چیف جسٹس نے اکتوبر 1999ء میں اقتدار پر قابض ہونے کے بعد فوجی حکومت کی اُن کے ساتھ ہونے والی مفاہمت کا بھی ذکر کیا۔ صدیقی صاحب کے بقول جنرل مشرف نے آئین میں عدلیہ سے متعلق حصوں کو بحال رکھنے پر اُن کے ساتھ اتفاق کیا تھا۔ لیکن بعد میں جرنیلوں کی طرف سے نئے فرمان کے تحت حلف اُٹھانے کے لیے ایگزیکٹو آرڈر جاری کرنے پر ججوں اور جرنیلوں میں بگڑ گئی۔ ججوں کی برطرفی کو عوامی حلقوں میں پاکستان کے سابق فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق کی طرف سے عدلیہ میں اپنے وفادار جمع کرنے کے اقدامات کے مترادف سمجھا جا رہا ہے۔ یہ امر نئے چیف جسٹس ارشاد حسن خان کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے موجودہ جج حضرات کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان میں زیادہ تر اچھی شہرت کے حامل ہیں۔ نئے فرمان سے وفاداری کا حلف اُٹھا لینے کے بعد یہ جج نواز حکومت کی بحالی کی درخواست کی سماعت نہیں کر سکیں گے۔

لیکن اس عدالتی بحران سے نئی حکومت کی دوست بنانے کے معاملے میں نااہل اور دشمن اکٹھے کرنے کے میلان کی عکاسی ہوتی ہے۔ واضح طور پر جرنیل عدالتی اور سیاسی عمل کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے جلد بازی میں فیصلے کر رہے ہیں۔

سیاسی جماعتوں، بار ایسوسی ایشنوں اور حقوق انسانی کے کارکنوں کی طرف سے فاشسٹ نواز حکومت کی برطرفی کا خیر مقدم کرنے والے اُن سماجی طبقات کو بڑے منظم انداز میں مخالف بنا لیا گیا۔

احتساب کے لیے ایک آزادانہ طریق کار وضع کرنے کی عدم صلاحیت، نواز حکومت کے اپنے سیاسی مخالفین کے ساتھ روا رکھی جانے والی زیادتیوں کے ازالے میں ناکامی، متحدہ اپوزیشن کے ساتھ رابطے کی کمی اور اب واضح طور پر غیر جانب دار ججوں کی سفاکانہ برطرفی سے حکومت اس سیاسی حمایت سے محروم ہوگئی ہے جو گزشتہ اکتوبر میں اقتدار سنبھالتے وقت اسے حاصل تھی۔

اس سے وفاق سے متعلق سوالات بھی اُٹھے ہیں۔ کیونکہ بدقسمتی سے سپریم کورٹ کے فارغ کیے جانے والے ججوں کی اکثریت کا تعلق پہلے سے احساس محرومی کا شکار صوبہ سندھ سے ہے۔ جنرل مشرف نے اقتدار سنبھالتے وقت اپنے معزول پیش رو نواز شریف کی علاقائی پالیسیوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اب ان برطرفیوں کے علاقائی پہلو سے سندھ کے عوام میں احساسِ محرومی مزید بڑھے گا۔

عدالتی بحران سے پاکستان میں جمہوری معاشرے کی بڑھتی ہوئی تفریق اور سیاسی معاملات کے حل میں عدلیہ کی اہمیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ جمہوریتوں میں انتخابات حکمرانی کے مسائل و معاملات کا

تعین کرتے ہیں۔ پاکستان میں مختلف فریقوں کے حق حکمرانی کا تعین عدلیہ کرتی رہی ہے جس کا نتیجہ عدلیہ میں سیاست کے در آنے اور آزادی اور قانون کا شیرازہ بکھرنے کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ 1985ء میں جمہوریت کی بحالی سے لے کر پارلیمانی اکثریت رکھنے والی تین حکومتوں کے خاتمے پر عدلیہ نے مہر تصدیق ثبت کی۔ پچھلے چار برسوں میں پاکستان پیپلز پارٹی نے ایک چیف جسٹس پر اپنے خلاف سازش میں ملوث ہونے کا الزام لگایا جب کہ صدر فاروق لغاری نے ایک اور چیف جسٹس پر مسلم لیگ حکومت کو بچانے کا الزام عائد کیا۔ ججوں کے سیاسی ترغیبات کی طرف مائل ہونے کے اندیشے کے پیش نظر جرنیل نواز شریف کے نامزد کردہ چیف جسٹس سعید الزمان صدیقی کی طرف سے نواز حکومت کی بحالی کے کیس کی سماعت کا خطرہ مول نہ لے سکے۔

دوسرے ملکوں میں سیاسی سوچ رکھنے والے جج کسی ایسے کیس کی سماعت نہیں کرتے جن میں اُن کے کیس پر اثر انداز ہونے کا احتمال ہو۔ نتیجتاً عدلیہ بے داغ رہتی ہے۔ پاکستان میں ایسی صورت حال نہیں ہے۔ سیاسی مفادات رکھنے والے جج اپنی دلچسپی اور مفاد والے کیسز کی سماعت بالالتزام کرتے ہیں۔ جیسا کہ بھٹو، زرداری مقدمات سے ظاہر ہے۔ اُن کی طرف سے اپنے آپ کو سیاسی معاملات سے الگ رکھنے میں ناکامی سے عدلیہ کی غیر جانبداری متاثر ہوئی ہے۔ جس سے عدالتیں متنازعہ ہوگئی ہیں۔

پاکستان کی آمادۂ جنگ عدلیہ کے لیے آنے والے دن اور بھی تاریک ہوسکتے ہیں۔ عدالتی نامعقولیت پر رپورٹس چھپنے کے باوجود عدالتیں غلط فیصلوں پر قانون کے مطابق ایکشن لینے میں ناکام رہی ہیں۔ ججوں پر کرپشن اور کج روی کے الزامات کی تحقیق کرانے سے متعلق عوامی مطالبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ 1997ء میں اقتدار کی رسہ کشی میں برطرف کیے جانے والے چیف جسٹس سجاد علی شاہ ارکان عدلیہ کے احتساب کا مطالبہ کرنے والوں میں نمایاں رہے ہیں۔ پاکستانیوں کے احتساب کے مطالبے کے باوجود احتساب کے لیے غیر جانب دار ضابطہ کار اور منصفانہ قانون کے مطالبے پر زور نہیں دیا گیا۔ نتیجے کے طور پر احتساب کے لیے بلند کیا جانے والا شور وغل محض انتقامی ڈراموں تک محدود ہوجائے گا۔

یہ عدالتی بحران، جس نے بھارت کی طرف سے پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دلوانے کی مہم کے وقت سر اُٹھایا ہے، پاکستان کے استحکام کے لیے اچھا شگون نہیں۔ معاشرے کی منقسم صورت حال، زبوں حال ادارے، اقتصادی بدحالی اور اہم سیاسی جماعتوں کو نظر انداز کیے جانے سے ایک خلا پیدا ہورہا ہے جو انتشار پر منتج ہوسکتا ہے۔ پاکستان کے داخلی انتشار سے خطے کے امن اور سلامتی کو خطرہ

لاحق ہوسکتا ہے۔ پاکستان جو دنیا میں واحد اسلامی ایٹمی ملک ہے اور غیر مستحکم افغانستان کے ساتھ سرحدیں رکھتا ہے، بین الاقوامی برادری کے لیے تشویش کا باعث ہے۔

عدالتی بحران اکیسویں صدی کے آغاز پر پاکستان کو درپیش چیلنجوں کی عکاسی کرتا ہے۔ پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے لیے یہی وقت ہے کہ وہ گزشتہ تین ماہ کا جائزہ لیں اور منفی اثرات کا ازالہ کریں۔ یہ اسی صورت ممکن ہے جب جرنیل اصلاح احوال کے لیے سیاسی اتفاق رائے کے حصول کا عندیہ دیں۔ اس عندیے کے بغیر ملک کا مستقبل غیر یقینی ہے۔

ہائی جیکنگ اور درپیش مشکلات

دسمبر 2000ء میں کشمیری مجاہدین نے کھٹمنڈو سے اُڑنے والے ایک بھارتی طیارے کو کامیابی سے ہائی جیک کر لیا۔ طیاروں کے اغوا کی حالیہ تاریخ میں یہ ایک بہت کامیاب ہائی جیکنگ تھی۔ ہائی جیکنگ تقریباً ایک ہفتہ جاری رہی اور کشمیری مجاہدین نے بھارت کو اپنے مطالبات ماننے اور بھارتی جیلوں میں متعدد کشمیری مجاہدین کو رہا کرنے پر مجبور کر دیا۔

31 دسمبر 1999ء کو جب ساری دنیا میں صدی کی اختتامی تقریبات منائی جارہی تھیں، بھارتی حکومت نے بڑی خفگی اور بیزاری کے ساتھ کشمیری مجاہدین کی طرف سے پیش کیے گئے مطالبات کے سامنے سر جھکا دیا۔ اس کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔ جو لوگ طیارے میں سوار تھے، اُن کے لواحقین نے بھارتی حکومت کو نرغے میں لے رکھا تھا۔ اندرونی دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ بھارتی حکومت کو اپنا یہ سخت رویہ تبدیل کرنا پڑا کہ ہائی جیکروں سے مذاکرات نہیں کیے جائیں گے۔

یرغمالی اپنے گھروں میں پہنچ گئے اور ہائی جیکرز افغانستان کے پہاڑوں میں کہیں غائب ہو گئے ہیں، جہاں طیارہ اُتارا گیا تھا۔ تاہم ہائی جیکنگ نے بھارت اور پاکستان کے تعلقات کو بری طرح متاثر کیا۔ دونوں ملکوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے پر الزامات لگانے کا کھیل شروع کر دیا ہے، جو جنوبی ایشیا میں امن اور استحکام کے لیے ایک بُرا شگون ہے۔

ہائی جیکنگ کے بعد بھارت نے فوراً ہی پاکستان کو ذمہ دار قرار دے دیا۔ ایک موقع پر اُس کا دعویٰ تھا کہ ہائی جیکر اسلحہ سمیت پاکستان کی قومی ایئر لائن کے ذریعے کھٹمنڈو پہنچے تھے اور ٹرانزٹ لاؤنج سے جانچ پڑتال کے بغیر بھارتی طیارے میں منتقل ہو گئے تھے۔ اس مؤقف کی کبھی تصدیق

نہیں ہوسکی۔ اس کے ردّعمل میں پاکستان نے بھارت پر الزام لگایا کہ وہ ہائی جیکنگ سے سیاسی فائدے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بھارت کی طرف سے دہشت گردی کی سرپرستی کے الزام کا پاکستان نے فوراً جواب دیا اور اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کے لیے بھارت کے ساتھ تجارت معطل کر دی۔

یہ بات درست نہیں۔ یہ وقت ہے کہ کشیدگیوں کو کم کیا جائے، نہ کہ اُن میں شدت پیدا کی جائے۔ ہائی جیکنگ تو ختم ہو چکی ہے، مگر اب اس کے اثرات کا آغاز ہوا ہے۔

نئی چپقلش سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ بھارت جوابی کارروائی کرنے کی پوری کوشش کرے گا، کیونکہ ہائی جیکنگ کی وجہ سے وہ پہلے ہی بہت بے عزت ہو چکا ہے۔ یہ جوابی کارروائی اس شکل میں ہوسکتی ہے کہ پاکستان کو ایک دہشت گرد ملک قرار دلوانے کے لیے ایک نئی بین الاقوامی مہم شروع کر دی جائے۔

ہائی جیکنگ کا واقعہ ایسے موقع پر پیش آیا ہے جب پاکستان پہلے ہی بُرے حالات میں پھنسا ہوا ہے۔ ابھی تو گزشتہ موسم بہار میں کارگل کے اس بحران کے اثرات سے باہر نکلنے کا آغاز ہی ہوا تھا، جب دونوں ملک جنگ کے دہانے تک پہنچ گئے تھے۔ پاکستان کے نئے فوجی حکمران نے بڑی گرم جوشی سے بھارت کو خیر سگالی کے پیغامات بھجوائے تھے، حتیٰ کہ سرحدوں پر تعین فوج میں بھی کمی کر دی تھی۔ مگر بھارت کے لیے جنرل صاحب پر اعتماد کرنا مشکل تھا، جنہیں وہ کارگل کے جھگڑے کا منصوبہ تیار کرنے والا سمجھتا ہے۔ یہ بداعتمادی جنوبی ایشیا کے استحکام کے مفاد کے لیے نقصان دہ ہے۔

دونوں ملکوں کے تعلقات میں کمی کا رجحان ایسے وقت میں پیدا ہوا، جب سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کے متعلق بحث ومباحثہ جاری ہے۔ دونوں ملکوں نے اپنے اپنے طور پر ارادہ ظاہر کیا ہے کہ وہ معاہدے پر دستخط کریں گے، مگر ابھی تک ایسا کیا نہیں گیا۔

گزشتہ سال مئی میں دونوں ملکوں کی طرف سے ایٹمی دھماکوں کے بعد پاکستانی اپوزیشن نے معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے کہا تھا، مگر اس کے باوجود پاکستان نے ایسا نہ کیا۔ اس تساہل نے پاکستان کو ایک کونے میں لا کھڑا کیا ہے۔ بھارت کے مقابلے میں پاکستان کو بہت تھوڑی نیوکلیئر صلاحیت کی ضرورت ہے، جب کہ بھارت کے سامنے چین اور پاکستان ہیں۔ اگر بھارت نئے تجربات کرتا ہے، تو اس سے پاکستان پر دباؤ بڑھ جائے گا۔ ردّعمل میں اس کا جواب دینا بین الاقوامی طور پر نقصان دہ ہوگا۔ اگر جواب نہ دیا گیا تو عوام اسے بھارت کے مقابلے میں ناکامی سمجھیں گے۔

پاکستان کو پہلے ہی بہت سی مشکلات درپیش ہیں۔ ملک کو ایک غیر منتخب اور غیر نمائندہ حکومت چلا رہی ہے۔ عوام کو متحد کر سکنے والی ملک کی اہم سیاسی طاقتوں کی حیثیت کم کر دی گئی ہے۔ آئین معطل ہے، پارلیمنٹ خاموش کر دی گئی ہے اور عدلیہ کو ''احتساب'' کی دھمکی دی جارہی ہے، بشرطیکہ وہ بتائے گئے راستے پر نہ چلے۔

اس سے بھی بُری بات یہ ہے کہ معیشت اُن اقدامات کا ساتھ نہیں دے رہی، جو اس کی بحالی کے لیے کیے جارہے ہیں۔ نئی حکومت ایسی اقتصادی پالیسی تشکیل نہیں دے سکی جو مارکیٹ میں اعتماد پیدا کر سکے، یا بیرونی سرمایہ کاری کو ترغیب دے سکے۔ بیرونی سرمایہ کاروں کی ترغیب کے لیے خیر سگالی کے بے شمار بیانات دیئے گئے ہیں، مگر پالیسی کے متعلق ایک بھی نہیں۔ گزشتہ حکومت کی طرح یہ حکومت بھی آئی ایم ایف کے قرضوں پر بھروسہ کر رہی ہے، اور معیشت کی تبدیلی کے لیے اپنے لوگوں کی کاروباری صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں کر رہی۔

دریں اثناء بیروزگاری میں اضافہ ہورہا ہے۔ ہر روز بیسیوں سرکاری ملازم برطرف کیے جارہے ہیں۔ سماجی بے اطمینانی بڑھ رہی ہے اور بے چینی خطرہ بنی ہوئی ہے۔ بے چینی سے نجات حاصل کرنے کے لیے کرپشن کے غیر تصدیق شدہ الزامات کے تحت لوگوں کو گرفتار کیا جارہا ہے اور اُمید دلائی جارہی ہے کہ کرپٹ عناصر سے دولت چھین کر معیشت بحال کر دی جائے گی۔ یہ ایک خطرناک پالیسی ہے۔

بھارت کو پاکستان کی ان اندرونی مشکلات کا علم ہے، جو سیاسی طور پر منتشر اس ملک کو درپیش ہیں اور ملک دیوالیہ پن کے کنارے پر کھڑا لرز رہا ہے۔ بھارت پر مغرب کا دباؤ تھا کہ پاکستان کے ساتھ مذاکرات شروع کیے جائیں، مگر ہائی جیکنگ کا ڈرامہ رچا کر اس کے ہاتھ میں ایک ایسا ڈنڈا آ گیا ہے، جس سے وہ پاکستان کو پیٹ سکے۔

ہائی جیکنگ سے پاکستان کو ایک فائدہ پہنچا ہے کہ ایک بار پھر کشمیر کا تنازعہ بین الاقوامی تعلقات میں مرکزی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ بہت سے لوگ دلیل دیں گے کہ دنیا کو بیدار کرنے کے لیے جرأت مندانہ کارروائیوں کی ضرورت ہے اور ایٹمی جنگ کی دھمکی ہی بین الاقوامی برادری کو کوئی قدم اُٹھانے پر مجبور کر سکتی ہے۔ یقیناً بین الاقوامی میڈیا اور دنیا کے سیاست دان اس وقت بہت مستعد ہوجاتے ہیں، جب کوئی خطرناک صورت حال پیدا ہوجائے۔ اندازہ کریں کہ جب 1998ء میں بھارت اور پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے، تو کشمیر بین الاقوامی توجہ کا مرکز بن گیا تھا، یا پھر جی۔8 کی دلچسپی کا اندازہ کیجئے جب 1999ء میں کارگل میں لڑائی شروع ہوگئی تھی اور پھر یہ

دلچسپی دوبارہ عود کر آئی، اگرچہ تھوڑی سی سہی، جب ہائی جیکنگ کا واقعہ پیش آیا۔

مگر یہ ایک خطرناک دلیل ہے اور اس سے بھی زیادہ خطرناک ایسا راستہ اختیار کرنا ہے۔ پچھلے پچاس برسوں سے ایسی ہی کوششیں کی گئی ہیں، مگر دونوں ملکوں کے اختلافات ختم نہیں ہو سکے۔ اس کے برعکس 1971ء میں پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے اور 1999ء میں کارگل سے پسپائی کی ذلت برداشت کرنی پڑی۔ بھارت اور پاکستان کو مشرقِ وسطیٰ سے سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے، جہاں پیچیدہ مسائل مذاکرات کے ذریعے حل کیے جا رہے ہیں۔ شام اور اسرائیل کے حالیہ مذاکرات سے برصغیر کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔

ایک فوجی حکمران، جو اندرونی مشکل صورت حال کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے اور خصوصی قوانین اور خصوصی عدالتوں کے ذریعے اندرونی دشمنوں سے برسرِ پیکار ہے، کیا وہ امن پر اتنی توجہ دے سکتا ہے، جتنی ضرورت ہے؟ کیا اس میں اتنی پیش بینی ہے کہ وہ صدر کلنٹن کے جنوبی ایشیا کے دورے سے فائدے اُٹھائے اور پاک بھارت تعلقات کی بحالی کو ممکن بنا سکے؟

اس کے جواب کا ابھی کسی کو علم نہیں، شاید جنرل صاحب کو بھی نہ ہو۔ مگر اس جواب میں دو ایٹمی ملکوں کے خراب ہوتے ہوئے تعلقات کے نتائج پوشیدہ ہیں۔ دونوں ملک گزشتہ موسم بہار میں ایٹمی تصادم کے قریب پہنچ چکے تھے اور گزشتہ ماہ پیش آنے والا ہائی جیکنگ کا واقعہ ایک بار پھر خطرناک اور نیوکلیئر مقابلے پر منتج ہو سکتا ہے۔

قیادت میں تبدیلی اور مشرقِ وسطیٰ میں امن کے امکانات

اکیسویں صدی اپنے آغاز میں ہی اسلامی دنیا میں قیادت ایک نئی نسل کے ہاتھوں منتقل ہوتے دیکھ رہی ہے۔ مراکش، اردن اور شام سمیت اہم مسلم ممالک میں مختصر عرصے میں قیادت میں تبدیلی آئی ہے۔

قیادت کی ایک سے دوسری نسل کو یہ تبدیلی ایسے وقت میں عمل میں آئی ہے جب دنیا سرد جنگ کی یخ بستیوں سے نیو ورلڈ آرڈر کی فضا میں داخل ہورہی ہے۔ اس لیے نئی نسل کے لیڈروں کے جمہوریت، استحکام، گلوبلائزیشن اور امن جیسے مسائل سے نمٹنے کے سوال پر تشویش پائی جاتی ہے۔

اس کا انحصار بہت زیادہ حد تک لیڈر کی صلاحیت، اسے میسر اداراتی حمایت (Institutional Support) اور اس کی قوم کو درپیش مسائل کی نوعیت سے ہے۔ اس لحاظ سے ہر ملک کی صورت حال مختلف ہے۔

مراکش کے نئے بادشاہ محمد پیدا ہوتے ہی اپنے باپ کے جانشین ہوگئے تھے۔ تخت کے یقینی وارث ہونے کی وجہ سے ریاست کے تمام اداروں کو یقین تھا کہ وہ حکمران بنیں گے۔ ایک لحاظ سے اُن کی پیدائش کے وقت سے ہی اُن کے ساتھ وفاداری کا حلف لیا جا چکا تھا۔ بین الاقوامی حمایت بھی واضح اور شک وشبہ سے بالاتر تھی اور اُمید تھی کہ متوقع بادشاہ خارجہ معاملات میں اپنے والد کی پالیسیوں کو ہی جاری رکھیں گے۔ اس سلسلے میں اپنے ملک کی سمت میں تبدیلی کے لیے اُن پر

کوئی دباؤ نہیں ہوتا تھا اور وہ داخلی معاملات پر توجہ مرکوز کر سکتے تھے۔

اس سازگار صورت حال سے مراکش کے نئے بادشاہ کو کافی اعتماد حاصل ہوا اور انہیں زیادہ متنازعہ مسائل پر توجہ دینے کا موقع ملا۔ سازگار خارجی صورت حال کے باعث انہیں اپنے والد کی چند داخلی پالیسیوں سے ہٹنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ رُسوا کن وزیر داخلہ کو برطرف اور سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ شاہی محل کی طرف سے یہ اشارہ دیا گیا کہ داخلی معاملات اور مسائل پر بحث کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے۔

اردن کے برسر اقتدار فرمانروا کا سب سے بڑا بیٹا ہونے کے باوجود شہزادہ عبداللہ کی تربیت مستقبل کے بادشاہ کے طور پر نہیں کی گئی تھی۔ ولی عہد اُن کے چچا شہزادہ حسن تھے جو اُن کے والد کی غیر موجودگی میں انتظام مملکت سنبھالتے تھے۔ ملک کے ادارے بھی شہزادہ حسن کو آئندہ بادشاہ کے طور پر دیکھتے تھے اور عبداللہ کی زندگی خاموشی سے گزر رہی تھی۔

لیکن اردن کوئی عام ملک نہیں تھا۔ مشرقِ وسطٰی میں امن کے عمل میں مرکزی حیثیت کے حامل ہونے اور اسرائیل سے تعلقات کے حوالے سے اُن کے والد شاہ حسین کو دنیا کے اس ہیجان خیز خطے میں استحکام کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

یہ شاہ حسین کی امریکی نژاد ملکہ نور سے شادی تھی، جس نے اردن میں مختلف اداروں کو جانشینی میں تبدیلی پر مائل کیا۔ ملکہ نور اور ولی عہد کے خاندان کے باہمی تعلقات تناؤ کا شکار تھے۔ جب شاہ حسین کینسر کے باعث بستر مرگ پر تھے تو اردن کے مختلف اداروں کے اہم عاملین ولی عہد کی تبدیلی کے لیے ملکہ کے ہم آواز بن گئے۔ جب شاہ حسین واپس آئے تو اُمید یہ کی جا رہی تھی کہ وہ ملکہ نور کے کمسن بیٹے کو ولی عہد نامزد کریں گے، لیکن اداراتی ہم آہنگی کے فقدان کے باعث شاہ نے اپنے سب سے بڑے بیٹے شہزادہ عبداللہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

اپنے خاندان، عوام، فوج اور دیگر اداروں میں حمایت حاصل کرنے کے لیے شہزادہ عبداللہ کو بہت احتیاط کے ساتھ قدم اُٹھانا ہوں گے۔ بیرونی حمایت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے والد کی خارجہ پالیسی پر کس حد تک کاربند رہتے ہیں۔ داخلی محاذ پر بیروزگاری اور افلاس کی صورت میں انہیں بہت بڑے مسائل سے نبرد آزما ہونا ہے۔ اگرچہ اُن کا ملک اسرائیل کے ساتھ پُرامن تعلقات رکھتا ہے، لیکن یہی امن اُن کے لیے کافی مشکل صورت حال لیے ہوئے ہے کہ اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کے ساتھ وہ مشرقِ وسطٰی میں طاقت کے توازن کے کھیل میں اردن کی اہم پوزیشن کو قائم رکھنے کی آزمائش پر کس حد تک پورا اُتر سکیں گے۔

وہی ایک ایسے لیڈر ہیں جو ماڈرنائزیشن اور گلوبلائزیشن کو اپنانے کے لیے زیادہ تیزی کے ساتھ اقدامات اُٹھا سکتے ہیں کیونکہ امن کے ایشوز پر پہلے ہی کافی پیش رفت ہو چکی ہے۔ دراصل ماڈرنائزیشن میں ہی اُن کے لیے وسیع تر حمایت کے حصول کا موقع ہے۔

مراکش اور اردن بین الاقوامی سطح پر ایک جیسا تشخص رکھتے ہیں، لیکن شام کی صورت حال مختلف ہے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جو مشرقِ وسطیٰ میں امن کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے، لیکن اس نے اقوام متحدہ کی قرار دادوں سے ہٹ کر کسی معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کیا ہے۔ اپنے آخری ایام میں بھی جب کہ اسرائیلی فوجوں کا لبنان سے انخلا ہو رہا تھا، شام کے صدر حافظ الاسد نے کسی امن سمجھوتے پر دستخط سے انکار کیا جب کہ ایسا کرنے کی صورت میں تھوڑی بہت ایڈجسٹمنٹ کے ساتھ گولان کا سارا علاقہ شام کو مل سکتا تھا۔

''زمین کے ایک ایک انچ کی واپسی''، یہ وہ وصیت ہے جو وہ اپنے ملک کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ یہ امر یقینی نہیں ہے کہ اُن کے بیٹے اور جانشین ڈاکٹر بشر، یا شام کے نظام اقتدار کے دوسرے عناصر اور عوام اُن کی وصیت سے انحراف کرنے پر تیار ہوں گے۔

صدر حافظ الاسد نے تیس سال شام پر حکومت کی، لیکن یہ فردِ واحد کی حکمرانی نہیں تھی۔ اُنہوں نے خطے میں شام کے کردار کے بارے میں ایک داخلی اتفاق رائے کی علم برداری کی۔ اس اتفاق رائے کی بدولت شام خطے میں ایک اہم طاقت کے طور پر اُبھرا۔ لبنان کے صدر لاحود ایک ایسے لیڈر تھے جو شام کے مرحوم صدر کے جنازے کے ساتھ اُن کی قبر تک ساتھ گئے۔ اس سے شام کے ''دو ملک لیکن ایک عوام'' کے نعرے کی عکاسی ہوتی ہے۔

صدر حافظ الاسد نے امن کے لیے اپنے ایک تزویراتی انتخاب (Strategic Choice) پر عمل کیا۔ ''اس تشویش کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے کہ شام میں قیادت کی تبدیلی امن قائم ہونے کی رفتار میں رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہے، لیکن اگر اسرائیل اس لچک کا مظاہرہ کرے، جس کی توقع وہ صدر حافظ الاسد سے کرتا رہا ہے، امن کے لیے ایک ''سٹرٹیجک چوائس'' کا انتخاب کرے تو ایسا نہیں ہوگا۔

تاریخ میں ایسے لمحے اور مواقع آتے ہیں جن کو اگر استعمال کر لیا جائے تو آراء اور رویوں میں زبردست تبدیلیوں کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ صدر حافظ الاسد کی موت بھی ایک ایسا ہی اہم موقع ہے جو ماضی کی نفسیاتی ذہنیت کو ایک بہتر مستقبل میں تبدیل کرنے کے لیے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، جیسا کہ نیوز ویک نے لکھا ہے، ''اسرائیل اور شام کے

درمیان امن مذاکرات میں صرف گولان کی پہاڑیوں اور بحر گلیلی کے ساحل پر چند سوگز رکاوٹ ہیں۔'' اسرائیلی وزیراعظم ایہود بارک کے پاس قیادت کے اظہار کا موقع ہے کہ وہ رکاوٹ کو دور کرتے ہوئے امن معاہدے کی پیش کش کر کے خطے میں نفسیاتی پیش رفت کی راہ ہموار کریں۔

بشرالاسد سے یہ توقع کرنا کہ وہ اس لچک کا مظاہرہ کریں جس کا مظاہرہ کرنا ایہود بارک کے لیے زیادہ آسان ہے، جب کہ دیگر عوامل ایک جیسے ہیں، غیر ضروری طور پر کامیابی کے امکانات کو دھندلانے کے مترادف ہے۔ ٹھیک ہے کہ ایہود بارک کا حکومتی اتحاد پارلیمانی حمایت کھو چکا ہے۔ یہی بارک کے لیے ایک اہم وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ امن کے قیام کے لیے آگے بڑھ کر قدم اُٹھانے والی شخصیت کے طور پر اپنے آپ کو پیش کر کے تاریخ میں اپنا نام لکھوالیں۔ بارک کے اس اقدام سے نہ صرف امن کو فائدہ پہنچے گا، بلکہ جنگ کے اُن زخموں کے اِندمال کا باعث بھی بنے گا، جو طرفین کی کئی نسلوں نے کھائے ہیں۔

صدر حافظ الاسد کی تعزیت کے لیے اسرائیل سے سڑک کے ذریعے دمشق پہنچنے والے پانچ اسرائیلی ارکانِ پارلیمینٹ کے وفد کو زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ ہر پانچ میں سے ایک اسرائیلی نسلاً فلسطینی ہے۔ سرد جنگ کی دنیا میں اتحادوں پر مبنی حکومتوں میں اضافے کے باعث جہاں آئیڈیالوجی کے بجائے حقیقت پسندی اور عملیت پسندی (Pragmatism) زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے، اسرائیل کے اندر مستقبل پر نظر رکھنے والے لیڈروں کے لیے عرب ووٹ امن کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔

کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ''ہم میں سے ایک کی کامیابی سب کی کامیابی ہے۔''

چھوٹے ہتھیار اور تنازعات کے شکار خطّے

بیرون ملک سے چھوٹے ہتھیاروں اور ہلکے آلات جنگ کی وسیع پیمانے پر ترسیل نے افغانستان میں اُلجھی ہوئی سیاسی وفوجی صورت حال کو موجودہ نہج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ انتقال کسی حد تک گزشتہ کئی برسوں سے جاری رہا ہے۔ غیر ریاستی افراد، جن کے پاس آلاتِ جنگ خریدنے کے لیے تیار زرِ نقد ہوتا ہے، سول معاشرے پر کنٹرول حاصل کر رہے ہیں اور جمہوریت، انسانی حقوق اور آسودہ حالی کے لیے خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ متنازعہ علاقوں میں چھوٹے ہتھیاروں کے انتقال کے طویل مدتی مضمرات پر غور وفکر کیا جائے۔

مسلح ٹکراؤ تبدیل ہو رہا ہے، اب جنگیں سرگرمِ عمل ریاستوں کی منظّم فوجوں کے ذریعے روایتی ہتھیاروں کے ساتھ نہیں لڑی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس اب جنگیں گوریلا، مجرم اور دہشت گرد گینگ چھوٹے ہتھیاروں اور ہلکے جنگی آلاتِ کے ساتھ لڑتے ہیں۔ یہ گینگ بندوق کی نوک پر اقتدار اور طاقت حاصل کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ یہ گروپ ملکی سرحدوں کے طول وعرض میں پھیلے ہوتے ہیں اور سرگرمِ عمل ہوتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں اقتدار حاصل کرنے کی اندرونی کوششیں بتدریج وسیع تر علاقائی جنگوں میں تبدیل ہو رہی ہیں اور اب، آخر کار دہشت گردی کے خلاف ایک عالمی مہم شروع ہو چکی ہے۔

افغانستان میں چھوٹے ہتھیاروں اور ہلکے آلاتِ حرب کا سیلاب آیا ہوا ہے، جو ریاست کے ریگولیٹری کنٹرول سے باہر ہے۔ 1980ء کی دہائی کے دوران مجاہدین کو مسلح کیا گیا تھا۔ تب سے

اب تک ہتھیاروں کا افغانستان کے اندر بے ضبط بہاؤ جاری ہے۔ شمالی اتحاد، ایمنسٹی انٹرنیشنل کے مطابق جس کا انسانی حقوق کا ریکارڈ طالبان حکومت کے ریکارڈ سے صاف طور پر الگ ہے، کو متعدد سرکاری حلقوں کی طرف سے ہتھیاروں کی خفیہ سپلائی جاری ہے۔

ماضی میں امن کی کوشش جزوی طور پر اکٹھے کیے گئے چھوٹے ہتھیاروں اور ہلکے اسلحہ کو تباہ کرنے میں ناکامی کی وجہ سے ناکام ہوئیں۔ اس سے تنازع کے فریقین کو موقع ملا کہ وہ اپنی مرضی سے لڑائی شروع کر دیں۔ چنانچہ قیام امن کے عمل میں جنگ جوؤں کو فوجی خدمت سے سبکدوش کرنے اور اُن کے ہتھیاروں کو تباہ کرنے کا کام بھی شامل کیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ ممکنہ حد تک جنگ بندی کے معاہدے کے حصے کے طور پر برسر پیکار تمام پارٹیوں کو افغانستان کے اندر چھوٹے ہتھیاروں کے انتقال کے حوالے سے ایک عارضی معاہدے پر بھی متفق ہونا چاہیے۔

جنگ جوؤں کو فوجی ملازمت سے سبکدوش کرنا قومی تعمیر نو پروگرام کا لازمی عنصر ہونا چاہیے۔ قومی متحدہ حکومت بنانے کے حوالے سے ہونے والی بات چیت میں عالمی برادری کو اس امر کی یقین دہانی کر لینا چاہیے کہ گفتگو میں حصہ لینے والے گروپ تمام برسر پیکار پارٹیوں کو غیر مسلح کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ امداد فراہم کرنے والی بین الاقوامی برادری پر بھی زور دیا جانا چاہیے کہ وہ افغانستان میں جنگ کے بعد کی صورتِ حال کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے درکار فنڈز جلد از جلد مہیا کریں۔

امریکہ پر ہونے والے گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد سے یہ باتیں ہو رہی ہیں کہ کس طرح ہم سب کو دہشت گردی سے نبرد آزما ہونے کے لیے لازمی تعاون کرنا چاہیے۔ تنازعات کے شکار علاقوں میں چھوٹے ہتھیاروں اور ہلکے جنگی آلات کے پھیلاؤ کا قلع قمع کرنے کے تعاون کے لیے بھی بین الاقوامی اینٹی ٹیرر مہم میں اتنا ہی ترجیحی ہونا چاہیے، جتنی کہ دہشت گردوں کو اقتصادی اور فوجی انتظام و انصرام سے محروم کر دینے کی کوششیں۔ ایسی کیفیت میں ایشو یہ نہیں ہے کہ جنگ کے زمانے میں حکومت کی اصالت اتحادیوں کو منتقل ہو جاتی ہے، بلکہ یہ ہے کہ بڑے ہتھیار برآمد کرنے والی ریاستوں کو حتیٰ الامکان احتساب کے لیے طلب کیا جائے، تاکہ یہ پتا چلایا جا سکے کہ یہ ہتھیار کہاں سے آتے ہیں۔ یہ بات ان ہتھیاروں کے حوالے سے خاص طور پر اہم ہے، جو کہ حال ہی میں ٹرانسفر کیے گئے ہیں۔

تنازعات کے شکار خطّوں میں چھوٹے ہتھیاروں اور ہلکے جنگی اسلحے کے پھیلاؤ کو روکنے اور ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم آہنگ بین الاقوامی کوششوں میں ایسی پالیسی شامل ہو۔

معلومات کے تبادلے اور مارکنگ کے ذریعے ہتھیاروں کے غیر قانونی ذریعوں کا سراغ لگانے پر بھی زور دیا جانا چاہیے۔ بین الاقوامی قانون کے تحت چھوٹے ہتھیاروں کی منتقلی اور اُس کے ساتھ ساتھ چھوٹے ہتھیاروں کی منتقلی کے سلسلے میں ریاستی احتساب کا معیار بڑھائے جانے کی ضرورت ہے۔ حکومتی لین دین بھی اسی معیار کے مطابق ہونا چاہیے، جس کے تحت کمرشل لین دین ہوتا ہے۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف سے عائد کی جانے والی پابندیوں پر سختی کے ساتھ عمل درآمد پر بھی عمومی زور دیا جانا چاہیے۔ آج تک اقوام متحدہ کی کوئی ایک بھی ایسی پابندی نہیں ہے، جسے اس کی اپنی ہی کونسل کے اراکین نے نقصان پہنچایا ہو۔ نئی قرارداد منظور کرنے کے اعلان کے خیر مقدم کا مطلب اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اراکین کے لیے یہ ہوگا کہ اقوام متحدہ کی پابندیوں کے تحت مختلف خطوں کو جانے والی غیر قانونی پائپ لائنز یعنی ذریعوں اور راستوں کو بند کیا جائے۔ مثال کے طور پر ہم اُمید کرتے ہیں کہ روس وکٹر بوٹ کو انصاف کے کٹہرے تک لانے کی حمایت کرے گا۔ وکٹر بوٹ کے جی بی کا ایک سابق آفیسر ہے، جو پورے افریقہ میں باغیوں کو اہم نوعیت کے ہتھیار سپلائی کرتا تھا۔ اقوام متحدہ نے اس کے اس دھندے کا سراغ لگا لیا ہے۔

چھوٹے ہتھیاروں اور ہلکے حربی آلات کی غیر قانونی تجارت کے حوالے سے جولائی میں اقوام متحدہ نے ایک کانفرنس کرائی، جو تقریباً ناکام ہو گئی تھی، کیونکہ اسلحہ بنانے والے کچھ ممالک برآمدات میں بڑھتی ہوئی شفافیت کے خلاف تھے۔ آخری لمحوں پر کانفرنس کو مکمل طور پر ناکام ہونے سے بچانے کے لیے افریقی ریاستوں کو غیر سرکاری افراد کو چھوٹے ہتھیاروں کی ترسیل روک دینے کا اپنا تقاضا ترک کر دینا پڑا۔ افریقی ریاستیں یہ تقاضا کرنے پر مجبور تھیں کیونکہ اس براعظم کی ہمیشہ جاری رہنے والی جنگیں جزوی طور پر قیمتی وسائل پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے لڑی جاتی رہی ہیں۔

ممتاز افراد کا گروپ، 23 شخصیات پر مشتمل ایک بین الاقوامی کمیشن ''پیرس پراسیس'' کے تحت چھوٹے ہتھیار تیار کرنے والے سرکردہ ممالک کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ یہ 23 شخصیات اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان کے قریب ہیں۔ اس گروپ کے شریک چیئر مین او اے یو کے سابق سیکرٹری جنرل سلیم احمد سلیم اور مالین صدر الفا عمر کونارے ہیں۔ اس گروپ کے اسلحہ تیار کرنے والے ممالک کے ساتھ تعاون کرنے کا مقصد کوفی عنان کے عالمی سطح پر چھوٹے ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے اس تصور کو آگے بڑھانا ہے، جس کا تعین میلینیم رپورٹ میں کیا گیا۔ ''پیرس

پراسیس'' درآمد کرنے والے، برآمد کرنے والے اور تیار کرنے والے ممالک کے مابین تمام سطح پر حوصلہ افزاء تعاون کی اہمیت کا جائزہ لیتا ہے۔ تنازعات کے شکار خطوں کی طرف ایسے ہتھیاروں کی ترسیل مؤثر طور پر روکنے کے لیے یہ عمل اہمیت کا حامل ہے۔

سٹیٹ ریگولیٹری کنٹرولر کے باہر چھوٹے ہتھیاروں اور ہلکے جنگی آلات کے غیر قانونی پھیلاؤ کو ختم کرنے کے سلسلے میں مدد کے طور پر ''پیرس پراسیس'' میں شریک اسلحہ تیار کرنے والے ممالک نے خود ہی ایسے اقدامات شروع کر دیئے ہیں۔ مارکنگ اور معلومات کے تبادلوں کے ذریعے سراغ لگانے کے حوالے سے کسی بین الاقوامی قانونی وسیلے پر اتفاق رائے آنے والے برسوں میں مشکل ثابت ہوگا، اس لیے تیار کنندگان کو خود ہی کوئی اقدام کرنا پڑے گا۔

سمال آرمز کنٹرول کے میدان میں مارکنگ اور ٹریسنگ ایسے شعبے ہیں، جہاں کمرشل اور حکومت کی نگرانی میں مال تیار کرنے والوں اور اُن کے ساتھ ساتھ حکومتوں کو آپس میں مل کر کام کرنے میں فائدے ہیں۔ اس اہم اقدام کی کامیابی کے لیے چھوٹا اسلحہ تیار کرنے والے اور برآمد کرنے والے ممالک کی حکومتوں کی طرف سے ''پیرس پراسیس'' کی حمایت اہمیت کی حامل ہے۔

جبر اور اشتعال کی سیاست

طالبان ملیشیا کی احمد شاہ مسعود کی فوجوں کے خلاف حالیہ حملے کے بعد طالبان وسط ایشیا کی ریاستوں کے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں۔ پاکستان جو افغانستان کا ہمسایہ ملک ہے، اُسے اُمید ہے کہ طالبان کی یہ پیش قدمی پاکستان کے لیے نئی راہیں کھول دے گی۔

گزشتہ چند ماہ کے دوران اعلیٰ سطح کے افسروں نے روس کا دورہ کیا ہے تا کہ روس کی حمایت حاصل کر سکیں۔ روس نے اپنا سفیر بھیج کر جواب دیا ہے۔ لیکن پاکستان کی یہ اُمید پوری نہیں ہوئی کہ روس کے صدر پیوٹن بھارت کے دورے پر بھارت پہنچنے سے قبل راستے میں پاکستان میں مختصر قیام کریں گے۔

پاکستان قریباً نصف صدی تک امریکہ کا زبردست حلیف رہا ہے۔ دونوں ممالک کے مابین اس وقت تعلقات انتہائی عروج پر تھے جب پاکستان کی فوجیں افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف نبرد آزما تھیں۔ لیکن جس ملک نے ان دونوں ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا تھا اب وہی ملک ان دو قریبی حلیفوں کے مابین دوری پیدا کر رہا ہے۔

بین الاقوامی برادری پاکستان سے خوش نہیں ہے کیونکہ پاکستان افغانستان کے بنیاد پرست طالبان کی حمایت کر رہا ہے، جو اس وقت تقریباً پورے افغانستان پر اپنا قبضہ جما چکے ہیں۔ طالبان کا تعلق افغانستان سے باہر دوسرے ملک سے ہے اور ان کے ٹریننگ کیمپ بھی دوسرے ملک میں ہیں۔ اس لیے طالبان کو تباہ کن قوت خیال کیا جاتا ہے۔ افغان طالبان اسلام کی تشریح کے حوالے سے انتہا پسند رویوں کے حامل ہیں۔ افغان طالبان اسلام کی تشریح اس انداز میں کرتے ہیں جو

دوسرے مذاہب اور عورتوں کو برداشت نہیں کرتا۔ ان کے اس رویے نے افغانستان کو دوسرے مسلمان ممالک سے علیحدہ کر دیا ہے۔

پاکستان نئے ورلڈ آرڈر کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ نئے ورلڈ آرڈر میں فوجی عہدوں کے بجائے مارکیٹ کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ امریکی امداد کے حصول میں ناکامی کے بعد پاکستان نے روس کی طرف اپنی نظریں لگانا شروع کر دی ہیں۔

اس بات کو مدّنظر رکھ کر کہ پاکستان کے دوست طالبان وسط ایشیا کی ریاستوں کے دروازے پر پہنچ چکے ہیں، پاکستان یہ سمجھتا ہے کہ روس کی نظر میں اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان کو اُمید ہے کہ یہ صورتِ حال امریکیوں کو اس بارے میں کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گی۔

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان ایک مرتبہ پھر بڑے کھیل میں شامل ہونے کی توقع کر رہا ہے؟ وسط ایشیا کی ریاستیں گیس اور تیل کے وسیع ذخائر رکھتی ہیں اور یہی چیزیں مشرق کی اُبھرتی ہوئی اقتصادیات میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ تاہم اس کے باوجود پاکستان اپنے آپ کو تنہا کر چکا ہے۔ پاکستان کو اُمید ہے کہ یا تو روس کے ساتھ تعلقات تیزی سے پروان چڑھیں گے، یا پھر مغرب ایک مرتبہ پھر پاکستان کو اہمیت دینے پر مجبور ہو جائے گا۔

درحقیقت پاکستان میں فوجی انقلاب کے ایک سال بعد ایسے محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان مشکلات میں تنہا رہ گیا ہے۔ ایک سال کے مختصر سے عرصے میں انتہائی ڈرامائی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ پاکستان نے ایک ساتھ امریکہ، روس اور بھارت کو پرے دھکیلا ہے۔

بھارتی وزیراعظم امریکہ سے گزشتہ ماہ کامیاب دورے کے بعد لوٹے ہیں۔ جہاں بھارت کو اقتصادی قوت تسلیم کیا گیا ہے۔ روس کے صدر پیوٹن بھارت کو فوجی قوت تسلیم کرتے ہوئے اپنے ساتھ ترغیبات کا ایک اہم پیکج لائے ہیں۔ بھارت کی میز پر ٹی-90 ایس جنگی ٹینک اور سکوئی 30 ایم کے آئی لڑاکا طیاروں کے منصوبے اور دوسرے آلات اور ٹیکنالوجی کی منتقلی کے منصوبے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس پاکستان کو چند پرانے ہیلی کاپٹر دیئے گئے۔

بھارت اور روس کے مابین تعلق ایسا ہے جو سرد جنگ کے دوران بھی قائم رہا۔ روس کے نزدیک بھارت بنیادی اہمیت کا حامل ملک ہے۔ کیونکہ روس سے سب سے زیادہ تعداد میں اسلحہ بھارت خریدتا ہے۔ روس پاکستان کی طرف اپنا جھکاؤ پیدا کرنے سے پہلے دو دفعہ سوچے گا۔ کیونکہ ایسی صورت میں روس کو بھارت کی مارکیٹ سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ علاوہ ازیں دونوں ممالک کو ایک جیسے سیاسی بحرانوں کا سامنا ہے۔ دونوں کو برگشتہ اسلامی برادری کی مخالفت کا سامنا ہے۔

کشمیری مجاہدین نے بھارت کی آدھی فوج کو کشمیر میں اُلجھا رکھا ہے۔

دوسری طرف روس کو چیچنیا کے مسلمان مجاہدین کی بغاوت کا سامنا ہے اور وہ چیچنیا میں بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔ اس لیے روس اور بھارت افغان طالبان کی وجہ سے پریشان ہیں جو وسط ایشیا کی ریاستوں کے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں۔

عالمی سطح پر دہشت گردی اور طالبان کے خلاف بڑے پیمانے پر عالمی رائے عامہ اکٹھی ہو رہی ہے اور اُن کی امداد اور حمایت کے ضمن میں پاکستان کو بھی ملوث کیا جا رہا ہے۔ اس طرح کی فضا بننے سے چیچن اور کشمیری عوام کے جائز اور حقیقی مصائب و آلام کی طرف سے توجہ ہٹتی جا رہی ہے اور اُن کے حقوق اور تحریکوں کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ بھارتی پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے روسی صدر پیوٹن نے بر ملا کہا: ''کشمیر، افغانستان اور روس کے شمال سمیت کسووہ سے لے کر فلپائن تک دہشت گردی میں ایک ہی طرح کے لوگ ملوث ہیں۔'' اس بیان کی بھارت میں بہت پذیرائی کی گئی اور اسے زبردست طریقے سے نمایاں کیا گیا۔ دونوں ملکوں نے مشترکہ طور پر دہشت گردی سے نمٹنے کے عزم کا اظہار بھی کیا ہے۔

اس صورت حال میں روس کے ساتھ گرم جوشی سے تعلقات بڑھانے کی کوشش ثمر آور ہونا ممکن نظر نہیں آتی۔ البتہ اس طرح پاکستان کو طالبان اور دہشت گردی کے خلاف خیالات پہنچانے کے لیے روس کو بہت اچھا موقع مل جائے گا۔

کیا اسلام آباد میں بیٹھے لوگ اس انتہائی سخت اور خطرناک صورتِ حال کا ادراک کر لیں گے؟ ایسا ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ فوجی حکومت اس امر پر قائل ہوئی بیٹھی ہے کہ حالات جتنے بھی دگرگوں اور خراب ہوں اس کے پاس ہر چیز کا جواب موجود ہے۔

لیکن پاکستانیوں کی اکثریت نوشتہ دیوار پڑھ چکی ہے۔ بڑی تعداد میں لوگ محفوظ پناہ گاہوں کے لیے ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں اور یہ جانے والے اپنے ساتھ اپنی دولت بھی لے جا رہے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ بارہ ماہ میں چار ارب ڈالر ملک سے باہر منتقل کیے گئے ہیں۔

اب جب کہ اسلام آباد کے لیے سیاسی اور اقتصادی آپشنز ختم ہوتے جا رہے ہیں، اس احساس کی شدید ضرورت ہے کہ اصل طاقت اور استحکام کسی نظام اقتدار سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کرپشن کے نام پر سیاسی مخالفین کو رگڑنے اور فوج کا پیٹ بھرنے کے لیے تاجروں کا استحصال کرنا ایک نہایت تباہ کن پالیسی ہے۔ وفاق، جمہوریت، غربت کے خاتمے جیسے تصورات کا دنیا میں ہر جگہ نام لیا گیا ہے۔ جبر اور اشتعال کی سیاست، ایک طاقت کو ایٹمی ہتھیاروں اور دوسری کو طالبان

سے خائف کرنے کی سیاست سے خوف پیدا کرنے اور حمایت کے حصول کے مقاصد پورے نہیں کیے جا سکتے۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ طالبان بھی پاکستان میں اپنے پرانے دوستوں سے تنگ آ چکے ہیں۔ وہ ایران کے ساتھ تجارتی راستوں اور متحدہ عرب امارات کے ساتھ ہوائی سفر کے امکانات کی تلاش میں ہیں۔

فوجی حکومت استحکام کی ٹھوس بنیادیں قائم کرنے کے لیے اُصولوں کو اپنا کر اِس صورت حال میں بہتری لا سکتی ہے۔ خوف اور دہشت منفی قوتیں ہیں، جن کے اثرات انہیں پھیلانے والوں کو ہی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں جب کہ مشترکہ مفاد اور اجتماعی فائدے کے مثبت اقدامات سے لوگ اور قومیں ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں۔

اشتعال انگیزی کی سیاست ترک کر کے پاکستان امن اور خوشحالی حاصل کر سکتا ہے۔

ڈینئیل پرل کا قتل

"وال سٹریٹ جرنل" کے صحافی ڈینئیل پرل کے قتل سے پاکستان کی سیاست میں ایک نہایت خطرناک مرحلے کا آغاز ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغانستان اور کشمیر سے پسپا ہونے والے عسکریّت پسند اب پاکستان میں خود کو از سرِ نو منظّم کر رہے ہیں۔ بعض بنیادی اداروں میں جغرافیائی، تاریخی اور نظریاتی ہمدردی کے باعث عسکریّت پسندوں کو تنظیم نو کے لیے اسلام آباد بہترین پناہ گاہ نظر آتی ہے۔ اسلامی عسکریّت پسندوں میں ایسے لوگ اور گروپ بھی موجود ہیں جنہوں نے افغانستان پر روسی قبضے کے خلاف جنگ کے دوران باہم اتحاد (گروہ) بنا لیے تھے۔ ایک سپر پاور کو شکست دینے کے بعد اُن کا دعویٰ ہے کہ وہ دوسری (اب واحد) سپر پاور کو بھی شکست سے دوچار کر سکتے ہیں۔ روس کے خلاف جنگ کے دوران انہوں نے جنگی نظم اور جنگی کارروائیوں میں جو تجربہ حاصل کیا، اُس کی بدولت انہیں گوریلا جنگ لڑنے کا بھی زبردست تجربہ ہو چکا ہے۔ ان عسکریّت پسندوں کی صفوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ، سائنس دان، ممکن ہے ان میں ایٹمی سائنسدان بھی ہوں، پاکستان کی یونیورسٹیوں کے عمدہ گریجویٹ اور مغربی دنیا کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم یافتہ افراد بھی شامل ہیں۔

شیخ عمر سعید جو ڈینئیل پرل کے اغوا میں سب سے بڑا مشتبہ ملزم ہے، ابتدائی تعلیم کے لیے باوقار ادارے ایچی سن کالج (لاہور) میں داخل ہوا، جو انگریزوں نے بھارتی ریاستوں کے شہزادوں کی تعلیم و تربیت کے لیے قائم کیا تھا۔ پھر وہ لندن کے عظیم ادارے "لندن سکول آف اکنامکس" میں داخل ہوا، لیکن اس نے جہاد کے لیے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ اُس نے جب یہ تسلیم کیا

کہ اُس نے ڈینیئل کو اغوا کیا ہے تو گویا وہ موت سے پنجہ آزما ہو رہا تھا۔ اُس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ تو پاکستان کو امریکہ کی غلامی سے بچانے کے لیے جنگ لڑ رہا ہے۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ اور متمول نئے عسکریّت پسند قانون کے نفاذ، فوجی اور انٹیلی جنس کے پس منظر کے حامل ہیں۔ انہوں نے غیر مسلموں کے خلاف جو جنگ شروع کر رکھی ہے، اس میں نہایت اعلیٰ جدیدّیت (اسلحہ وغیرہ کے اعتبار سے) شامل کر دی ہے۔ اگر ہارورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر سیموئیل ہینگٹن تہذیبوں کے تصادم کا ذکر کرتا ہے تو عسکریّت پسندوں کی کارروائیاں مسلمان اور غیر مسلم دنیاؤں کے درمیان تعلقات کو خوف و دہشت، غصہ اور مکافاتِ عمل کی پاداش کے ذریعے توڑ مروڑ کر رکھ دینے کے عمل میں سرعت پیدا کرنے پر قادر ہیں۔

ڈینیئل پرل کا سر قلم کیے جانے کی ویڈیو کیسٹ عین اُس وقت جاری کی گئی، جب مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یاد منا رہے تھے۔ اُن کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی محبت کا مظہر تھا۔ علامتی طور پر تو ڈینیئل پرل کو بھی نہایت بھیانک انداز میں جس طرح قتل کیا گیا، وہ عسکریّت پسندوں کے غیر مسلموں کے خلاف عزم کا اظہار ہے۔ اُس کی زبان سے کہلوایا گیا کہ وہ یہودی ہے، اُس کی ماں یہودی ہے، پھر اُسے ذبح کر دیا گیا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے ایک امریکی اور یہودی ہونے پر قتل کیا گیا جو مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلا رہے ہیں۔ ایسے لمحات میں، جیسا کہ مسلمان اکثر اس پر اصرار کریں گے، کسی فردِ واحد کے اقدام اور کسی کمیونٹی کے خلاف جذبات میں تمیز کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر نہایت خوفزدگی کے عالم میں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی عسکریّت پسندوں کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے مختلف مذہبی گروپوں کے درمیان جنگ اور نفرت پیدا کی جائے جو اہلِ کتاب کی یکساں روایات سے وابستہ ہیں۔

اس وقت مسلمان تعداد کے اعتبار سے، فوجی طور پر، مالیاتی اعتبار سے اور ٹیکنالوجی کی مناسبت سے، غیر مسلموں سے کافی کمزور ہیں۔ بہت سے لوگ ان شاندار ایام کو بڑی حسرت سے یاد کرتے ہیں جب عالمِ اسلام بہت زیادہ مضبوط و مستحکم تھا، مساوات اور توازن قائم کرنا، قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے عسکریّت پسندوں کے لیے آخری راستہ یہ ہے کہ وہ اپنے سے بڑی طاقتوں کے بالمقابل آ جائیں، انہیں اشتعال دلائیں کہ وہ اپنی بقا اور تحفظ کے لیے مسلمانوں پر ظلم و جبر کی مرتکب ہوں۔ اِن دنوں عالمِ اسلام میں ان اثرات و عواقب پر کوئی بحث مباحثہ نہیں ہوا، جو اسلامی عسکریّت پسندی کے نتیجہ میں اہلِ اسلام پر مرتب ہو سکتے ہیں۔

بیشتر مسلمانوں نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر (نیویارک) پر حملہ کی مذمت کی ہے اور اس امر کا بھی انہیں

بخوبی احساس ہے کہ امریکہ کو اپنی سلامتی اور تحفظ کی خاطر جوابی کارروائیاں کرنی چاہئیں۔ لیکن مشرق وسطیٰ میں جس طرح (مسلمانوں کی) ہلاکتیں ہو رہی ہیں، کشمیر میں جس طرح پسپائی اختیار کی گئی ہے، پاکستان، سنٹرل ایشیا اور افغانستان میں جس طرح غیر ملکی فوج موجود ہے، بعض دوسرے مسلم ممالک کو ''برائی'' قرار دیا جانا، جدوجہد آزادی اور دہشت گردی کے درمیان تمیز روا نہ رکھنا، اس سے عالم اسلام کی گلیوں میں عوامی موڈ بدل رہا ہے، پھر تہذیبوں کے درمیان مکالمہ بھی تو ابھی تک شروع نہیں ہو سکا۔ یہ وہ صورتِ احوال ہے جس میں تہذیبوں کے درمیان جنگ کے بیج موجود ہیں۔ پہلے ہی (اچھے تعلقات میں) رکاوٹیں درآ رہی ہیں، نسلی اختلافات بڑھ رہے ہیں اور اعتماد کی جگہ شکوک وشبہات نے لے لی ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر تباہ کن حملہ کے بعد عوام کے درمیان آزادانہ نقل وحرکت بند ہو گئی ہے۔ اگر عسکریّت پسندوں نے ڈینیئل پرل کے اغوا اور قتل کے ذریعے دہشت پھیلا کر پاکستان اور دیگر ملکوں کی معیشت سے غیر ملکی سرمایہ بھگا دیا ہے اور متاثرہ ممالک اقتصادی طور پر کمزور ہو گئے ہیں تو وہاں غربت آئے گی اور غربت مایوسی پھیلاتی ہے۔ چنانچہ اس مایوسی سے ہی وہ رویہ ظاہر ہوتا ہے، وہ فضا بنتی ہے، جس میں دہشت گردوں کو رضا کار بھرتی کرنے میں مدد ملتی ہے۔

ڈینیئل پرل کے اغوا اور قتل میں مختلف سطحوں کے پیغامات مضمر ہیں:

پہلا پیغام جو عسکریّت پسندوں نے دیا ہے، وہ (پاکستان کی) فوجی حکومت کی کمزوری ہے۔ یہ پیغام عسکریّت پسندوں کے خلاف 16 جنوری کو نام نہاد کریک ڈاؤن (سخت کارروائی) کے بعد بھیجا گیا ہے۔ شیخ عمر کو گرفتار نہیں کیا گیا، حالانکہ وہ پانچ مغربی یرغمالیوں کے قتل میں بھی مشتبہ تھا اور یہ بھی شبہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ اس نے ہی طیارہ اغوا کرنے والے عطا کو ایک لاکھ ڈالر بھجوائے تھے تاکہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو تباہ کرنے کا عمل انجام دیا جا سکے۔

دوسرے اسلام آباد میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ پرل کا اغوا بھارت کی کارروائی ہے۔ یہ اقدام جس کا مقصد امریکہ اور بھارت کے تعلقات میں گڑبڑ پیدا کرنا تھا، ناکام ہو گیا، کیونکہ امریکہ نے یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

تیسرے ڈینی کا اغوا جنرل مشرف کے دورۂ امریکہ کے قریب ہوا، جس کا مقصد امریکہ کے جغرافیائی اور تزویراتی مفادات میں جنرل پرویز مشرف کی دلچسپی کی اہمیت کا اظہار تھا۔

چوتھے، نامعلوم وجوہ کی بنا پر، مشرف اور اُن کے آدمیوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ ڈینیئل زندہ ہے، حالانکہ سب سے مشتبہ ملزم کہہ چکا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔

ڈینیئل پرل کا اغوا اور قتل دراصل وفاقی اور صوبائی کابینہ کی تشکیل و ترتیب نو میں ناکامی تھی، یہ وزارتیں اس وقت قائم کی گئی تھیں، جب تشدد پسند 1999ء میں جنرل مشرف کو برسر اقتدار لائے تھے۔ ''جیش محمد''، تنظیم جس پر امریکی صحافی کے اغوا کا شبہ ہے، جنوری 2000ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس سے ایک دلچسپ صورتِ احوال پیدا ہو چکی ہے۔ جنرل مشرف بجا طور پر شور مچاتے رہے ہیں جب کہ عسکریّت پسندوں کے حامی اُن کی حکومت میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ شیخ عمر کی گرفتاری نامعلوم وجوہ کی بنا پر پانچ روز تک خفیہ رکھی گئی۔ اس کی گرفتاری کا اعلان اسی روز کیا گیا، جس روز جنرل مشرف واشنگٹن میں وارد ہوئے۔

پرل کو اس وقت اغوا کیا گیا جب وہ ایک اجلاس میں جا رہا تھا، جس کا انتظام ملٹری انٹیلی جنس کے ایک سابق عہدیدار نے کیا تھا، جو بن لادن کی خفیہ ایجنسی اور ایم آئی میں بھی اہم کردار ادا کرتا رہا تھا اور جو 90-1988ء میں پاکستان میں جمہوریت کو عدم استحکام سے دوچار کرنے میں ملوث رہ چکی تھی۔ پرل کے اغوا میں افغانستان، کشمیر، آئی ایس آئی، جمہوریت کا عدم استحکام اور اسلامی عسکریّت پسندی، سبھی کچھ غلط سلط ہو گیا ہے۔ آئی ایس آئی، اور ایم آئی ان سے بخوبی آگاہ تھی۔ جب ملٹری انٹیلی جنس میں عسکریّت پسندی در آئی اور پھر عام ہو گئی تو سوویت روس کے قبضہ کے خلاف جنگ کے سرپرست غیر ریاستی کھلاڑیوں میں گھل مل گئے۔ آج وہ تجارتی ادارے اور این جی اوز (غیر سرکاری تنظیمیں) چلا رہے ہیں۔ اب وہ ایک ایسے مافیا کی طرح کام کر رہے ہیں جو حکومت میں اپنے حامیوں کے ذریعے حکومت کی ڈوریاں ہلاتا رہتا ہے۔

مشرف اور اُن کے آدمیوں نے جب اقتدار پر قبضہ کیا، تو انہوں نے عسکریّت پسندی کو کچل دینے کا وعدہ کیا، لیکن عسکریّت پسندی تو عروج پر تھی۔ جنوری (2002ء) میں مشرف نے یہ تسلیم کیا کہ حکومت کی اتھارٹی گویا ختم ہو چکی ہے۔ اسلام آباد جو پانچ سال قبل ایک اُبھرتی ہوئی مارکیٹ تھا، اب ماہرین اور سکالر اسے ایک ایسی ریاست قرار دے رہے ہیں جو درہم برہم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ فی کس آمدنی کم ہونے سے غربت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ترقی کی شرح بڑھ نہیں رہی اور حکومت کی آمدنی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ملک کو اندرونی اور بیرونی خطرات اور دھمکیوں کا سامنا ہے۔

پاکستان کا تجارتی شہر کراچی، جس کی آبادی ایک کروڑ 40 لاکھ تک بڑھ چکی ہے، جنگی لیڈروں کے رحم و کرم پر ہے۔ مختلف نسلی گروپ (ایم کیو ایم، حقیقی اور کئی مذہبی گروہ) شہر کے مختلف حصوں پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ کرایہ کے قاتل عام مل جاتے ہیں۔ نسلی فسادات میں پہلے بھی ہزاروں افراد جان کی بازی ہار چکے ہیں۔ ایک وزیراعظم کا بھائی (مرتضٰی بھٹو)، ایک وزیراعلیٰ اور

ایک وزیر داخلہ کو اس وقت قتل کیا گیا، جب وہ ان اہم عہدوں پر فائز تھے۔ پرل کے قاتلوں نے پاکستان کے اقتدار اعلیٰ کے تحفظ کے نام پر ایک گروپ (الصاعقہ) کے نام سے پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقہ میں قائم کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بن لادن کا گروپ بھی مصر کے الصاعقہ بریگیڈ کے ایک کرنل کی ہدایات کے تحت چلایا جا رہا ہے۔ جن دنوں یہ گروپ قائم کیے جا رہے تھے، کراچی پولیس کو ہوائی اڈے کے قریب سے پانچ راکٹ ملے تھے۔ اسلامی عسکریت پسند تو دنیا کو عدم استحکام سے دوچار کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں، انہیں توقع ہے کہ وہ طالبان کی طرح کا اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اب اُن کا زیادہ زور ''ملائیت'' پر نہیں، بلکہ ''قوم پرستی'' پر ہے۔ انہیں اس کا موقع نہیں دیا جانا چاہیے وگرنہ وہ تہذیبوں کے درمیان تصادم پیدا کر کے آج کی دنیا کو تباہی سے دوچار کر دیں گے۔

ترقی پذیر ممالک کے لیے کامیابی کا راستہ

اکیسویں صدی میں جنگ کا شور افلاس زدہ اور پس ماندہ دنیا کی چیخوں پر غالب آنے کی افسوسناک خبر سناتا ہے۔ بنی نوع انسان کے لیے لازمی ہے کہ وہ بھوکے، بیروزگار اور غیر تعلیم یافتہ افراد کی آوازوں پر لبیک کہے۔ اس طرح کا ایک موقع اس برس جوہانس برگ میں اقوام متحدہ کی Sustainable Development Conference کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ فلسفی حضرات نے اکثر و بیشتر سیاسی اور اقتصادی حقوق کے معاملے کو جدا جدا رکھا لیکن کمیونزم کے بانی کارل مارکس وہ فلسفی تھے جنھوں نے سیاسی قوت کو اقتصادی آزادی کے ساتھ منسلک کیا۔ اُن کی مہلک ترین غلطی یہ تھی کہ اُنہوں نے یہ تصور فرد کی انفرادی آزادی کی قیمت پر پیش کیا۔ پیٹ کی بھوک کی طرح روح کی بھوک بھی اپنی غذا طلب کرتی ہے۔ اکیسویں صدی میں درپیش چیلنج یہ ہے کہ آزادی اور آزاد مارکیٹس کو نئے ورلڈ آرڈر کے ستونوں کے طور پر شناخت کرنے سے ماوراء ہُوا جائے۔

فرد کی شخصی آزادی کی شناخت کے لیے سیاسی قوت اور اقتصادی سلامتی لازمی خصوصیات ہیں۔ ایسی دانشورانہ سوچ پروان چڑھ رہی ہے جو غربت کو انفرادی قوت و طاقت کے خاتمے سے مربوط کرتی ہے۔ انفرادی قوت کو فروغ دینے سے قبل لازمی ہے کہ جنس کی سطح پر برابری برتی جائے۔ قومی بحث میں بہت ہی کم خواتین حصہ لیتی ہیں اور وہ بھی کبھی کبھی۔

فرد کی آزادی کے لیے انتخابات بہترین اور اہم ذریعہ ہیں۔ طاقت بہم پہنچانے کا عمل انتخابات سے شروع ہوتا ہے۔ انتخابات کے بعد حقوق اور مواقع کی فراہمی کے ذریعے یہ عمل

پروان چڑھتا ہے۔ ایسے حقوق اور مواقع کی فراہمی کے ذریعے ہی غربت کے چکر کو پیچھے کی جانب موڑا جاسکتا ہے۔

پاکستان میں خواتین، مزدوروں، اقلیتوں، چھوٹے کسانوں اور نوجوانوں کو ووٹ ڈالنے چاہئیں۔ شفاف انتخابات کے ذریعے حکومت کو منتخب کرنے کے عمل میں اُن کی آواز بہت طاقت ور ہوتی ہے۔

اس کے باوجود جن حکومتوں کو منتخب کرتے ہیں وہ مفاد پرست طبقوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں۔ حب الوطنی اور جنگ جُو یانہ نعروں میں لپٹے سیاسی سلامتی کے تسکین ناپذیر مطالبات اکثر و بیشتر اقتصادی سلامتی کی قیمت پر سامنے آتے ہیں۔ استدلال میں توازن کی خاطر بھوک، بیروزگاری اور تعلیم کی کمی کے خلاف جنگ میں غیر مراعات یافتہ طبقات کی شمولیت ضروری ہے۔

ایک طرف وہ بچے ہیں جو بھوک سے نڈھال ہیں، جن کے بال بکھرے ہوئے اور کپڑے چیتھڑے بن چکے ہیں، جن کے پاؤں میں جوتی نہیں جس کی وجہ سے اُن پر کیچڑ لگا ہوتا ہے اور وہ خوراک کے لیے چلاّ رہے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف وہ بچے ہیں جو Pizza Huts اور MacDonald جاتے ہیں۔ یہ کیسا تضاد ہے؟ اس منظر کو ہم اس طرح نظر انداز کرتے ہیں کہ اپنے ضمیر کی آواز کو خاموش کر دیتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں سامنے آنے والی تیز تر تبدیلیاں اور عالمگیریت کی قوتیں غربت کے اس بحران کو مزید گہرا کرنے کی خبر سناتی ہیں جو پہلے ہی بہت زیادہ پروان چڑھ چکا ہے۔

1995ء میں کوپن ہیگن میں عالمی سماجی کانفرنس میں دنیا بھر کے ممالک سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنے قومی بجٹ کا 20 فیصد سماجی خدمات کے لیے وقف کریں۔ سماجی خدمات میں خوراک، سلامتی، صحت کی سہولتیں اور بہتر معیار زندگی شامل ہیں۔

بہت سے ممالک نے فوری طور پر وعدے کر لیے لیکن کچھ نے وقت کے ساتھ ساتھ اُن پر عمل درآمد کرنے کا وعدہ کیا۔ بطور نتیجہ دنیا کی ایک بہت بڑی آبادی روزانہ ایک ڈالر سے کم پر گزارہ کر رہی ہے۔ دنیا کے پانچ فیصد طبقات جو امیر ہیں وسائل کا 86 فیصد استعمال کرتے ہیں جب کہ 95 فیصد آبادی باقی کے 14 فیصد پر گزارہ کرتی ہے۔

ایک اور چیلنج عالمی خطرات کا ہے۔ ان خطرات میں ماحول کو پہنچنے والا نقصان اور موسم کے تسلسل میں تبدیلی ہے جس سے زراعت کے مسلمہ طریقہ کار کے خاتمے کا خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ جنگوں میں بموں کا استعمال اور ایٹمی دھماکے ماحول کے خطرے میں اضافہ کر رہے ہیں۔

وہ ممالک جہاں آبادی کی اکثریت غربت کا شکار ہے اُن کے لیے اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ وہ مستقبل کی بہتر دنیا کے استدلال اور بحث میں یک جا ہو جائیں۔

غریب آبادی ایک بہتر آغاز کی مستحق ہے۔ اس مقصد کے حصول کا ایک طریقہ کار یہ ہے کہ قرضوں کے حجم میں کمی کی جائے۔ وہ ممالک جہاں نمائندہ حکومتیں قائم ہوں، ان ممالک کے قرضوں میں کمی انعام کے طور پر کی جائے۔ استبدادی قوتوں کے ہاتھ میں مالیاتی وسائل دینے کی کوئی منطق نہیں کہ وہ اس رقم کو عسکری مصارف پر خرچ کر دیں، یا اس رقم کو کرپشن، یا بے فائدہ منصوبوں پر خرچ کریں۔ آج ہم اس لیے مصائب کا شکار ہیں کہ سرد جنگ کے دوران سپر پاورز کی منافقت نے استعماری قوتوں کو اجازت دی کہ وہ اپنے لوگوں کا استحصال کریں۔ اس کی ایک مثال پاکستان کے قرضوں کی ری شیڈولنگ ہے۔ ایک عسکری آمر کو مالیاتی سہولت فراہم کی گئی ہے، وہ بچے جو ابھی رحم مادر میں ہیں اُن پر قرضوں کا بوجھ لاد دیا گیا۔ ان قرضوں کا مجموعی سود اس وقت ادا کرنا ہوگا جب وہ جوان ہوں گے۔

بھوک اور غربت کے خلاف جنگ جیتنے کی دوسری بنیادی ضرورت انسانیت دوست سیاسی ڈھانچہ تشکیل دینا ہے۔ اس طرح کے سیاسی ڈھانچوں کی تشکیل کا مقصد داخلی طور پر سیاسی اور بیرونی سطح پر خارجی اختلاف میں کمی کرنا ہے۔ یہ پرانی کہاوت درست ہے کہ امن خوشحالی کی طرف لے جاتا ہے۔ روانڈا سے لے کر صومالیہ، سوڈان، بوسنیا اور افغانستان میں ہونے والی قتل و غارت گری اس بات کی وضاحت کرتی نظر آتی ہے کہ یہ ممالک تعمیر نو اور بحالی کے پروگرام سے نبرد آزما ہونے کے لیے مناسب وسائل نہیں رکھتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوا ہے کہ خود لگائے جانے والے زخموں کے لیے عمل انگیز کے طور پر خارجی مداخلت کی ضرورت رہی۔

اس صورتِ حال سے پریشان کن نتیجہ سامنے آتا ہے۔ کیا نو آبادیت ایسے ماحول میں جنم لیتی ہے جہاں ریاست ناکامی کا شکار ہو جاتی ہے؟ حکومتوں کا عرصہ زندگی دن اور رات کی تبدیلی میں لپٹا ہوا ہے۔ اس عرصے کو ایک سمت، یا دوسری سمت میں استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اگر اس عرصے کو تمام سمتوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا جائے تو توانائی کا ضیاع ہوتا ہے اور مقصد آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ قیادت یہ ہے کہ حکومت کاری کا مقصد تلاش کیا جائے بجائے اس کے کہ انتقام کی خالی خوشی کے سامنے مغلوب ہوا جائے۔

غریب ممالک، جو داخلی و خارجی تنازعات کے ہاتھوں تباہ ہو چکے ہیں، وقت، مقاصد اور انسانی زندگیوں کا ضیاع کر رہے ہیں۔ ایسے میں عالمی سطح پر نئے رجحانات سامنے آ رہے ہیں۔

جس نئے تصور پر بحث ہورہی ہے وہ ہے اقوام متحدہ کی اقتصادی سلامتی کونسل کی تخلیق۔ کہا جارہا ہے کہ یہ کونسل اقوام متحدہ، عالمی بینک اور آئی ایم ایف جیسی ایجنسیوں اور علاقائی بینکوں کے درمیان رابطے کا کام دے گی۔

ایک عالمی ڈھانچہ تشکیل دیا جارہا ہے جو ممالک اس ڈھانچے کی نوعیت اور مقصد کو سمجھ لیں گے انہیں فائدہ حاصل ہوگا۔ ترقی پذیر ممالک کے لیے اب وقت ہے کہ وہ بیدار ہوجائیں اور اپنے تعلیمی اداروں کے نصاب پر نظر ثانی کریں۔ نوجوانوں کو نئے عالمی ڈھانچے کے مطابق نئی زبان میں تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔

مثال کے طور پر اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کمیشن تشکیل دیا ہے۔ وہ ادارے جہاں قانون کی تعلیم دی جاتی ہے اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک کلاس انسانی حقوق کے قوانین پڑھانے کے لیے رکھیں۔ اب انہیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ یہ نیا کمیشن انہیں، ان کے ممالک اور ان کے طبقات کو طاقت اور قوت فراہم کرسکتا ہے۔

سماج کا واسطہ جب قومی قوانین سے پڑتا ہے تو وہ پیچیدہ صورت حال اختیار کرجاتا ہے۔ بہت ہی کم شہری اپنے حقوق سے فائدہ اُٹھانا جانتے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان کی بہت ساری خواتین اس بارے میں بے خبر ہیں کہ گھریلو تشدد ایک غیر قانونی ایکٹ ہے۔

کسی قانون کو پاس کرنا علیحدہ بات ہے جب کہ اس قانون میں دیئے گئے قوانین کی تشہیر علیحدہ معاملہ ہے۔ بین الاقوامی اداروں کو قیام، فوائد اور چیلنجز کو پیش کرنا ہے۔ ان اداروں کے قیام سے ریاست اور بین الاقوامی شہریوں کے لیے نئے قوانین تخلیق ہوتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں تعلیمی پروگراموں پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان نئے بین الاقوامی قوانین، حقوق اور ذمہ داریوں کے بارے میں آگاہی حاصل کی جاسکے۔

انفرادی حقوق اور قومی ترقی کی بہترین ضمانت وہ نئی نسل ہے جو جدید دور کے علوم سے آراستہ ہو۔ یہ قومی ترقی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب شخصی آزادی کی تعریف سیاسی آزادی اور اقتصادی سلامتی کے طور پر کی جاتی ہو۔

پاک بھارت مذاکرات

جنرل مشرف کے دورہ بھارت سے میرے ذہن میں کسی اور ہوائی اڈے کا خاکہ آ رہا ہے۔ مجھے بارہ سال پہلے کے دسمبر کی سردیوں کا وہ دن یاد آیا رہا ہے جب راجیو گاندھی میرے دورِحکومت میں اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر اُترے تھے اور اسی پاکستانی فوج نے اُن کو شادیانے سنا کر سلامی دی تھی۔ پاک بھارت کشیدگی دور کرنے کی بنیاد میں نے رکھی تھی اور یہ تو میری طرف سے ایک اخلاقی اور شخصی برّیت ہے جس کی بنیاد پر میں نے اس امر پر نظر رکھی کہ ایک آرمی چیف ایک بڑے ہمسائے کے ساتھ کشیدگی دور کرنے کے لیے، بارہ سال تاخیر کے بعد، میرے ہی نقشِ قدم پر چلنے کی دانش مندی کا اظہار کر رہا ہے۔

پھر میں اس قومی نقصان کو بھی محسوس کر رہی ہوں کہ بارہ سال کا عرصہ گزر گیا اور ہزاروں افراد کی جانیں ضائع ہوگئیں۔ اسلام آباد نے پہلے ملاقات کی بھیک مانگی تھی کہ کسی وقت ہی ہو جائے، کسی جگہ پر ہی ہو جائے جب کہ ایک شاندار موقع بھی دستیاب تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔

مشرف کی یہ ملاقات تو ایک متنازعہ ملاقات ہے۔ جس کے متنازعہ ہونے کی تین وجوہات ہیں:

1- مشرف کے پاس اپنے عہدہ کے جائز ہونے کا آئینی جواز موجود نہیں کیونکہ وہ منتخب صدر نہیں۔
2- ہماری قومی تاریخ اس کو متنازعہ ثابت کرتی ہے۔
3- کشمیر کی تاریخ بھی اسے متنازعہ بناتی ہے۔

فوجی تاریخ یہ کہتی ہے کہ جس فوج کی مشرف قیادت کر رہے ہیں وہی اُن کا پانسہ پلٹ کر اس

کام کی دلیل بھی پیدا کرسکتی ہے۔ مزید برآں مشرف کے پاس وہ اخلاقی و سیاسی اتھارٹی نہیں ہے جس کے ذریعے عوام اس کے شریک عمل ہوں۔ فوجی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ہر فوجی ڈکٹیٹر نو وار پیکٹ (No war pact) کا کٹھن کام کرگزرنا چاہتا ہے۔ لیکن بھارت انکار کرتا رہا۔ مشرف بھی انہیں جرنیلوں میں سے ایک ہیں۔

اور پھر کشمیر کی حالیہ تاریخ بھی سامنے ہے اس میں مشرف کارگل کے بحران کے معمار تھے اور پاکستانی سپاہیوں اور مسلح کشمیریوں نے اپنی جانیں دے دیں اور مشرف کے لیے لیڈی میک بیتھ کی طرح یہ مشکل ہوگیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ان مرنے والوں کے خون کے دھبے دھوسکیں۔

اب جب مشرف اپنے 70 افراد پر مشتمل وفد کو ساتھ لے کر آگرہ پہنچیں گے تو اُن کے ساتھ تین ہزار پاکستانی سپاہیوں کی روحیں بھی پرواز کررہی ہوں گی جن کو کارگل کی جنگ میں خفیہ دفن کر دیا گیا تھا۔ یہ وہاں اُن مرنے والے سپاہیوں کے چہرے بھی دیکھیں گے جو اس وقت کارگل کی برفانی چوٹیوں پر فاقوں سے مرگئے جب پیچھے سے سپلائی لائن بند کردی گئی تھی۔ وہیں آگرہ میں اُن کو اُن لاشوں کے چہرے بھی نظر آئیں گے جن کو اس وقت پسپا ہونے کا حکم دے دیا گیا جب امریکہ نے پاکستان کو حکم دیا تھا کہ پاکستان اپنی فوجیں یک طرفہ طور پر واپس بلا لے۔ کیا مشرف ان تذلیلوں کے معاوضوں کی صورت میں آج سے پہلے اُن سپاہیوں کو کچھ دے کر نہیں آسکتے تھے۔

یہ ساری شہادتیں کس مقصد کے لیے ہوئی تھیں؟ کارگل آپریشن کا مقصد کیا تھا؟ اس آپریشن میں یک طرفہ پسپائی کا مقصد کیا تھا؟ اب اگر دہلی میں بغل گیر ہی ہونا تھا تو پھر دو سال پہلے واجپائی کو لاہور میں سلیوٹ مارنے سے انکار کرنے کا مطلب کیا تھا۔

کوئی نئی منتخب حکومت ہوتی تو کارگل کے بوجھ کے دباؤ سے آزاد ہوکر بات کرتی۔ اس وجہ سے ہم یہ دلیل دیتے ہیں کہ امن قائم کرنے کا فریضہ ایک منتخب نمائندہ حکومت پر چھوڑ دیا جائے۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ مشرف کے لیے صرف یہی بہتر ہے کہ وہ اپنی توجہ صرف جمہوریہ بنانے پر مرکوز کرے لیکن ان کو واجپائی سے معاملہ بندی کرنے کا انتخاب اپنی اپوزیشن سے معاملات نمٹانے سے بہتر لگتا ہے۔

مشرف کے دورہ پر جو کوئی مذاکرہ ہو وہ اس شخص کے اُن ارادوں پر ہی مرکوز ہوگا جن سے اُنہوں نے آگرہ جانے کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ دھیان تو اُن کا اس رہائش پذیری پر ہوگا جو ایک شہنشاہ کے عشق میں بنائے ہوئے اس تاج محل میں ہوگی جو اس نے اپنی ملکہ کے لیے بنایا تھا۔ دہلی کو پوری اُمید ہے کہ یہ نظارہ دو ملکوں کے درمیان ایک نئے رومانس کو روحانی تقویت دے گا۔ اس

اُمید کی پکی بنیاد کیا ہے؟ بس دہلی یہ سمجھتا ہے کہ ایک ڈیموکریٹ کے بجائے ایک ڈکٹیٹر سے زیادہ کچھ نچوڑا جاسکتا ہے۔

پاکستان شاید یہ یقین رکھتا ہو کہ امن کے لیے پیش قدمی کرنے والے جمہوری لیڈروں نے جو قدم بڑھائے تھے وہی آگے اُٹھائے جائیں گے لیکن دہلی میں تو کچھ اور دلائل سنائی دیتے ہیں۔ دہلی والے ضیاء الحق کو یاد کرتے ہیں جس نے سیاچین کی چوکیاں دینے کے نقصان کا دفاع یہ کہہ کر کیا تھا کہ وہ تو ایک ایسی برفانی زمین ہے جہاں کوئی پھول نہیں کھلتا۔ جہاں گھاس بھی نہیں اُگتی۔

واجپائی تو مشرف سے گفت وشنید میں کچھ بھی ضائع نہیں کریں گے جنہوں نے خود ہی ایک پلیٹ فارم سے اُن کو صدا دی تھی کہ بس ملاقات کا وقت دے دو، چاہے کبھی بھی دے دو، خواہ کہیں بھی دے دو۔

پس واجپائی اُن سے بہت کچھ حاصل کرلیں گے، کئی کچھ لے لیں گے۔ چائے اور پیسٹریوں سے خاطر تواضع کر کے اور اُن کو اُن کا پرانا گھر دکھا کے اور کشمیر کے بارے میں گفتگو میں وقفے ڈال ڈال کے۔ واجپائی تو کارگل کے اس معمار کو اپنی شرائط پر اسی کی چوکھٹ پر چھوڑ کر جاتے ہوئے اپنے خلاف لگے ہوئے بہت سے الزامات سے بری ہوجائیں گے۔

اب ذرا دیکھیں کہ مشرف خود کیا ہیں؟

ان کے دورہ بھارت کے حوالے سے چار وضاحتیں ذہن میں آتی ہیں:

1- پہلی یہ کہ مشرف نے نیا جنم اس دن لیا جن دن نواز حکومت سے اقتدار چھینا۔ اس سے پہلے وہ ایک کمانڈر تھے جنہوں نے بھارتی دشمن کو سیلوٹ مارنے سے انکار کیا تھا اور کارگل میں انڈیا کے اہم ہونے کو سامنے لانے کو ماسٹر مائنڈ (Master-mind) کیا اور جس دن اقتدار میں آئے اس دن ایک تتلی کی طرح امن کے سپاہی بن گئے تا کہ کرائمیلس کی طرح امن کا نوبل پرائز لے لیں۔ اس از سرِ نو جنم کے نظریئے (Re-birth Theory) کی بنیاد یہ ہے کہ مشرف ایک فوجی اسٹیبلشمنٹ اور مذہبی پارٹیوں کی پیداوار ہیں۔ ابھی تو ہم دیکھیں گے کہ کارگل کی چوٹیاں جیتنے اور پھر بھارتی فوج کے گھیرے میں پھانسنے کی اصل واردات کیا ہے۔

2- دوسری وضاحت یہ ہے کہ مشرف کا دورہ بھارت کارگل والی لائن کا ہی اگلا قدم ہے جس کا مطلب ہے دشمن کو بےخبری میں گرفت میں لے لینے کی گیم۔

3- تیسری یہ ہے مشرف اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے انٹرنیشنل منظوریاں لے رہے ہیں

کیونکہ ریت گھڑی کی ساعت کے ذرے گرتے جا رہے ہیں اور بھارت کا دورہ بھی انہی منظوریوں کے لیے چلی جانے والی ایک چال ہے جس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میں ہی تو ایک ہوں جس کے ساتھ بھارت کاروبار چلا سکتا ہے۔

4- چوتھی یہ کہ شمال میں طالبان کی حکومت ہے جس پر اقوام متحدہ نے بھی پابندیاں لگا رکھی ہیں اور اس کی حکمرانی کو شہہ دینے کا ذمہ پاکستان پر ڈالتا ہے اور اسی پر عالمی دباؤ ہے کہ طالبان کی حاکمیت ختم ہو۔ اس لیے مشرف بھارت کے ساتھ مذاکرات کر کے یہ امیج بنانا چاہتے ہیں کہ وہ مذہبی جنونی نہیں بلکہ پاک بھارت مصالحت کا کوتوال ہے۔

پریس والے غیر تحریری سٹے لگاتے رہے کہ یہ واجپائی مشرف گٹھ جوڑ ہے لیکن اصل بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ پاک بھارت کشیدگی ختم کرنے کے لیے جو معاہدے پیپلز پارٹی نے کیے تھے انہی کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ مثلاً:

1- ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنا۔
2- ہمارے ایٹمی اُمور پر بین الاقوامی ہیجان کو دور کرنا۔
3- کارگل میں فوجی پھیلاؤ پر غور کرنا۔
4- باہمی تجارت میں توسیع جو سارک کانفرنس میں 1988ء میں طے ہوئی تھی۔
5- ایران سے انڈیا تک تیل کی پائپ لائن کو پاکستان سے گزار کر لے جانا۔

مشرف کے دورہ سے کوئی مسئلہ کشمیر حل نہیں ہوگا اور نہ کوئی گڈ فرائی ڈے جیسی آتش بازی چلے گی۔ بس ایک سلسلہ وار مذاکرات کا آغاز ہو جائے گا۔ مشرف ایک کمزور ترین پوزیشن میں دورے پر گئے ہیں کیونکہ اُنہوں نے دس سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں نہیں لیا اور اُن کی کوئی مالیاتی حرکت پذیری بھی موجود نہیں، اس لیے اُن کا دورہ کئی مسائل میں پھنس جائے گا۔

ذوالفقار علی بھٹو

پاکستان میں جمہوریت کے پیش رو!

پاکستان کو معتدل ملک بنانے والے ذوالفقار علی بھٹو نے تاریخ میں اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اُن کے کارناموں میں 1973ء کا آئین، 1972ء کا شملہ سمجھوتہ، جس کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے درمیان سب سے لمبے عرصے کے لیے امن قائم رہا، ایک جمہوری معاشرہ کی تعمیر کے لیے سماجی تبدیلیاں، غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی، نیوکلیر پروگرام اور ملک میں سماجی، معاشی اور فوجی تعمیر و ترقی کا تانا بانا بننا شامل ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو انتہائی اعلیٰ درجہ کے دانشور تھے۔ وہ ایک دانشور، ایک مصنف اور ایک مقرر تھے۔ وہ قابل اور انتہائی غور و خوض کرنے والے شخص تھے۔ ایمان داری، صاف بات کہنا اور اپنے وعدے کو پورا کرنا اُن کی خصوصیات تھیں، وہ اصولاً غریبوں اور کچلے ہوئے عوام کے دوست تھے۔ وہ ایک عوامی آدمی تھے، جنہیں کسی کا خوف نہیں تھا، سوائے خدائے بزرگ و برتر کے۔ وہ اس قدر باہمت تھے کہ اُنھوں نے اپنے نظریات کے لیے موت کو گلے لگا لیا۔ اُن کے نظریات میں سب سے بڑا نظریہ آزادی کا نظریہ تھا جو وہ بنی نوع انسان کے لیے چاہتے تھے۔ اُن کے دورِ حکومت میں پاکستان نے افریقی قوموں کی ہر طرح سے مدد کی جو اس وقت نسل پرستی کے شکار تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو ایک مسلمان قوم پرست تھے۔ بہت سے لوگ اسی وجہ سے انہیں ایک پکا مسلمان کہتے ہیں۔ وہ ایک واحد مسلم اُمہ پر یقین رکھتے تھے، جس کی ایک ہی فوج یورپ کے

ساحلوں سے لے کر افریقہ اور ایشیا کے ریگزاروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک معتدل شخص تھے اور قوم پرستی اُن کی نظر میں اتحاد سے تعبیر تھی، جس میں انتہا پسندی کا راستہ بند تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ہر مسلمان کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔ وہ تیسری دنیا کے لیڈر تھے، جنہوں نے نہایت بے باکی سے نسل پرستی اور استعماریت کے خلاف بات کی۔ اُن کی تقریروں سے لوگ سحر زدہ ہو جاتے تھے، اُن کی آواز لوگوں کے دلوں کی گہرائی تک پہنچ جاتی تھی۔ اُن کی باتوں میں شاعری اور جذبہ ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود لوگ اُن کی باتوں سے اتنے متاثر ہوتے تھے کہ آج تک لوگوں کے دلوں میں وہ باتیں نقش ہیں۔ اُن کی یادداشت بلا کی تھی، وہ نام، واقعات اور مقامات یاد رکھتے تھے، جس کی وجہ سے لوگ حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔ وہ بات چیت کی تفصیل تک یاد رکھتے تھے، انہیں تاریخ ازبر یاد تھی اور اسی سے اُنہوں نے رہنمائی کا سبق سیکھا تھا۔ وہ لاڑکانہ میں پیدا ہوئے جو صوفیاء کی سرزمین ہے۔ وہ غریبوں سے محبت کرتے تھے اور اُنہوں نے اپنی زندگی غریبوں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔

اُنہوں نے بلاخوف قومی آزادی کی حمایت کی، جب 1973ء میں مشرقِ وسطیٰ میں جنگ چھڑ گئی تو مسلمان ملکوں کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اُنہوں نے پاکستانی فوجیں بھیجیں، جن میں شام کی گولان کی پہاڑیوں کی حفاظت بھی شامل تھی۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل کی مدد سے اُنہوں نے دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد کی۔ اس کانفرنس میں فلسطین کے مسئلہ کو مسلمانوں کا مسئلہ قرار دیا گیا، جس کے بعد بالآخر مشرق وسطیٰ میں امن کی بات چیت شروع ہوئی۔ قائدعوام کی پچاس سالہ زندگی بین الاقوامی، علاقائی اور ملکی خدمات سے بھرپور ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اُنہوں نے عوام کو جمہوریت سے روشناس کرایا اور اُن کے دلوں میں جمہوریت کی شمع روشن کی۔ اُنہوں نے عوام کو جمہوریت کے نظریہ سے، جو طاقت اور اختیار کا سب سے بڑا سرچشمہ، روشناس کرایا۔ اُنہوں نے عوام کو بااختیار بنانے، ڈکٹیٹر شپ کے خلاف جدوجہد اور ملک میں فوجی آمریت ختم کرنے کی مہم کی قیادت کی۔ اُنہوں نے غاصبوں کی مخالفت کی اور بندوق کی مدد سے حکومت کرنے والوں کے سامنے ڈٹ گئے۔ اُنہوں نے ہاریوں اور کسانوں کو، مزدوروں کو، طالب علموں کو، خواتین اور معاشرے کے دیگر کچلے ہوئے طبقات کو اُن کی اہمیت اور اُن کے حقوق کا احساس دلایا کیونکہ یہی احساس عوام کو اُن کی زندگی بہتر کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کو جمہوریت اور جمہوری اقدار سے نہایت لگاؤ تھا اور بالآخر اُنہوں نے اپنی

زندگی آزادی کے لیے دے دی۔ 1969ء میں جب پاکستانی عوام ایوب خان کی آمریت ختم کرنے کے لیے جدوجہد کررہے تھے، اُن کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں مقدمہ کی سماعت ہورہی تھی۔ اس موقع پر عدالت میں اُنہوں نے عوام کے جمہوری حقوق کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ جمہوریت تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہے، جمہوریت بہار کے پھولوں کی خوشبو ہے، یہ آزادی کا نغمہ ہے اور ہر احساس سے بڑھ کر ہے بلکہ یہ احساس سے ماسوا ہے کیونکہ جمہوریت بنیادی حق ہے۔ آزاد پریس، تنظیموں سے تعلق رکھنے کی آزادی، عدلیہ کی آزادی، قانون ساز اداروں کی آزادی، بااختیار ہونے کی آزادی جمہوریت ہے، یہ وہ آزادی ہے جو حکومتِ وقت کے دور میں ناپید ہے۔

ٹالسٹائی نے اپنی کتاب ''جنگ اور امن'' کے آخری حصہ میں لکھا ہے کہ تاریخ خیالات کا بہاؤ ہے، جن میں سیاسی لیڈر ایک چھوٹا سا کردار ادا کرتا ہے۔ میں یہاں بات کو آگے بڑھانا چاہتی ہوں کہ بعض اوقات خیالات بہت تیزی سے آتے ہیں لیکن کبھی یہ خیالات اتنے آہستہ آتے ہیں جیسے کہ برف کا تودہ آہستہ آہستہ پگھلتا ہے۔ خیالات کا بہاؤ ایک آزاد اور جمہوری فضا میں ہوتا ہے، اس فضا میں مخالفت اور کسی بات سے اتفاق نہ کرنے کی آزادی ہوتی ہے جب کہ ڈکٹیٹر شپ میں تاریخ منجمد ہوجاتی ہے جیسا کہ پاکستان میں قائدِعوام ذوالفقار علی بھٹو سے پہلے تھا۔ بھٹو وہ شخص تھے، جنہوں نے منجمد اور ڈکٹیٹر شپ کے معاشرے کو ایک متحرک جمہوری معاشرہ بنا دیا، جس کی قیمت اُنہوں نے اپنی جان دے کر ادا کی۔

اُنہوں نے فوجی حکومت کی مخالفت کی کیونکہ وہ اسے معاشرہ کے لیے کینسر کی بیماری سمجھتے تھے۔ وہ پاکستان کے لیے فوجی حکومت کو بنیادی طور پر سمِ قاتل سمجھتے تھے کیونکہ پاکستان جمہوری جدوجہد کے نتیجہ میں بنا تھا۔ وہ سرد جنگ کے زمانے میں زندہ تھے جب کہ گرم پانی تک رسائی کے لیے سوویت یونین کوشاں تھا اور کشمیر میں سوویت یونین کے حامی نے قبضہ کیا ہوا تھا، اس لیے وہ دفاع کو مضبوط بنانا چاہتے تھے۔

اس سلسلہ میں ناقابلِ تسخیر پاکستان کے لیے اُنہوں نے ایٹمی ٹیکنالوجی دی اور کامرہ میں ایروناٹیکل فیکٹری بنائی، اُنہوں نے ہیوی مکینیکل کمپلیکس ٹیکسلا بنایا اور پاکستانی فوج کا مورال بلند کیا، وہ بھارت کے کیمپوں سے 90 ہزار پاکستانی جنگی فوجی واپس ملک لائے اور 1971ء کی جنگ میں ہارے ہوئے علاقہ بھی واپس حاصل کیے۔ اُنہوں نے جنگی جرائم میں مرتکب فوجی جرنیلوں کو جنگی مقدمات سے بچایا تا کہ ملک کی عزت و وقار باقی رہے۔ اُنہوں نے فوج کو بدنامی کے داغ

سے بچایا جو چند جنرلوں کی وجہ سے ملک کی تباہی کا باعث بنی تھی، یہ جنرل طاقت اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے ملک کو داؤ پر لگا رہے تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو کا ایمان تھا کہ فوج کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی سے فوج اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے محروم ہو جاتی ہے اور اس ادارہ کی کارکردگی تباہ ہو جاتی ہے۔ اُنہوں نے واضح طور پر کہا کہ پاکستانی فوج ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی ذمہ داریوں سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی، پاکستان کی عزت و وقار اسی میں ہے کہ فوجی سیاسی گورکھ دھندوں میں نہ پھنسے۔ جو فوجی اپنی بیرکوں کو چھوڑ کر حکومت کے ایوانوں میں جاتے ہیں، وہ جنگ ہار جاتے ہیں۔

ان کے یہ الفاظ 1981ء میں سچ ثابت ہوئے جب جنرل ضیاء نے سیاچن گلیشیئر ہار دیا اور 1999ء میں جب پاکستانی فوج یک طرفہ طور پر کارگل سے پسپا ہوئی۔ یہ الفاظ 2001ء میں بھی سچ ثابت ہوئے جب پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شمولیت اختیار کی تو انہیں پتہ چلا کہ شمالی اتحاد کابل میں اقتدار میں آ گیا حالانکہ پاکستان نے اُسے روکنے کی کوششیں بہت کیں۔

بہت سارے لوگوں کا خیال تھا کہ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد مغربی پاکستان بھی تتر بتر ہو جائے گا، پاکستان کی یہ دوسری زندگی جو 1971ء میں شروع ہوئی ذوالفقار علی بھٹو کی دور اندیش قیادت کے نتیجہ میں ہوئی، جنہوں نے ایک مایوس قوم کو دوبارہ عزت سے جینا سکھایا۔ پاکستان اُن کی قیادت میں مسلم دنیا کا محور بن گیا، جہاں سائنس، کلچر اور دانش ورانہ مہارت کے حامل لوگ اپنی توانائیاں بہتری کے لیے استعمال کرنے کے قابل ہو گئے۔ عالمی لیڈر اُن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے کیونکہ اُنہوں نے مسلم دنیا میں ایک معتدل قیادت دی تھی جو دنیا میں امن اور ترقی قائم کرنے میں بہت مددگار تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پاکستان طاقت ور ہوا، ملک میں ایک ترقی کے راستہ کا تعین ہو گیا تھا، ترقی کی رفتار بڑھی اور غیر ملکوں میں مقیم پاکستانیوں نے سرمایہ ملک بھیجنا شروع کر دیا، عوام کو پاسپورٹ بنوانے کا حق دیا گیا اور وہ ملک سے باہر جانے کے قابل ہو سکے، مسلم دنیا پاکستان کو تقریباً 500 ملین ڈالر سالانہ دے رہی تھی، جس کی وجہ سے پاکستان کا عالمی مالیاتی اداروں پر انحصار کم ہو گیا تھا، عوام کو نوکریاں اور مواقع ملے۔ اُنہوں نے پاکستان میں بنیادی انسانی حقوق کو متعارف کروایا، خواتین کو آزادی دی اور انہیں پولیس، دفترِ خارجہ اور عدلیہ میں جگہ دی گئی۔

انہوں نے پہلے ہی اُن ڈکٹیٹروں سے خبردار کر دیا تھا جو جمہوریت کو بنیادی جمہوریت سے بدلنا چاہتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ ہم جمہوریت کا مطالبہ کرتے ہیں اور ڈکٹیٹر ہمیں بنیادی جمہوریت دیتے ہیں۔ اگر بنیادی جمہوریت ہی جمہوریت ہے تو دنیا کے ہر ملک میں جمہوریت کے بجائے بنیادی جمہوریت کیوں رائج نہیں؟

وہ اعلٰی اقدار کے پیروکار تھے، جب وقت آیا تو اُنہوں نے سمجھوتہ کرنے کے بجائے اپنی جان دینے کو ترجیح دی۔ وہ اس قول کو بہت دہراتے تھے کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' انہوں نے کہا کہ وہ دنیا کو دکھائیں گے کہ ایک عوامی لیڈر کس طرح زندہ رہتا ہے اور کس طرح مرتا ہے۔ دنیا نے اُن کی زندگی کے لیے التجا کی کیونکہ یہ شخص دنیا میں امن اور ترقی کے لیے بہت اہم تھا لیکن ایک جنرل نے اُسے ٹھکرا دیا اور رات کی تاریکی میں اُن کو پھانسی دینے کا حکم جاری کر دیا۔

ساری دنیا حیرت زدہ رہ گئی اور بھٹو پھانسی کے پھندے تک پہنچ گئے۔ ساری دنیا اپنے عظیم بیٹے کے بچھڑ جانے پر حیرت زدہ اور غم زدہ تھی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اُن کی پھانسی کی شدید مذمت کی گئی۔ ذوالفقار علی بھٹو تاریخ میں اُن عظیم لوگوں کی صف میں کھڑے ہیں جنہوں نے تاریخ رقم کی، اُن کی شہادت نے دنیا کے کئی ملکوں میں آزادی کی تحریکوں کو جنم دیا، دنیا کے دارالحکومتوں میں کروڑوں افراد قائدِ عوام کی پھانسی کی مذمت کے لیے جمع ہوئے۔ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے وہ جانتے تھے کہ ہمیشہ کی زندگی مقاصد کے لیے قربانیاں دینے والوں کے حصہ میں آتی ہیں اور اُن مقاصد میں سب سے بڑا مقصد ظلم اور جبر سے انسانوں کو آزادی دلانا ہے۔

بھٹو 1928ء میں پیدا ہوئے اور 1979ء میں شہید کر دیئے گئے لیکن وہ ابھی تک عوام کے ذہنوں اور دلوں میں زندہ ہیں اور آسمان پر ایک درخشندہ ستارے کی مانند چمک رہے ہیں اور ظلم و جبر میں پھنسے ہوئے انسانوں کے لیے اُمید کا چراغ ہیں۔

ایک جنرل کب پسپا ہوتا ہے؟

رواں ماہ کے اوائل میں پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر نے ریفرنڈم کے ذریعے ملک کا صدر برقرار رہنے کا فیصلہ کیا۔ الیکشن کمیشن کے ایک جج نے احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا کہ ریفرنڈم غیر آئینی ہے۔ پاکستان بار ایسوسی ایشن، پاکستانی پریس اور سیاسی جماعتوں نے بھی اسے غیر آئینی قرار دیا اور اپنی ریفرنڈم مہم چلانے کے لیے سرکاری فنڈز استعمال کرنے کے باوجود جنرل صاحب کو لاتعلق لوگوں کی سردمہری کا سامنا کرنا پڑا۔

اکتوبر 1999ء میں جب جنرل مشرف نے اقتدار پر قبضہ کیا تو انہوں نے بہت سے وعدے کیے تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ سیاسی مخالفین کے خلاف کارروائیاں بند کردی جائیں گی۔ عسکریت اور کرپشن کو ختم کر دیا جائے گا۔ معیشت بحال کی جائے گی اور جمہوری عمل کے ذریعے اقتدار عوام کو منتقل کر دیا جائے گا لیکن وہ اپنے وعدوں پر کاربند رہنے میں ناکام رہے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ اُن کے دورِ اقتدار کی مدت بھی اتنی ہی ہے، جتنی اُن سیاسی لیڈروں کی تھی، جن پر وہ تنقید کرنے کے عادی ہیں۔

آرمی چیف اور چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے جنرل مشرف کی سربراہی میں اسلام آباد اپنے ہمسایہ بھارت کے ساتھ دو بار ایٹمی جنگ کے امکان کے کنارے تک پہنچ گیا تھا۔ ملک کے اندر جارحیت پسندوں کی قوت میں اضافہ ہوا اور ڈاکٹروں کو قتل کیا گیا۔ راولپنڈی کے ایک پروٹسٹنٹ چرچ اور ایک مسجد میں عبادت کرنے والوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ لاہور میں گرنیڈ پھینکے گئے اور وال سٹریٹ کے رپورٹر ڈینیئل پرل کو بیدردی سے قتل کیا گیا۔ جنرل صاحب کی طرف سے

طالبان، جنھوں نے القاعدہ کو پناہ دے رکھی تھی، کی ناز برداری کرنے کی وجہ سے امریکہ میں بے گناہ افراد ہلاک ہوئے، جس کے نتیجے میں افغانستان پر بمباری ہوئی۔

بین الاقوامی مالی عطیات کے باوجود ملکی آمدنی اور محصولات کم رہے ہیں۔ پریشانی کی بات یہ ہے کہ محصولات جی ڈی پی کے 14 فیصد تھے جب کہ 1996ء میں اُن کی سیاسی مخالفت کے زمانے میں 18 فیصد تھے۔ پیداوار بھی کم رہی جو 1996ء کے 6 فیصد کے نصف تھی۔ اسی طرح سرمایہ کاری کی حالت بھی قابلِ رحم رہی۔

کرپشن کے خلاف مہم سیاسی مصلحت کی چٹان کے ساتھ ٹکرا گئی۔ جن لوگوں کو عدالتوں نے مجرم قرار دیا تھا، انہیں ''انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر'' رہا کر دیا گیا۔ جو لوگ مجرم نہیں، وہ حکومت کی سیاسی مجبوریوں کے آہنی شکنجے کا شکار چلے آ رہے ہیں۔ جنرل مشرف کے وزیروں کے خلاف اپوزیشن نے کرپشن کے جو مقدمات دائر کیے ہوئے ہیں، اُن پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔ ٹھیکوں کے لیے ٹینڈر طلب کرنے کے طریق کار کو چند خاص معاملوں میں ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد جنرل صاحب نے اپنے فائدے کے لیے ایک قانون منظور کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سرکاری اخراجات سے تیار کیے گئے جس بڑی لاگت والے آرمی ہاؤس میں رہ رہے تھے، اس سے مطمئن نہ تھے لہٰذا انہوں نے کہا کہ صدر کی حیثیت سے وہ بڑی لاگت سے تیار کیے جانے والے ایک اضافی گھر کے مستحق ہیں۔ چنانچہ حیرت کی بات نہیں کہ جنرل صاحب عوام کے اجتماعات کے جذبات کو اُبھار نہیں سکے۔

ریفرنڈم میں جنرل صاحب کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے انتخابی فہرستوں، آزاد مبصرین اور ووٹ ڈالنے کے عمل کی نگرانی کے لیے پولنگ ایجنٹوں کی ضرورت کو موقوف کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ باقاعدہ پولنگ سٹیشنوں کی جگہ موبائل پولنگ سٹیشن قائم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

جنرل صاحب نے کہا ہے کہ وہ ریفرنڈم اس لیے کرا رہے ہیں کیونکہ وہ ''اقتدار میں شرکت'' پر یقین نہیں رکھتے۔ انہوں نے آرمی جیسی محنت اور مشقت سے مہم چلائی جب کہ سٹیج پر آرمی کے جرنیل اُن کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مذہبی پارٹیوں کے متعلق کچھ نہیں کہا جو جارحیت کی حمایت کرتی ہیں۔ انہوں نے جارحیت پسندوں کے مفاد کی خاطر جمہوری لیڈروں کو بدنام کیا۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اُن کے مدمقابل پاکستان پیپلز پارٹی کی لیڈر ہیں، حالانکہ انہیں پاکستان کے صدر کے عہدے سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ اپنے اعلان کے مطابق وزارتِ عظمیٰ کی اُمیدوار ہیں۔

جنرل صاحب کی شخصی سیاست نے اُن کے حامیوں اور اُن کے مخالفین کے درمیان ریت پر

لکیریں کھینچی ہیں۔ اگر وہ آرمی کی وردی اُتار دیں تو اُن کے حصے میں صرف اپنا ووٹ ہی آئے گا۔ دانش مندی یہ تھی کہ وہ پاکستان کے مستقبل کی سمت کا تعین ایک ایسی مملکت کے طور پر کرتے، جس کا مقصد اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن قائم رکھنا اور عوام کی خوشحالی ہو۔

دنگا فساد کا احساس کرتے ہوئے اپوزیشن نے ریفرنڈم کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ اپوزیشن نے مشرف صاحب سے کہا کہ اگر ووٹوں کا ٹرن آؤٹ 50 فیصد سے کم ہو تو انہیں اقتدار سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ جنرل صاحب نے یہ بات مسترد کر دی جس سے اس شک کی تصدیق ہوتی ہے کہ اگر چہ انہوں نے عوام کے سامنے اپنی کامیابی کا اعلان کیا ہے مگر اُس پر انہیں زیادہ اعتماد نہیں۔

ریفرنڈم کے ہنگامے نے پاکستانی معاشرے میں ایک ایسے وقت میں انتشار پیدا کر دیا جب دہشت گردی کے خلاف بین الاقوامی مہم ایک خطرناک اور نئے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ القاعدہ کے ارکان پاکستان کے دل پنجاب میں کہیں چھپے ہوئے ہیں یا یہاں سے گزر کر کہیں اور جا چکے ہیں۔ جنرل صاحب کئی ماہ تک یہ دعوے کرتے رہے تھے کہ پاک افغان سرحد پر فوجی چوکیاں قائم کر کے اُن کے فرار کو روک دیا گیا ہے۔

برطانوی اور امریکی فوجی افغان پہاڑی علاقوں میں کھوج لگا رہے ہیں اور گوریلا مزاحمت کا سامنا کر رہے ہیں جب کہ ایک بین الاقوامی فوجی کمانڈر نے پاکستانی علاقے میں تلاش کا امکان بھی ظاہر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشرق وسطیٰ بھی شعلوں کی زد میں ہے اور پورے عالم اسلام میں مسلمان بازاروں میں غم و غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ واشنگٹن کی تاریخ میں پہلی بار پچاس ہزار مسلمانوں نے بازاروں میں نکل کر فلسطینی علاقے پر اسرائیلی قبضے کے خلاف احتجاج کیا ہے۔

بھارتی اور پاکستانی فوجیں سرحدوں پر اپنی توپوں اور میزائلوں کا رُخ ایک دوسرے کی طرف کیے کھڑی ہیں۔ اگر اس بار پاک بھارت سرحد پر جنگ بھڑک اُٹھی تو دنیا بہت زیادہ تباہی دیکھے گی۔

جنرل مشرف شاید دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت بین الاقوامی طور پر ملنے والی حمایت کی وجہ سے وہ مغرب کے لیے ضروری ہیں لیکن اگر وہ اس نازک موقع پر پاکستانی معاشرے میں تضادات کا رجحان ختم کر دیں تو یہ اُن کے لیے ایک خوفناک ترین اقدام ثابت ہوگا۔

اس وقت پاکستان کی قومی اور صوبائی اسمبلیاں معزول ہیں۔ منتخب صدر کو برطرف کیا جا چکا ہے۔ آئین معطل ہے۔ سیاسی پارٹیوں کو پریشان کیا جا رہا ہے اور سیاسی لیڈروں کو مملکت کی سرپرستی

میں غیر فطری انصاف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہے سوائے اُن لوگوں کے جو آمریت کی حمایت کرتے ہیں۔

پاکستان میں جمہوریت اور انسانی حقوق کی صورتِ حال آج کل بالکل وہی ہے جو بیس سال پہلے جنرل ضیاء الحق کے دور میں تھی۔ انہوں نے اپنی آمریت کو تحفظ دینے کے لیے پاکستان کی اہمیت کو امریکہ کے لیے افغانستان میں استعمال کیا۔ اب جنرل مشرف نے پاکستان کے تحریری آئین سے انحراف کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ وہ 30 اپریل کو ریفرنڈم منعقد کرائیں گے تاکہ بعد میں ہونے والے انتخابات کے نتائج سے قطع نظر اُن کی فوجی آمریت کو پانچ سال کی توسیع مل سکے۔

مشرف صاحب جو کچھ کر رہے ہیں، جمہوریت اور پاکستانی عوام کے انسانی حقوق کی قربانی دے کر کر رہے ہیں۔ اگر اقتدار پاکستانی عوام کے حوالے نہ کیا گیا تو افغانستان کی تباہی اس کے ہمسایہ ایٹمی پاکستان کے لیے ایک بڑی اور خوفناک تباہی کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔

اگر جنرل مشرف ملک کے جمہوری مستقبل کا حصہ بننا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے آپ کو آئین کے مطابق منتخب کرانا چاہیے۔

پاکستان کی سپریم کورٹ ریفرنڈم کے خلاف درخواست کی سماعت کر رہی ہے۔ یہ اس بات کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ ریفرنڈم ایک توثیق تو ہو سکتا ہے لیکن ایک انتخاب نہیں۔

ایک صاحب بصیرت جنرل کو علم ہوتا ہے کہ پسپائی کب اختیار کرنی چاہیے اور ہمارے جنرل صاحب پہلے ہی 1999ء کے موسم بہار میں کارگل کی خطرناک پہاڑیوں سے یک طرفہ طور پر پسپا ہو چکے ہیں، جب بھارت اور پاکستان جنگ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اُن کے لیے یہ موقع ہے کہ پاکستانی رائے عامہ کے پیش نظر وہ ایک بار پھر پسپا ہو جائیں۔ ایسا کرنے سے وہ اخلاقی فتح حاصل کر سکتے ہیں جب کہ ایک جعلی ریفرنڈم سے انہیں کچھ نہ ملے گا۔

جنرل مشرف کا دورۂ نئی دلّی

بھارتی وزیراعظم واجپائی نے حیرت انگیز طور پر پاکستان میں فوجی انقلاب کے قائد جنرل مشرف کو اس موسم گرما میں بات چیت کے لیے دلّی کے دورہ کی دعوت دی۔ یہ دعوت مئی کے دوران دی گئی، جس ماہ کے دوران گزشتہ سال دونوں ملکوں نے ایٹمی دھماکے کیے اور پھر کارگل میں دونوں کے درمیان جنگ ہوئی۔

بھارتی وزیراعظم کی یہ دعوت چاروں طرف سے محصور جنرل کے لیے ذرا سانس لینے کا موقع فراہم کرے گی، جو اکتوبر 1999ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد سے (دونوں ملکوں کے درمیان) بات چیت کی مسلسل وکالت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے واجپائی کی دعوت فوراً قبول کر لی۔

جنرل مشرف اس وقت اس شہر کو روانگی کے لیے، جہاں وہ پیدا ہوئے تھے، رختِ سفر باندھ رہے ہیں، لیکن اسی تناظر میں اُن پر رشک کرنا مشکل ہے۔ وہ پاکستان کے قدیمی حریف سے معاملات طے کرنے کے لیے دلّی جانے والے پاکستانی زعماء میں کمزور ترین رہنما ہیں۔ پاکستان اور بھارت تین جنگیں لڑ چکے ہیں اور پاکستانی افواج کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ بھارت کے ساتھ (اس شعبہ میں) برابر برابر رہے۔

اس وقت جب مشرف نے اپنا سوٹ کیس پیک کرنے کے لیے نکالا ہے، پاکستان کے لیے حالات اور بھی بدتر اس لیے ہیں کہ دنیا کی واحد سپر پاور سے پاکستان کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ امریکی ذرائع ابلاغ میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں خدشات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ امریکی ذرائع ابلاغ نے دعویٰ کیا ہے کہ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج نے اسی

جون کے مہینے میں کہا ہے ''امریکہ کو پاکستان کے حوالے سے ایٹمی پھیلاؤ پر تشویش ہے اور اس تشویش کا منبع وہ لوگ ہیں، جو پاکستان کے ایٹمی اداروں میں ملازم تھے، مگر اب ریٹائر کر دیئے گئے ہیں۔''

ڈاکٹر قدیر کو، جنہیں ذوالفقار علی بھٹو نے ایٹمی ترقی کا منصوبہ مکمل کرنے کو دیا تھا، مشرف حکومت نے حال ہی میں ریٹائر کر دیا ہے۔ اسلام آباد سے ابھی اس بات کی تصدیق نہیں ہو رہی کہ امریکی اہلکار کا اشارہ ڈاکٹر قدیر کی طرف تھا، یا ایک اور سائنس دان کی طرف، جب اس نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے تعلق رکھنے والے ''ریٹائرڈ'' افراد کا ذکر کیا تھا۔

پی پی پی کی سابق حکومت نے پاکستان کے ایٹمی سائنس دانوں کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی تھی، اس نے یہ اقدام 1990ء میں یہ معلوم ہونے کے بعد کیا تھا کہ بنیاد پرستوں کا ایک حامی صحافی، کسی سرکاری منظوری کے بغیر، ایک ممتاز سائنس دان کو ایک ایسے ملک کے دورے پر لے جانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے، جو خود ایٹمی پروگرام کی منصوبہ بندی کا خواہش مند تھا۔

پاکستان کی طرف سے ایٹمی پھیلاؤ کا امریکی خدشہ ایسے وقت پر سامنے آیا (یا لایا گیا؟) ہے، جب بھارتی وزیراعظم واجپائی اور جنرل مشرف کے درمیان بات چیت کا اعلان ہوا ہے۔ بھارت کے ساتھ بات چیت میں امریکی خدشات کا اظہار پاکستان پر دباؤ کا باعث ہوگا۔ اسلام آباد پہلے ہی شدید اقتصادی دباؤ کا شکار ہے۔ مشرف کے برعکس واجپائی ایک منتخب قومی رہنما ہیں۔ انہوں نے پاکستان میں اپنے ہم منصب کو مذاکرات کی دعوت دینے سے قبل اپنے ملک کے اپوزیشن رہنماؤں سے صلاح مشورہ کیا۔ اس کے برعکس مشرف کی تو اپنے ملک کی اپوزیشن سے بول چال بھی نہیں ہے۔ اپوزیشن لیڈروں کو جلاوطنی پر مجبور کر دیا گیا ہے، چنانچہ مشرف ایک ایسے میچ میں نہایت کمزور سیاسی وکٹ پر بیٹنگ کرنے نکلے ہیں، جہاں ''تماشائی'' اپنے ملک کی ٹیم کے لیے زور شور سے تالیاں بجا رہے ہوں گے۔

اسلام آباد نے اس خیال کی تردید تو فوری طور پر کر دی کہ شمالی کوریا سے تعلقات میں پاکستان کے ایٹمی شعبہ کی انتظامیہ کے اہم لوگ بھی ملوث ہیں، تاہم امریکیوں کا دعویٰ ہے کہ اُن کے پاس اس امر کی شہادت موجود ہے کہ شمالی کوریا کے اہل کاروں نے پاکستان میں ایٹمی اسلحہ بنانے سے متعلق ایک مقام کا دورہ کیا تھا۔

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اگر اپنے دور میں ایٹمی سائنس دانوں کو ایٹمی آلات تیار کرنے کا خاکہ فراہم کیا تھا، اُن کی پارٹی نے اس پروگرام کو مکمل کرنے کا تحرک بخشا تھا۔ اپنے دو ادوار

حکومت کے دوران پارٹی نے میزائل ٹیکنالوجی بورڈ قائم کیا اور اس کے لیے ضروری فنڈز فراہم کیے۔ اس طرح ملک میں بلاسٹک میزائل ٹیکنالوجی کی ترقی اور فروغ میں مدد دی۔ انہی پالیسیوں کی وجہ سے پارٹی کو اپنی حکومت کی قربانی دینا پڑی۔ یہی وہ میزائل ٹیکنالوجی ہے، جو امریکہ کی نئی (بش) انتظامیہ کی تشویش کی تہہ میں کارفرما ہے۔ صدر بش ایک ''میزائل دفاعی نظام'' قائم کر رہے ہیں، چنانچہ وہ (دوسرے ملکوں میں) میزائلوں کی ترقی اور فروغ پر ایک باز کی طرح نظر رکھے ہوئے ہیں۔

ایٹمی دھماکوں کے بعد پاکستان نے ''ایٹمی ریگولیٹری اتھارٹی'' قائم کی ہے، پھر بھی، جیسا کہ امریکیوں کا خیال ہے، بھارت کے خلاف مئی 1998ء کے ایٹمی دھماکوں کے بعد عائد کی جانے والی پابندیاں ختم کر دی جائیں گی، لیکن پاکستان پر عائد پابندیاں قائم رہیں گی۔ ان پابندیوں کو مزید امریکی پابندیوں سے مضبوط بنا دیا گیا ہے، جو جنرل کے اقتدار پر قبضہ کے بعد عائد کی گئی ہیں۔

بیرونی پابندیوں، اندرون ملک حمایت کا فقدان، اقتصادی دیوالیہ پن کی لٹکتی ہوئی تلوار اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں پر انحصار کی وجہ سے، جنرل مشرف کے لیے بھارت کا دورہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہیں دہلی مذاکرات کی دعوت کی صورت میں دیئے جانے والے آکسیجن ماسک کے ساتھ تحریک ظاہر کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے برعکس وزیراعظم واجپائی پر ایسا کوئی دباؤ نہیں، وہ اسی طرح مسکرا کر، جس طرح ایک مکڑے نے مکھی کو کہا تھا ''آیئے! میرے دیوان خانے میں تشریف لایئے''، مشرف کو دعوت دے سکتے ہیں۔

بھارتی رہنما نے پاکستانی جنرل کو دعوت دیتے ہوئے اپنے شدت پسند رفقاء کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ جنرل کو دعوت دینے کے ساتھ ہی نام نہاد جنگ بندی کے خاتمہ کا بھی اعلان کیا گیا، جو کشمیر کے متنازعہ علاقہ میں ایک سال سے جاری تھی۔ جنگ بندی کے خاتمہ کا مطلب یہ ہے کہ اب بھارت کی مسلح افواج اور کشمیر کے عسکریت پسندوں کے درمیان سرگرمیوں میں اضافہ ہوگا اور مشرف پر اُن عسکریت پسندوں کا زیادہ دباؤ ہوگا، جنہیں دہلی مذاکرات سے الگ تھلگ رکھا جا رہا ہے۔

دو سال قبل واجپائی نے پاکستان کا دورہ کیا تھا، جس سے برف ذرا پگھلی تھی، مگر یہ وقفہ بہت معمولی ثابت ہوا۔ مشرف جو اس وقت بھی آرمی چیف تھے، واجپائی کا خیرمقدم کرنے والوں کی قطار میں نمایاں غیر حاضر تھے۔ اُن کی عدم موجودگی فوج کی طرف سے اس دورہ کی نامنظوری کا اشارہ تھا۔ اب مشرف کا دورہ (دہلی) سیاسی اور فوجی تخیلات میں واضح فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ وہی

مشرف جو سیاسی حکومت کے (بھارت کے ساتھ) مذاکرات کے عمل کا مضحکہ اُڑا رہے تھے اور جنہوں نے بطور چیف آف آرمی سٹاف واجپائی کے دورۂ لاہور کی مخالفت کی تھی، بطور چیف ایگزیکٹو اپنا لہجہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے اور بھارت کے ساتھ کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ مذاکرات کا اعلان کرنے لگے اور بھارت جانے پر بھی فوراً تیار ہو گئے۔

پاکستان کی اپوزیشن نے دو ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح ممالک کے درمیان مذاکرات کا عام طور پر خیر مقدم کیا ہے۔ اگر چہ اپوزیشن نے ایک غیر منتخب لیڈر کی طرف سے کسی معاہدے کے جواز سے انکار کیا ہے، لیکن اس نے مشرف کے مجوزہ دورے کی اجازت اس لیے دی ہے کہ دو تاریخی رقیب ممالک کے درمیان بہتر روابط کی مثال قائم ہو سکے۔ اپوزیشن کا اندازہ یہ ہے کہ ایک فوجی حکمران، فوج کے اپنے مخصوص مفادات کی وجہ سے، جو دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی سے وابستہ ہیں، ان مذاکرات میں کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھ سکے گا، لیکن آئندہ سال ہونے والے عام انتخابات کے تناظر میں اپوزیشن اس دورہ کو اس عمل میں نرمی پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھ رہی ہے جو تکمیل پذیر ہو سکتا ہے۔

پاکستانی عوام کی رائے بھی روبہ تبدیل ہے، قبل ازیں بھارت کے ساتھ مذاکرات کرنے والے رہنماؤں کو اکثر ''غدار'' کا لقب دے دیا جاتا تھا، لیکن نئے حقائق کے باعث اب ایسا نہیں ہے، کیونکہ پاکستان اپنے ایٹمی دھماکوں اور بھارت کے ساتھ کشیدگی کی کڑوی فصل بگڑتی ہوئی اقتصادی حالت کی شکل میں کاٹ رہا ہے۔

عالم اسلام کے ممالک پاکستان کے ایٹمی دھماکوں پر سر فخر سے بلند تو کرتے ہیں، مگر انہوں نے پاکستان کو کوئی امداد نہیں دی۔ پاکستان کی ڈوبتی ہوئی معیشت، انتہائی وسیع غربت اور بھوکوں کی خودکشیاں، معاشرہ کی ایک نئی تصویر اور نئی نسل کی نئی حالت کو ظاہر کر رہی ہیں۔

اکیسویں صدی میں پاکستان امریکہ کا ''بہترین حلیف'' نہیں رہا۔ اب یہ بات بھی گئی گزری ہو چکی ہے کہ امریکہ، پاکستان اور بھارت کے ساتھ ''مساوی سلوک'' کرے گا، کیونکہ امریکی، اس اعلان کے بعد کہ وہ پاکستان اور بھارت کے ساتھ الگ الگ بنیادوں پر سلوک روا رکھیں گے، بھارت کے ساتھ تیزی کے ساتھ تعلقات کو فروغ دے رہے ہیں۔ اب اسلام آباد کو ایسی خارجہ پالیسی تشکیل دینے کی ضرورت ہے جو نئے عالمی نظام میں بدلتے ہوئے حقائق کا ساتھ دے سکے۔ نئی حقیقتوں نے پاکستان کی پلیٹ کو ایسے مسائل سے لبالب بھر دیا ہے، جن کو ہضم کرنے (حل کرنے) کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے ایٹمی پھیلاؤ کے ضمن میں اقدامات، فروغ اعتماد اور

مسائل کے بہتر حل کی صورت میں بھارت کے ساتھ بہتر تعلقات، نظر ثانی شدہ افغان پالیسی، جس میں عوام کو معاشی شعبہ میں اچھے مواقع مل سکیں اور وہ معاشی طور پر حالات کو بہتر بنا سکیں۔

مشرف کے دورۂ دہلی پر کروڑوں نظریں لگی ہوں گی اور ذرائع ابلاغ میں اس کی خبریں اور رپورٹیں وسیع پیمانے پر شائع اور نشر ہوں گی۔ وہ اپنے آبائی شہر کے اس دورہ سے لطف اندوز بھی ہو سکیں گے، جسے انہوں نے تقسیم کے وقت چھوڑا تھا۔ یہ دورہ وطن واپسی کی یادوں سے معمور ہوگا، لیکن وہ دہلی سے جو شاپنگ بیگ لے کر واپس آئیں گے، اُن میں کوئی ٹھوس معاہدہ نہیں ہوگا، کوئی ہو بھی سکتا ہے، لیکن پاکستان میں مشرف کے کیے گئے وعدہ کا جواز کم کم ہی تسلیم کیا جائے گا۔ بھارت کے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا منصب بھی ایک فوجی آمر سے معاملہ طے کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہوسکتا۔

ہاں! یہ دورہ علامتی طور پر قابل توجہ ہوسکتا ہے۔ یہ کارگل کے معمار کی رضامندی کا مظہر ہے، جس سے ظاہر ہے کہ پرانے طور طریقوں نے نئے اطوار کو راہ دے دی ہے۔ پاکستان کی مسلح افواج نے 1989ء اور پھر 1999ء میں پاک بھارت مذاکرات کی جس شدت سے مخالفت کی تھی، اس کے پیش نظر یہ دورہ ایک بڑی کامیابی ہے، گو اس کے روبہ عمل آنے میں ایک دہائی سے زیادہ عرصہ لگا ہے۔

دہشت گردی اور فوجی حکومت

8 مئی کو ایک خودکش حملے میں حملہ آوروں نے پاکستان میں موجود غیر ملکیوں کو اپنا نشانہ بنایا۔ نیوی کی بس میں بم دھماکے سے آگ بھڑک اُٹھی، جس سے سات فرانسیسی انجینئرز سمیت 14 افراد ہلاک ہوئے۔ خودکش حملہ آوروں کے حملے سے نیوزی لینڈ کی کرکٹ ٹیم کے ارکان بال بال بچے جو کراچی کے پوش علاقے میں واقع فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ نیوزی لینڈ کی کرکٹ ٹیم کے ارکان اگلی پرواز سے اپنے ملک روانہ ہو گئے جب کہ فرانس کے صدر شیراک نے صدارتی انتخاب میں فتح کی خوشی میں ہونے والی تقریبات کو مختصر کر دیا۔ موجودہ برس کے دوران یہ تیسرا خودکش حملہ ہے جو فوجی آمریت کے دور میں ہوا، اس دھماکے کا شکار ہونے کے بعد فرانس بھی امریکہ کے ساتھ متاثرہ ممالک میں شامل ہو گیا ہے۔

خون کی طرح انسانی اعضا اور دوسرے اجزا سڑک پر بکھرے پڑے تھے۔ دہشت گردی کے عمل کا واضح نمونہ سامنے موجود تھا۔

طالبان اور القاعدہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شدت پسند پاکستان میں پھر سے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ یہ بات قطعی حیران کن نہیں، ان میں بہت بڑی تعداد اُن لوگوں کی ہے جنہیں اس وقت بھرتی کر کے پاکستان لایا گیا تھا جب افغانستان کے اندر سوویت یونین کے خلاف جنگ لڑی جا رہی تھی۔

جب سوویت یونین افغانستان سے نکل گیا تو کابل فتح کرنے کے لیے عالمی حمایت بھی ختم ہو گئی۔ حریت پسندوں نے یہ محسوس کیا کہ انہوں نے ایک عالمی طاقت کو شکست دی ہے۔ اس لیے

وہ دوسری سپر پاور کو بھی شکست دے سکتے ہیں۔ یوں شدت پسندی اور عسکریّت پسندی نے جنم لیا۔

سوویت یونین کے خاتمے کے بعد کشمیر میں عسکریّت پسندی کو اپنے اظہار کا موقع ملا۔ بھارتی قبضے پر انتہائی غم وغصہ دیکھنے میں آیا۔ کشمیری ظلم کے خلاف ڈٹ جانے کے لیے تیار تھے اور یوں 1989ء میں وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کی تحریک 1996ء کے آخر میں افغانستان سے تعلق رکھنے والے عناصر نے ہائی جیک کر لی۔ یہاں تک کہ آل پارٹیز حرّیت کانفرنس کے لیڈروں کو بھی کونے کھدرے لگا دیا گیا۔

اب شدت پسند تین اطراف یعنی افغانستان، پاکستان اور مقبوضہ کشمیر سے آگے بڑھنے لگے۔

1996ء میں پاکستان میں جمہوریت کے خاتمے کے بعد افغان عناصر کی حمایت کرنے والے عسکری شدت پسندوں کو پاکستان پر کنٹرول حاصل کا موقع ملا۔ انہوں نے انتخابات میں دھاندلی کی اور انتظامیہ پر قبضہ کرلیا۔ جوں جوں نواز شریف غیر مقبول ہوتے گئے توں توں انہوں نے جنرل مشرف کی پشت پناہی کرنا شروع کر دی کہ وہ اقتدار پر قبضہ کرلیں۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ بین الاقوامی کمیونٹی بھی انتہا پسندی کو شکست دینے کے لیے جنرل پرویز مشرف کو عظیم نجات دہندہ سمجھتی ہے۔ پاکستان میں بھی بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ انتہا پسندی کو شکست دے سکتے ہیں۔ ایک ایسی فوجی حکومت پر انحصار کرنا جسے شدت پسندوں کی حمایت حاصل ہو ایسے ہی ہے جیسے کسی آتش زن کو آگ بجھانے کی ذمہ داری سونپی جائے۔

دہشت گردوں کی کارروائیاں پاکستان کی مشرقی اور شمالی سرحد پر، جہاں حالات کشیدہ ہیں، مربوط طریقے سے وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ گزشتہ برس ستمبر میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شامل ہونے کے فیصلے کا دفاع کرتے ہوئے اس باہمی ربط کو پاکستان کے فوجی لیڈر نے واضح کیا۔ پاکستانی قوم سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''وہ بڑی برائی (بھارت) سے لڑنے کے لیے چھوٹی برائی (امریکہ) کے ساتھ شامل ہو رہے ہے۔''

ہمسایہ ملک افغانستان کے ساتھ سرحد پر صورت حال فرار ہونے والے القاعدہ کے ارکان اور اُن کا تعاقب کرنے والی بین الاقوامی فورس کی وجہ سے کشیدہ ہو چکی ہے۔ مشرقی سرحد، جو بھارت سے ملتی ہے، پر بھی صورت حال خطرناک ہو چکی ہے۔ بھارت نے اپنی فوجیں سرحد پر لا بٹھائی ہیں اور مطالبہ کر رہا ہے کہ پاکستان بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ کرنے والے مطلوب افراد کو بھارت کے حوالے کرے۔

جب امریکہ نے القاعدہ کے مفرور ارکان کی تلاش کے لیے پاکستان پر دباؤ ڈالا تو بھارت

کے ساتھ مشرقی سرحد پر حالات کشیدہ ہو گئے۔ اس موقع پر پاکستان نے مؤقف اختیار کیا کہ اس کی فوج پہلے ہی سے بھارتی حملے کا دفاع کرنے میں مصروف ہے۔ اس لیے وہ مؤثر طور پر امریکہ کی مدد نہیں کرسکتی۔ اس سے کشمیر کے مسئلے کو نمایاں ہونے کا دوہرا موقع ملا۔

گزشتہ برس موسم سرما میں امریکہ چاہتا تھا کہ پاکستان افغانستان کے ساتھ اپنی سرحد سیل کر کے القاعدہ کے فرار ہونے والے ارکان کو پکڑے، عسکریت پسندوں نے بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ کر کے کامیابی سے دباؤ کو کم کیا۔ ممکنہ ایٹمی جنگ کا خطرہ حقیقت بن گیا۔ بین الاقوامی برداری اس خطرے کو دور کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوگئی۔

موسم گرما کے آتے ہی امریکہ نے پاکستان پر اپنا دباؤ بڑھایا کہ وہ شمالی سرحد اور خطرناک قبائلی افراد کو اپنے کنٹرول میں رکھے جو القاعدہ کے لیے ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں۔ کراچی میں فائیو سٹار ہوٹل کے قریب دہشت گردوں کا حملہ، جس میں فرانسیسی اور دوسرے افراد مارے گئے، اس بڑھتے ہوئے دباؤ کا دہشت گردوں کی طرف سے جواب تھا جس نے شہر کو صدمے سے دوچار کر دیا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد 14 مئی کو مقبوضہ کشمیر میں دھماکہ ہوا جس میں بچے اور عورتیں ہلاک ہوئیں۔ اس دھماکے سے پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کے امکانات بہت زیادہ بڑھ گئے۔

پاکستانی فوج ایک مرتبہ پھر بھارت کے سامنے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود تھی اور بین الاقوامی برادری جنگ کے خطرے کو کم کرنے کی کوششوں میں مصروف۔ سیاسی میدان میں بھی یہ طریقہ کار واضح ہے۔ مثال کے طور پر جب آگرہ سربراہ ملاقات پاک بھارت مذاکرات کا پیغام دے رہی تھی اس وقت جنرل پرویز مشرف نے صدر رفیق تارڑ کو گھر بھیجنے اور صدارت پر قابض ہونے کا فیصلہ کیا۔

فروری میں جب جنرل پرویز مشرف نے امریکہ جانے کا فیصلہ کیا تو اُن کے دورے سے چند روز قبل ڈینیئل پرل کو اغوا کر کے قتل کر دیا گیا۔ اگر کسی کو شک ہو کہ آیا فوجی آمر جمہوری نظام کا درست متبادل تھا تو اسے جائزہ لینا چاہیے کہ اغوا کے عمل سے کس طرح مشکوک انداز میں نمٹا گیا۔

اس کے بعد فوجی آمر نے ریفرنڈم کروایا۔ اپوزیشن نے بائیکاٹ کے ذریعے منفی ووٹ کی کال دی، جس کے نتیجے میں 95 فیصد لوگوں نے پولنگ بوتھوں پر جانے سے انکار کر دیا۔

حال ہی میں جنرل پرویز مشرف نے ملک کی طوائف الملوکی سے بھری گلیوں میں بارہ سو عسکریت پسندوں کو جیل سے رہا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں عدالت کے فیصلے کے بغیر پابند سلاسل رکھنا غلط ہے لیکن اپنے سیاسی حریفوں کو عدالت کی طرف سے مجرم قرار دیئے جانے کے

باوجود قید رکھنے پر کوئی شرمندگی، یا ندامت نہیں ہوتی ہے۔ان میں سے بعض چھ چھ برس سے ایک ایسے ملک میں بغیر کسی ریلیف کے قید میں پڑے ہوئے ہیں جہاں کرنل عدالت کے کمرے میں عدالت پر دباؤ ڈالنے کے لیے موجود ہوتا ہے۔

نوّے کے عشرے سے لے کر کراچی میں دہشت گردی کے حملے تک 130 عسکریت پسند مجرموں کو جیل سے رہا کیا گیا۔راکٹ لانچرز کے ذریعے حملہ کرنے، سیاسی قتل کرنے، بڑے پیمانے پر لوگوں کو قتل کرنے اور حالات کو تہس نہس کرنے کے سلسلے میں وہ کراچی کی گلیوں سے خوب واقف ہیں۔ وہ خفیہ ٹھکانے رکھتے ہیں اور چوری کے ذریعے اپنی سکیموں کی مالی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ انہیں ہتھیاروں کے چھپے ہوئے دفینے تک رسائی حاصل ہے۔ اُن کے پاس تجربہ اور صلاحیت موجود ہے کہ وہ دہشت گردی کی شدت اور پھیلاؤ میں اضافہ کر سکتے ہیں۔اُن لوگوں کو رہا کرنے کا بہانہ پیش کیا گیا کہ اُن کی رہائی سے جنرل مشرف کو وہ ووٹ مل سکتے ہیں جو اُن کی ضروریات ہیں۔ جنرل پرویز مشرف کا کہنا ہے کہ وہ ملک کی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ تصفیہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ پارٹیاں بدعنوان ہیں لیکن پھر بھی کچھ سیاسی لیڈروں پر لگنے والے الزامات سے انکار کیا جاتا ہے اور سیاسی لیڈروں کو بے گناہ ٹھہرایا جاتا ہے۔اس کے لیے منطق یہ پیش کی جاتی ہے کہ جنرل مشرف کو ایسے شدت پسند کنٹرول کر رہے ہیں جو ایک اور دھاندلی شدہ پروگرام کے ذریعے جمہوری قوتوں کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔اگر معاملہ واقعی ایسا ہی ہے تو اُن کا برسر اقتدار رہنا پاکستان کی وحدت کے ساتھ ساتھ علاقائی امن اور عالمی سلامتی کے لیے خطرہ ہے۔

پاکستان تنخواہوں، پنشن اور دوسری مراعات کے ذریعے اپنی انٹیلی جنس ایجنسیوں پر اربوں روپے خرچ کرتا ہے۔منتخب مقامی لیڈر اور جونیئر پولیس افسران، طاقت ور آئی ایس آئی، ملٹری انٹیلی جنس، کور آف انٹیلی جنس اور دوسری انٹیلی جنس ایجنسیوں کے بڑے افسران کے ساتھ کام کرنا مشکل پاتے ہیں۔۔اس طرح کی صورت حال میں اس بات کی کوئی وضاحت پیش نہیں کی جا سکتی کہ آنکھیں اور کان رکھنے والی اتنی بڑی فورس (جو ہر جگہ موجود ہے) دہشت گردوں، شدت پسندوں اور عسکریت پسندوں کی نگرانی کرنے کے قابل کیوں نہیں۔

اپوزیشن پارٹیاں اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ شدت پسند انٹیلی جنس کو ریاست کی معاون سیاسی پارٹی کے طور پر کنٹرول کرتے ہیں۔انٹیلی جنس سیاسی پارٹی کو کنٹرول کرنے والے میجر جنرل صدارت کے ایماء پر سیاسی اتحادوں کی تعمیر و تخریب کے عمل میں مصروف ہیں۔غربت کے خاتمے کی قیمت پر افسران اکثر و بیشتر سفر کرتے ہیں، روزانہ الاؤنس لیتے ہیں اور سیاست دانوں سے رابطے

کرتے ہیں۔ ان کا مقصد کنگز پارٹی کی تشکیل اور اکتوبر میں ہونے والے انتخابات میں دھاندلی کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنا ہے تاکہ اُن لوگوں کو اقتدار سے باہر رکھا جاسکے جنہیں 1996ء میں اقتدار سے بے دخل کیا گیا تھا۔

حکومت کا تنزلی سے پاگل پن کی طرف جانے کا عمل صرف اسی صورت میں رُک سکتا ہے کہ وہ شدت پسند جنہوں نے 1996ء میں اقتدار پر قبضہ کیا تھا انہیں شفاف انتخابات کے ذریعے بدل دیا جائے کیونکہ انہوں نے سیاسی تبدیلی کے عمل کو روک رکھا ہے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب فوج اور عدلیہ انتخابی اصلاحات پر عمل درآمد کروانے کے سلسلے میں عوام کے ساتھ شامل ہو جائیں جو جمہوریت کی یقین دہانی کراتی ہیں۔ دوسری صورت میں گزشتہ برس ستمبر میں افغانستان میں شروع ہونے والی جنگ بھارت میں اُن شدت پسندوں کی پشت پر ختم ہوگی جو انسانی زندگیوں سے خطرناک کھیل کھیلنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔

کیسا ریفرنڈم؟

قوم کے ساتھ ضیاء الحق سے بھی کہیں بڑا فراڈ ہونے والا ہے۔''فوجی ریفرنڈم'' دراصل گن پوائنٹ پر صدارت کا حصول ہے۔قوم ریفرندم کے بجائے روٹی کی طلب گار ہے۔قومی سطح پر ذراسی غلطی بھارت کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔جس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ حکمرانوں پر عائد ہوگی۔نئی حلقہ بندیوں سے من پسند افراد کے انتخاب کا راستہ ہموار کیا گیا ہے۔آئین کو پاؤں تلے روند دیا گیا ہے۔عوام ریفرنڈم کا تماشا مسترد کر دیں گے مگر''فوجی شعبدہ باز'' ضیاء الحق کی طرح 98 فیصد عوامی رائے کے حصول کا گمراہ کن اعلان کرے گا۔ بلکہ لاہور کے ناظم اور گورنر پنجاب تو ریفرنڈم سے قبل ہی''فوجی شعبدہ باز'' کی فتح کے شادیانے بجا کر حق نمک ادا کرنے میں مشغول ہیں۔ریفرنڈم کے تماشے کو ضلعی ناظمین اور نائب ناظمین جعلی ووٹوں سے کامیاب بنائیں گے۔''فوجی شعبدہ باز'' الیکشن سے قبل ریفرنڈم کروا کر عام انتخابات کے لیے دھاندلی کی شفاف بنیاد فراہم کر رہے ہیں۔میں کہتی ہوں مشرف آئیں، وردی اُتاریں، الیکشن لڑیں پھر میں دیکھوں گی کہ اُن کو کون ووٹ دیتا ہے۔ڈنڈے کے زور پر ریفرنڈم میں فرضی اکثریت حاصل کرنے کے عمل کو ''فوجی شعبدہ باز'' پاکستانی سیاسی کلچر کا مستقل حصہ بنانا چاہتے ہیں۔سیاست دانوں نے ملکی ترقی اور سالمیت کے لیے ایک ترقی پسند اسلامی جمہوری آئین دیا مگر فوجیوں نے اسے بُری طرح پامال کیا اور فوجیوں کی ہوس اقتدار نے ہی ملک کے ٹکڑے کیے۔یہ سراسر جھوٹ ہے کہ 90 فیصد سیاسی جماعتیں ریفرنڈم کی حامی ہیں۔''فوجی شعبدہ باز'' کو صرف یہ دیکھنا کافی ہے کہ سب سے بڑی جماعت پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن)، ایم کیو ایم اور جماعت اسلامی تو ریفرنڈم کی مخالف ہیں پھر

ریفرنڈم کا تماشا کس کی حمایت سے ہونے والا ہے؟ بہتر ہے کہ ''فوجی شعبدہ باز'' ریفرنڈم کا تماشا کر کے قوم کو دوبارہ ضیاء الحق عہد کی ظلمت میں نہ اُتاریں۔ ابھی تو قوم ایک ضیاء الحق کے لگائے ہوئے کانٹوں اور کرچیوں سے اپنی ایڑھیاں صاف کر رہی ہے۔ پھر وہ کسی نئے ضیاء الحق کے زخموں کی تاب کیسے لا سکے گی۔ میں تمام سیاسی جماعتوں سے اپیل کرتی ہوں کہ وہ ریفرنڈم کے جن کو بوتل سے باہر نکلنے سے روکنے کے لیے متحد ہو کر میدان عمل میں اُتریں اور جمہوری قدروں کو مزید پامالی سے بچائیں۔ پاکستان اکیسویں صدی میں نہ تو ریورس گیئر لگانے اور نہ ہی کسی نئے ضیاء الحق کا متحمل ہو سکتا ہے۔ مشرف اپنے پیش رو کی طرح امیر المومنین بننے سے باز رہیں اور سابقہ تجربوں سے سبق حاصل کریں۔

پی پی پی نے کل بھی آمریت کا راستہ روکا تھا اور اب بھی جمہوریت کے سورج کو آمریت کے گرہن سے بچانے کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کرے گی۔ پی پی پی ''فوجی شعبدہ باز'' سے مطالبہ کرتی ہے کہ فقط اپنی مرضی کے بجائے الیکشن کی شکل میں پوری قوم کی مرضی حاصل کرے اور ریفرنڈم جیسا ڈمی ہتھیار استعمال کرنے سے باز رہے۔ ''فوجی شعبدہ باز'' اگر آج بھی شفاف الیکشن کروا کر گھر چلا جائے تو قوم اسے اچھے لفظوں سے یاد کرے گی مگر اقتدار کا نشہ اُن کو اس بات پر لے آیا ہے کہ اب اُن کا اقتدار کے بغیر گزارا نہیں۔ دوسری طرف عمران خان، لغاری، اظہر، طاہر القادری اور ''ہم خیالی'' قماش کے لوگ ''فوجی شعبدہ باز'' کی میز سے کچھ بچے کھچے ٹکڑے اُٹھانے کے لیے اُن کے طواف میں مصروف ہیں۔ ''میں میں'' ہوں کی رٹ لگانے والے قدرت کی بے آواز لاٹھی کی گونج بھی سنیں۔ ''میں'' انسان کو اکثر اوقات عبرت ناک انجام سے دوچار کر دیتی ہے۔

''فوجی شعبدہ باز'' کو علم ہونا چاہیے کہ بے نظیر بھٹو ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی سربراہ ہے اور نواز شریف دوسری بڑی جماعت کا سربراہ ہے۔ دونوں کو الیکشن سے باہر رکھنا کیا 14 کروڑ عوام کی توہین نہیں؟ دراصل ''فوجی شعبدہ باز'' کو خوف ہے کہ اگر بے نظیر کو الیکشن لڑنے دیا جاتا ہے تو وہ اپنی پارٹی سمیت تیسری بار اقتدار میں آتی دکھائی دیتی ہیں۔ لہٰذا انہوں نے بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی تقریر میں میری الیکشن میں شمولیت کے امکان کو رد کر دیا اور مجھے پاکستان میں آنے سے روکا۔ اقتصادی بہتری کے تمام دعوے جھوٹ کا پلندہ ہیں اور اقتدار کو قائم رکھنے کی ذاتی خواہش ہے۔ ''فوجی شعبدہ باز'' نے ضیاء الحق اور ایوب خان کی جدید انداز میں نقالی کی ہے۔ حالانکہ آئین میں صدارتی انتخابات کا طریقہ درج ہے۔ مشرف وہ کیوں نہیں اپناتے؟ اس لیے کہ

انہیں کوئی ووٹ نہیں دے گا لہٰذا وہ گن پوائنٹ پر عوامی رائے کو اغوا کرنے چل پڑے ہیں۔

میں روزنامہ ''نوائے وقت'' کے ایڈیٹر کی جرأت مندانہ آواز کو خراج تحسین پیش کرتی ہوں۔ تمام کالم نگاروں اور اخبار نویسوں سے استدعا کرتی ہوں کہ وہ ''نوائے وقت'' کی طرح اپنے ضمیر کی آواز کو بلند کریں۔ اب صحافت اور عدالت کا کڑا امتحان ہے۔ دونوں اداروں کو عوامی رائے کو مقدم رکھتے ہوئے صدر کو غیر آئینی اور غیر جمہوری اقدام سے باز رکھنے کے لیے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ ''فوجی شعبدہ باز'' نے سینئر دانشوروں اور کالم نگاروں کی سوچ کا مذاق اُڑا کر ایک معزز طبقے کی توہین کی ہے۔ آج اخبارات ایک غیر آئینی اور غیر جمہوری حکمران کو تو ''لیڈ سٹوری'' پر جگہ دے رہے ہیں مگر ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کے بیانات ایک، یا دو کالمی اور ڈمی انداز میں شائع کر کے صحافت کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ اس معاملے میں بھی انصاف ہونا چاہیے۔ ''فوجی شعبدہ باز'' 3 ارب روپے ریفرنڈم پر خرچ کرنے کے بجائے بے روزگاروں کے روزگار پر صرف کرے۔ سرکاری خزانے سے ناظمین پر جو مشرف کے حق میں اشتہارات دے رہے ہیں اُن کا بھی کوئی احتساب ہونا چاہیے۔

فوج کا سیاست میں مستقل کردار ملک کو خوفناک بحرانوں سے دوچار کر سکتا ہے۔ بیرونی مداخلت کی اجازت پر مبنی مشرف کے اقدامات سے یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ ہم اپنے معاملات خود سنبھالنے کے قابل نہیں رہے۔ جنرل مشرف نہ صرف آئندہ 22 برسوں کے لیے اقتدار کے خواہش مند ہیں بلکہ وہ مزید 5 سال تک آرمی چیف بھی رہنا چاہتے ہیں گویا وہ آنے والے دنوں میں پاکستان کے مقدر سے کھیل کر اُس کے مزید ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔ جس کی قوم کبھی اجازت نہیں دے گی۔

افغان خواتین

آج دنیا میں ڈرامائی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ ان تبدیلیوں میں افغان خواتین کی زندگی میں تبدیلیاں ایک بڑی تبدیلی ہے۔ طالبان کا اقتدار ختم ہو جانے کے بعد افغانستان کی خواتین گھٹن کی فضا سے نکل کر آزادی کی سانسیں لے رہی ہیں۔ اب انہیں اپنی مرضی سے پہننے، اوڑھنے، کہیں آنے جانے اور کام کرنے کی آزادی ہے۔

افغانستان کے معاشرے میں خواتین کے لیے بدلی ہوئی فضا کو اس بات سے بھی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ نامزد کرزئی حکومت میں دو خواتین کو وزیروں کے عہدے دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک خاتون ملک کی نائب وزیر اعظم ہوں گی۔ یہ اعلیٰ عہدہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ افغانستان میں خواتین پر اعتماد کا اظہار کیا گیا ہے۔

یہ سیاسی کامیابی اس جدوجہد کے نتیجہ میں خواتین کو ملی جس میں انہوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ افغان خواتین طالبان مخالف مہم میں سرگرم رہیں۔ افغان خواتین کی اس مہم کی ساری دنیا میں مختلف گروپوں نے حمایت کی۔ جب افغانیوں کے مختلف گروپ اقوام متحدہ کے نمائندہ برائے افغانستان جناب لخدا براہیمی کے ساتھ بات چیت کے لیے جرمنی کے شہر بون میں اکٹھے ہوئے، اس وقت اٹلی کی پارلیمنٹ کے ممبر کی سربراہی میں خواتین کا ایک گروپ بنا جس نے کابل کی انتظامیہ میں خواتین کی نمائندگی کا مطالبہ کیا۔

اس پس منظر میں ایک خاتون نے اس بارے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کا نام ایما بونینو ہے۔ وہ دنیا بھر میں دیگر خواتین گروپوں سے مل کر اس بات کو یقینی بنا رہی تھیں کہ یکم دسمبر کو ساری دنیا میں

خواتین کو افغانستان کے نئے نظام میں نمائندگی دینے کے لیے مطالبہ کیا جائے۔

افغانستان کے پڑوسی ملک پاکستان میں بھی خواتین سرحد پار اپنی خواتین بہنوں کی حمایت میں جمع ہوئیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی خواتین عہدیدار اور سابقہ ممبران پارلیمنٹ اسلام آباد آئیں تا کہ وہاں اقوام متحدہ کی عمارت کے سامنے افغان خواتین کی حمایت میں مظاہرہ کریں۔ انہوں نے اقوام متحدہ کو افغان خواتین کی افغانستان میں نمائندگی کے بارے میں سفارشات پیش کیں۔ پاکستان میں خواتین کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور فوجی حکومت نے اُن خواتین کے خلاف پولیس استعمال کی اور چند خواتین کارکنوں کو گرفتار بھی کیا لیکن یہ خواتین ثابت قدم رہیں۔

محترمہ بونینو کے اس اقدام سے یہ ظاہر ہو گیا کہ پوری دنیا کے سارے اہم گروپوں کا تعاون کتنا ضروری ہے۔ ٹیکنالوجی نے مراسلات کی ترسیل اور لوگوں کے ایک دوسرے سے رابطہ کو بہت آسان اور سستا بنا دیا ہے۔ یہ مظاہرے ساٹھ ملکوں میں کیے گئے جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔

اب جب کہ افغانستان میں جنگ کے بعد عوام دوبارہ اپنی زندگی کو معمول پر لانے کی کوششیں کر رہے ہیں بین الاقوامی برادری سے اُمید کی جا رہی ہے کہ وہ ایک اہم کردار ادا کرے گی۔ بون میں ہونے والی بات چیت کی کامیابی کا بڑا انحصار اس بات پر ہے کہ افغان پارٹیاں اس حقیقت سے آشنائی کریں کہ افغانستان کے معاشرے کی تعمیر کے لیے اقتصادی تعاون کی ضرورت ہے۔ ورلڈ بینک سے اُمید کی جا رہی ہے کہ وہ اس بارے میں سب سے اہم کردار ادا کرے گا۔

اکیسویں صدی میں خواتین اہم سیاسی قوت کے طور پر اُبھر رہی ہیں۔ اُن سے اُمید کی جا رہی ہے کہ وہ سامنے آ کر بچوں کی نگہداشت اور خاندان کی بھلائی اور بہتری کے مسائل کے لیے حکومتی اور قومی سطح پر نمٹیں گی۔ یہ بھی اُمید کی جا رہی ہے کہ بین الاقوامی برادری افغانستان کی اقتصادی بحالی کرتے ہوئے خواتین پر خصوصی توجہ دے گی۔

کچھ عرصے پہلے پڑھے لکھے افراد نے غربت اور تضادات کے درمیان رشتہ ثابت کیا۔ انہوں نے کہا کہ جو ملک تضادات میں اُلجھے ہوئے ہیں وہ غریب ہیں۔ اب یہی دانشور ایک اہم رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ خواتین کے حقوق اور غربت کے درمیان ہے۔ جو ممالک خواتین کو اُن کے حقوق دیتے ہیں وہ ملک غربت ختم کرنے کے لیے بہتر طور پر عمل کر سکتے ہیں اور وہ تعلیم اور صحت کی سہولتوں کے لیے بہتر ذرائع پیدا کر سکتے ہیں۔ صحت اور تعلیم پر خرچ کرنے سے وہ ممالک اقتصادی پیداوار بڑھا سکتے ہیں اور کرپشن کم کر سکتے ہیں۔

اس وقت افغانستان میں خواتین اور مردوں کے درمیان بہت فرق ہے۔ پاکستان میں بھی خواتین اور مردوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔ بہر حال بین الاقوامی برادری خواتین کے حقوق پر توجہ دینے کی وجہ سے یہ فرق کم کرنا چاہتی ہے۔

پچھلی چوتھائی صدی میں دنیا بھر میں خواتین کی حالت میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ پرانے دقیانوسی خیالات کی جگہ اب نئے معیار نے جگہ بنالی ہے۔ یہ نئے معیار خواتین کو سامنے لا کر معاشرہ کی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کرنے میں مدد دے رہے ہیں۔ لیکن ابھی بھی خواتین کو بڑا فاصلہ طے کرنا ہے۔ ابھی بھی ترقی یافتہ ملکوں، جیسا کہ امریکہ، میں بھی خواتین کی آمدنی مردوں کے مقابلہ میں کم ہے، حالانکہ خواتین کام بھی مردوں کے برابر کرتی ہیں۔ خواتین کے پاس کم سرمایہ اور ذرائع ہیں۔ ابھی بھی پارلیمنٹ، تجارت، پیشہ ورانہ کاموں، بیوروکریسی اور فوج، وغیرہ میں عورتوں کی نمائندگی بہت کم ہے۔

اب مزید خواتین کے تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے یہ صورت حال تبدیل ہو جائے گی۔

اقوام متحدہ کی جانب سے خواتین کی بیجنگ کانفرنس اس حوالے سے نہایت اہم اقدام تھا۔ ساری دنیا ایک جگہ جمع ہوئی اور خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے کا عزم کیا۔ پاکستان بھی 1995ء کے اس اجلاس میں شامل تھا اور پاکستان نے اس کنونشن پر دستخط کیے جس میں خواتین کے خلاف تعلیمی میدان میں تعصب ختم کرنے کا عہد کیا گیا تھا۔

پچھلے سال حالات تیزی سے تبدیل ہوئے۔ جب تک طالبان اقتدار میں تھے اُس وقت تک افغان خواتین کی بہتری کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ لیکن ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملوں نے صورتِ حال یکسر بدل دی۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا اب کبھی بھی پہلے کی طرح نہیں رہے گی۔ کتابیں اور رسالے اس موضوع پر شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن افغانستان اور پاکستان میں عوام کو علم ہے کہ دنیا کی اس تبدیلی کے حوالے سے ایک اہم عنصر موجود ہے اور وہ عنصر ہے خواتین کے حقوق اور کردار جو وہ افغانستان میں حاصل کریں گی۔

افغانستان میں جس گروپ کو سب سے زیادہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا وہ خواتین ہیں۔ بیس سالوں تک انہوں نے جنگ اور موت کا سامنا کیا۔ اُن کے مرد حضرات ایک کے بعد ایک کر کے مارے جاتے رہے۔ خواتین جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔ وہ جوان مائیں نہ تو کوئی کام کر سکتی تھیں اور نہ ہی انہیں گھر سے نکلنے کی آزادی تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہیں اپنے بھوکے بچوں کا پیٹ پالنا تھا۔ اُن کی زندگیاں عذاب تھیں لیکن انہوں نے بہادری کے ساتھ اپنے بچوں کی خاطر سارے مصائب

وآلام کا سامنا کیا۔

افغان خواتین کی جدوجہد چیلنجوں کے سامنے بہادری کی داستان ہے۔ ہزاروں مشکلات کے باوجود یہ نا اُمیدی، تکلیف اور دکھ درد کا سامنا کرنے کی داستان ہے۔

امن کی فضا میں رہنے والوں کو اس بات کی خبر نہیں ہوتی کہ جنگ کی فضا میں رہنے والی خواتین پر کیا گزرتی ہے۔ امن کی فضا میں رہنے والی خواتین اس وقت تک جنگ کو نہیں سمجھ سکتیں جب تک کہ خدا تعالیٰ ان سے امن کی صورت نہ واپس لے لے۔ افغان خواتین کے جذبہ سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے لیکن سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ انہوں نے امن کے لیے سب کچھ بہادری سے برداشت کیا۔

امن ہی انسان کو انسان بناتا ہے۔ جنگ انسانیت کا لبادہ نوچ پھینکتی ہے۔ بہت سارے مہاجرین انسانیت سے نیچے کی سطح پر کیمپوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ اُن کے بچے بھوک سے بلبلاتے ہیں اور اُن کے جسم لاغر ہو چکے ہیں۔ افغانستان میں خواتین کی حالت بھی خراب تھی، وہ زندہ درگور تھیں۔

لاتعداد لمبی راتیں اور دن اُن خواتین نے بہت ہی کم اُمید کے ساتھ گزارے۔ ایک پوری نسل جنگ میں پروان چڑھی۔ اب اس نسل کو وہ موقع ملا ہے جو اُن کے والدین کو نہیں ملا تھا۔ اب نئی افغان حکومت میں خواتین کے وزیروں کے عہدوں پر تقرری کے بعد افغانستان نے آگے کی جانب ایک بڑا قدم اُٹھایا ہے اور اس موقع پر ساری دنیا کی خواتین اُن کے لیے نیک خواہشات رکھتی ہیں۔ ایک خاتون کی کامیابی ساری خواتین کی کامیابی ہوتی ہے۔

وفاقی بجٹ 2002-2001ء!

وزیرِ خزانہ کی ناکامیوں کی داستان

وفاقی بجٹ 2002-2001ء تاریخی تسلسل میں باہم مخالف ومتضاد عناصر کو اکٹھا کر کے بنایا گیا ہے۔ درحقیقت یہ بجٹ دگرگوں معاشی حالات اور مالی اعداد وشمار کے ہیر پھیر کا منبع ہے، جسے سادہ الفاظ میں ایک ''سٹیریو ٹائپ'' بجٹ ہی کہا جانا چاہیے۔ بجٹ معاملات کو سمجھنے والے یقیناً اس سے مایوس ہی ہوئے ہوں گے کیونکہ اس بجٹ میں سرکاری ماہرین نے قوم کے سامنے جو اعداد وشمار پیش کیے ہیں، دراصل صورتِ حال اُس سے کہیں بُری ہے۔ بجٹ کے حق میں دیئے گئے دلائل اس لیے بودے ہیں کیونکہ متعارف کرائی گئی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنائے جانے کے بعد وہ نتائج یقیناً حاصل نہیں ہوسکیں گے، جن کا دعویٰ حکومتی ترجمان کر رہے ہیں۔ سٹیٹ بنک آف پاکستان نے بھی اپنی اقتصادی جائزہ رپورٹ میں جو حقائق پیش کیے ہیں وہ بجٹ میں دیئے گئے اعداد وشمار سے کہیں میل نہیں کھاتے۔ ساتھ ہی قومی پیداوار کی شرح نمو میں بھی منفی رجحان دیکھنے میں آیا ہے۔ درست الفاظ میں تو یہی لکھنا پڑے گا کہ بڑھتی ہوئی آبادی اور قومی پیداوار کی شرح نمو کا تقابل قومی ترقی کی شرح کو منفی ڈگری پر ہی دکھاتا ہے۔

ملٹری لیڈر کی سربراہی میں ہونے والے قومی اقتصادی کونسل کے اجلاس میں بجٹ 2002-2001ء کی منظوری دی گئی۔ بدقسمتی سے ہمارے ماہرین نے غلط اعداد وشمار اور دروغ گوئی کا سہارا لیتے ہوئے اصل حقائق کو عوام سے چھپایا ہے، جو قوم سے صریح بددیانتی کے مترادف ہے،

حالانکہ بجٹ مرتب کرنے والے سٹیٹ بینک کی رپورٹ میں پیش کی گئی معیشت کی زبوں حالی اور قومی اخبارات میں اس کی اشاعت سے بے خبر نہیں تھے۔ اسے حکومت کے مالیاتی مینیجرز کی بددیانتی کہا جائے، یا پھر حقائق سے بے خبری؟ یہ صورتِ حال وزیرِ خزانہ کے لیے ایک چیلنج سے کم نہیں۔ پہلے ہی سال معاشی اہداف کے حصول میں ناکامی پر ان کی اچھی خاصی سبکی ہو چکی ہے۔ ان سے تو یہی توقع کی جارہی تھی کہ وہ معیشت کی بہتری کے لیے فنڈز کے نئے ذرائع تلاش کریں گے اور یوں غیر ملکی امداد کے سہارے معیشت کی کشتی کو اس بھنور سے نکال لیں گے، لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ تاہم موجودہ معاشی ڈھانچے کو ہدفِ تنقید بنانا ایک بے معنی سی بات ہے، درحقیقت معیشت اس قدر بُری حالت میں ہے کہ ہم سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی۔ اقتصادیات کے تقریباً سبھی شعبوں میں گراوٹ کا رجحان ہے، اور پھر وقتاً فوقتاً اسے ملنے والے ''معاشی دھچکے'' بھی اس کی صحت کے لیے انتہائی مضر ثابت ہوئے ہیں۔ ان حالات میں بیرون ملک خدمات سرانجام دینے والے پاکستانی اپنی جگہ ایک علیحدہ خوف کا شکار ہیں۔ وہ محض اس خدشے کے تحت رقوم بنکوں کے ذریعے نہیں بھجواتے کہ کہیں پھر ماضی کی طرح معاشی بدحالی کے ہاتھوں ''بلیک میل'' ہو کر حکومت فارن کرنسی اکاؤنٹ منجمد نہ کردے۔ بیرونی سرمایہ کاری کے رُک جانے کی ایک بڑی وجہ ملک کے یہی غیر یقینی حالات ہیں۔ اسی باعث ہمارے زرمبادلہ کے ذخائر بھی خطرناک حد تک کم ہو گئے۔ اسی اثناء میں ورلڈ بنک نے 350 ملین ڈالر کی قسط جاری کر کے ہمیں وقتی طور پر اس صورتِ حال سے نکال لیا۔

ہم جن اقتصادی حالات میں زندہ ہیں اُن میں آگے کی طرف دھکا لگانے کے لیے قرضوں کی ضرورت ہے جو ہمیں ملنے کے باوجود ہمارے لیے فائدہ بخش ہونے کے بجائے اُلٹا نقصان رساں ثابت ہو رہے ہیں۔ اُوپر سے بجٹ توافق و تصادم کا ایک امتزاج ہوتا ہے اور سیاست کے ذریعے ہم توافق و تصادم کے فرق کو کم کر سکتے ہیں۔ سیاسی عمل دو طرح سے کام دکھاتا ہے: ایک طرف تو تصادم کو ہوا دیتا ہے اور دوسری طرف موافق عناصر کو باہم یک جا کر کے عدم اتفاق ختم کر دیتا ہے۔ یہاں سفارتی تدبر سے عاری وزیرِ خزانہ کو مخالف نظریات کے حامل افراد سے واسطہ پڑا ہے، جنہیں ہم بیوروکریٹ کہتے ہیں۔ جس بات پر زیادہ زور دیئے جانے کی ضرورت ہے وہ اس طریق کار سے متعلق ہے جو اب بہت پرانا ہو چکا ہے لیکن اب بھی ہمارے ہاں بجٹ اسی فرسودہ طریق کو سامنے رکھ کر بنایا جاتا ہے، اور اس حقیقت کو سرے سے ہی نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ کس طرح سے ہماری قوم کو تباہی کے دہانے کی طرف دھکیل رہا ہے۔ اگرچہ مسٹر شوکت عزیز نے بڑے بڑے دعوے کیے ہیں لیکن صورت حال یہی ہے کہ وہ معاشی بحالی کے لیے تاحال کوئی قابلِ عمل اور

نتیجہ خیز پروگرام تشکیل دینے میں ناکام رہے ہیں۔

بجٹ میں پیش کردہ اعداد وشمار انتہائی گمراہ کن ہیں اور اُن کی بنیاد پر مرضی کی حکمتِ عملیاں تیار کرنا مشکل امر ہے۔ جنرل مشرف کے ایک سالہ دورِ حکومت کی طرح یہ اُن کا پیش کردہ بجٹ بھی مایوس کن ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقتصادی نمو کی نسبت قرضوں میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرضوں میں اضافہ اور اُن کے تسلسل سے کوتاہی برتنا ہمیشہ سنگین مالی مسائل کا باعث بنتے رہے ہیں۔

پہلا مسئلہ قومی آمدنی کا تخمینہ لگانے کے طریقے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے بجٹ مرتب کرنے والی قوتوں کی سمت درست نہیں۔ ہمیں توافق وتصادم کے فرق کو کم کرنے کی ضرورت ہے۔ ٹیکس پالیسی میں بھی بے شمار خامیاں ہیں۔ اگر چہ اسے بہتر بنانے کی کوششیں تو بہت کی گئیں لیکن اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جانا چاہیے کہ ٹیکس پالیسی ثقافتی بندشوں سے لگاؤ کھاتی ہو اور اُن سے ہم آہنگ بھی ہو۔ حکومت کی نئے ٹیکس دہندگان تک رسائی کے باوجود اس بات کے مواقع انتہائی کم ہیں کہ وہ اپنے مقرر کردہ اہداف کے مطابق ٹیکس اکٹھا کر پائے گی۔ یہاں پھر سیاسی تعلقات کا پہلو سامنے آتا ہے۔ حکومتی اخراجات پر ہمیشہ ہی تنقید ہوتی رہتی ہے۔ دفاعی اخراجات اگر چہ حکومت کی صواب دید ہے تاہم انہیں ان ممالک سے زیادہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے جن سے ہم ہمہ وقت اپنا موازنہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زیادہ آمدنی والے لوگ اپنی درست آمدنی چھپا کر انکم ٹیکس بچا لیتے ہیں۔ نتیجتاً حکومت کا ہدف پورا نہیں ہوتا اور وہ مزید ٹیکس لگاتی ہے جس سے ٹیکس چوری کے رجحان کو اور تقویت ملتی ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ معاشی بحالی کے جو دعوے وزیر خزانہ کر رہے ہیں ان میں سرے سے جان ہی نہیں۔ بہت سی بنیادی خرابیوں میں سے ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اعداد وشمار کی ایک مخصوص زبان ہے اور اس زبان کو بگاڑ کر ماہرین ویسے ہی بیان کر رہے ہیں جیسے وہ چاہتے ہیں، لیکن معاشی استحکام کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو ہمیں ان اعداد وشمار میں کوئی حقیقت محسوس نہیں ہوتی۔ درحقیقت ہم معاشی بدحالی کا بُری طرح سے شکار ہیں۔ ہماری معیشت کی حالت اس ریلوے انجن کی سی ہے جس میں بھاپ ہی نہیں اور ہم اس میں فرسودہ طریقوں سے تیل ڈال کر اسے گھسیٹ رہے ہیں اور اس کے ذمہ دار مسٹر شوکت عزیز ہیں جو اس انجن کو تیل فراہم کرنے کے جدید ذرائع ڈھونڈنے میں ناکام رہے ہیں۔ ملک پر قرضوں کا بہت بڑا بوجھ ہے اور یہ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ حالات میں بہتری کے بجائے بگاڑ ہی آتا جا

رہا ہے اور اس کی وجہ ہماری گرتی ہوئی معاشی ساکھ ہے۔ ہمیں سیاسی تبدیلی سے پیدا ہونے والے حالات پر نظر رکھنا ہوگی اور ماضی، حال، اور مستقبل کے فرق کو سامنے رکھ کر فیصلے کرنا ہوں گے۔ بجٹ اب بھی کارکردگی کا پیمانہ، قوت عمل اور حکومت چلانے کے بارے میں حکمت عملی کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ بجٹ اقتصادی معاملات اور موثر بہ لاگت (Cost effective) ترقیاتی منصوبوں کے ذریعے مستقبل کو مزید درخشاں بنا سکتا ہے۔ آج کل بجٹ محدود دائرہ میں قید دکھائی دیتا ہے۔ آج بھی بجٹ کو پرانی ترجیحات کے مطابق مرتب کیا جا رہا ہے جس سے حکومت کے پاس اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کا امکان کم ہو کر رہ جاتا ہے۔

دوسرا مسئلہ غیر یقینی پن ہے۔ بجٹ تخمینہ جات طویل مدت سے غیر یقینی صورت حال کا شکار رہے ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں: ایک یہ کہ معیشت خود غیر یقینی پن کا شکار ہے اور دوسری یہ کہ فوجی حکومت کی چھوٹی اور جزوی ترجیحات بڑی معاشی ترجیحات میں بدل چکی ہیں۔ بجٹ کی حالت اس غیر یقینی کیفیت سے کسی لحاظ سے ہم آہنگ نہیں۔ بجٹ کے ضابطے بھی اس کیفیت سے چھٹکارہ نہیں دلا سکتے۔

اس غیر یقینی پن سے حسب ذیل کوششوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے:

سیاسی استحکام کے لیے تبدیلیوں کو واضح ہونا چاہیے۔

جہاں مواقع موجود ہوں وہاں معاشی اُمور کی ترجیحات کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ عام طور پر مواقع کے حصول کے لیے منڈیاں ساز گار ہیں۔

تیسرا مرحلہ مالی شعبے سے متعلق ہے۔ بجٹ میں دو اُمور کو روایتی کہا جا سکتا ہے، ایک یہ کہ ٹیکس کے دائرے کو وسیع کرنا اور دوسرا حکومتی اخراجات میں کمی کرنا۔ پاکستان میں یہی جھگڑا کھڑا ہے کہ ٹیکس کون دے گا اور اس سے فائدہ کون اُٹھائے گا۔ ٹیکس کا بوجھ کس طرح تقسیم کیا جائے۔

موت ایک وزیر کی!

کراچی میں ہونے والی پاکستان کے سابق وفاقی وزیر عمر اصغر خان کی موت پر شکوک و شبہات کے بادل اُمنڈ رہے ہیں۔ عمر اپنے کمرے میں اُس وقت مردہ پائے گئے، جب اُن کے اہلِ خاندان نے اُن کے کمرے کا دروازہ (نہ کھلنے پر) توڑا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ انہوں نے خودکشی کی ہے اور اس ضمن میں اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک خط بھی چھوڑا ہے۔ اُن کے قریبی ساتھیوں نے اس بات کی نفی کی ہے کہ عمر اصغر خان مایوس ہو رہے تھے۔ حکومت نے اُن کی موت پر اظہار رنج و غم تو کیا، مگر اس کی تحقیقات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

بعض لوگ عمر اصغر کی موت کا تعلق پنشن فنڈز کے غائب ہونے اور این جی اوز کے فنڈز کی غیر مناسب آڈیٹنگ سے جوڑتے ہیں، جو گزشتہ بلدیاتی انتخابات میں صرف کیے گئے تھے۔ عمر اصغر کی موت ایسے وقت میں واقع ہوئی ہے، جب امریکہ القاعدہ کو ملنے والے فنڈز کے ذرائع کی تحقیقات اور ''کالے دھن کو ''سفید'' کرنے کے طریقوں کی تلاش پر اربوں ڈالر صرف کر رہا ہے۔ اگرچہ القاعدہ افغانستان سے غائب ہو چکی ہے مگر اس کے ارکان کی تلاش پاکستان کے پہاڑی دروں میں جاری ہے۔

ذرائع ابلاغ کے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ القاعدہ کے قائد اسامہ بن لادن پاکستان کے قبائلی علاقہ میں پناہ گزین ہیں، مگر اسلام آباد کے فوجی آمر اس کی تردید کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ القاعدہ کو ختم کرنے کی کوششوں کا مرکز پاکستان میں منتقل ہو چکا ہے۔

عمر اصغر کے غمزدہ خاندان نے حکومت کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا لیکن اُن کی موت عالمی سطح کے

سکیورٹی معاملات کے تناظر میں ہوئی ہے۔عمر اصغر کی وزارت این جی اوز کے وسیع فنڈز کی نگران تھی، جو گزشتہ سال اگست میں منعقد ہونے والے بلدیاتی انتخابات کے دوران صرف کیے گئے، مگر وزارت نے اس پر دھیان نہ دیا۔ان دنوں این جی اوز کا معاملہ بھی متنازعہ ہورہا ہے، ان میں سے بعض کے بارے میں اس شبہ کا اظہار کیا جارہا ہے کہ وہ بعض عسکری تنظیموں کی ''فرنٹ تنظیمیں'' تھیں، جن پر اب پابندی عائد کی جاچکی ہے۔ یہ پابندی 11 ستمبر کے امریکہ میں حملوں کے بعد عائد کی گئی تھی۔ امریکہ کے صدر نے بھی بعض ٹرسٹوں پر پابندی عائد کی ہے، جو بظاہر رفاہی اور معاشرتی امدادی کاموں کے لیے قائم کیے گئے تھے۔عمر اصغر کی وزارت حکومت کے زیر کنٹرول پنشن فنڈز کی بھی نگران تھی، جو بڑی رقوم پر مشتمل ہوتے ہیں۔عمر اصغر نے پنشن فنڈ میں 10 کروڑ ڈالر کے غبن کی خبریں عام ہونے کے فوراً بعد مشرف کی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ان پر اس غبن کے سلسلے میں کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا، لیکن بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ عمر اصغر کو بہت سی اندرونی باتوں کا علم تھا۔

معمر ملازموں کی پنشن کے فنڈز (EOBI) کے غبن کی خبروں کے بعد اس معاملہ سے متعلق عمر اصغر کی یہ خودکشی، اس نوع کی دوسری واردات ہے۔جس اکاؤنٹنٹ نے ان فنڈز کو ای او بی آئی سے ایک بنک میں منتقل کیا تھا، جہاں سے یہ فنڈز غائب ہوئے، اس نے بھی ''خودکشی'' کی تھی۔ فنڈز میں غبن کا معاملہ بھی محض حادثاتی طور پر سامنے آ گیا تھا۔ یہ معاملہ ایک دیانت دار افسر نے تحقیقات کے دوران دریافت کیا، مگر اس دیانت دار افسر کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب اسے کوئی انعام دینے کے بجائے اس کے خلاف مقدمہ شروع کردیا گیا، جب کہ وہ انعام کی توقع کررہا تھا۔ اس نے قومی احتساب بیورو (نیب) کے چیئرمین کو 3 اگست، 2001ء کو اپنے خلاف مقدمہ کے بارے میں تحریری شکایت بھی کی۔اس نے نیب کے چیئرمین کو جو رپورٹ بھجوائی وہ 114 صفحات پر مشتمل تھی، مگر اس کے خط، یا اس رپورٹ پر کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ اس کے بعد ہی نیب کے چیئرمین کو بھی ان کے منصب سے الگ کردیا گیا اور ان کا منہ بند رکھنے کے لیے انہیں ایک صوبے کا گورنر مقرر کردیا گیا۔قبل ازیں جب وہ واشنگٹن میں سرکاری فرائض انجام دے رہے تھے تو انہوں نے جعلی ڈالروں کا معاملہ بھی اُٹھایا تھا۔

ابھی یہ کہنا تو قبل از وقت ہوگا کہ غبن شدہ روپے کا تعلق سکیورٹی ایجنسیوں سے ہے، القاعدہ سے ہے، عسکری تشدد پسندوں سے ہے، یا اُن کرپٹ مجرم گروہوں سے ہے جو ملک میں کارروائیاں کرتے آرہے ہیں۔بعض شائع ہونے والی رپورٹوں میں کہا گیا ہے کہ طیارہ کے اغوا

کنندہ عطاء کو (یہ طیارہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرایا تھا) جو رقم ملی تھی، وہ اسلام آباد کے راستے گئی تھی۔

1993ء میں مہران بنک کی اچانک ناکامی کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ سکیورٹی ایجنسیاں غیر قانونی طور پر سرکاری فنڈز کا استعمال کر رہی ہیں۔ عمر اصغر کے والد نے سپریم کورٹ میں درخواست دائر کی، جس میں اس سلسلے میں کارروائی کی استدعا کی گئی تھی۔ اس غیر قانونی حرکت میں ملوث ایک شخص ان دنوں سعودی عرب میں پاکستان کے سفیر ہیں، دوسرے صاحب پنجاب میں امن و امان کی نگرانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انہیں اس وقت شہرت ملی، جب ڈینیئل پرل کے مبینہ قاتل نے خود کو اُن کے حوالے کیا۔ اس دوران پیرس (فرانس) میں ایک اور پاکستانی بنک آفیسر کو گرفتار کیا گیا۔ یہ گرفتاری فرانسیسی حکام کی ہدایت پر عمل میں آئی۔ اس آفیسر پر کالے دھن کو سفید کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ بعض دوسرے پاکستانی بنک بھی، جن میں بینکرز ا یکویٹی بھی شامل ہے، اچانک بیٹھ گئے۔ ان کا آڈٹ بڑی خاموشی کے ساتھ کیا گیا۔ مگر کیا حقائق سامنے آئے، عوام کو کچھ پتہ نہیں۔

ایسی اطلاعات بھی ملی ہیں کہ پاکستان کی فوجی حکومت بیرون ملک ایک ''ٹرسٹ'' قائم کرنا چاہتی ہے، جس میں بھاری رقوم ہوں گی۔ ٹرسٹ بیرون ملک قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اسے ''کرپٹ سیاست دانوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔'' ایک شخص نے ٹرسٹ سے امداد کے لیے رابطہ پیدا کیا تو اُسے بتایا گیا کہ یہ روپیہ نجکاری کے ذریعے حاصل کیا جا رہا ہے اور اس کا استعمال سٹیٹ بنک آف پاکستان کے ذریعے ہوگا۔ مزید برآں اس رقم کو سوشل سکیورٹی کے تحت ادائیگیوں کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ یہ پیش کش بڑی مشتبہ اور مشکوک ہے۔ نجکاری کا عمل تو عالمی بنک، یا ملک کی وزارت خزانہ سے چھپا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ پھر سوشل سکیورٹی کے ذیل میں ادائیگی تو کسی خفیہ بیرون ملک تنظیم کے بجائے متعلقہ وزارت کے ذریعے کی جاتی ہے۔ چنانچہ شک اور امکان ہے کہ اس فنڈ میں موجود رقم کا ذریعہ حصول اور استعمال وہ نہیں، جو بیان کیا جا رہا ہے، بلکہ کچھ اور ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فنڈز آخر کس کے ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کہاں سے آ رہے ہیں اور کسے منتقل کیے جا رہے ہیں؟

اسلام آباد نے غیر ملکی زرمبادلہ میں اضافہ کے لیے 240 ارب روپے کے نوٹ چھاپے ہیں۔ اس بارے میں بھی بہت سی گفتنی و ناگفتنی باتیں ہو رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کئی سرکاری افسر سوٹ کیس بھر کر روپے لے کر گئے تاکہ کھلی منڈی سے ڈالر خریدے جائیں۔ آفیسروں کو اس پر کمیشن حاصل کرنے کی بھی آزادی تھی۔ اس روپے کو 4 ارب 50 کروڑ ڈالر میں تبدیل کر لیا گیا،

لیکن اس بات کا کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ وہ 240 ارب روپے کہاں گئے۔ (جونوٹوں کی صورت میں چھاپے گئے تھے۔) اُن کا ذکر ابھی تک ملک کے اندر موجود (سرکاری) رقم کے طور پر نہیں کیا گیا۔

اکتوبر 1999ء میں جنرل مشرف نے اقتدار سنبھالا تو پارلیمنٹ ختم کردی گئی، چنانچہ نامناسب مالیاتی اُمور کو پارلیمنٹ میں پیش نہ کیا جاسکا۔ جنرل مشرف نے وعدہ کیا ہے کہ اکتوبر کے انتخابات کے بعد پارلیمنٹ بحال کردی جائے گی۔ انتخابات کے صاف شفاف ہونے کے بارے میں کوئی اصلاحات تو روبہ عمل نہیں لائی گئیں، چنانچہ شکوک وشبہات اپنی جگہ موجود ہیں۔ بعض نکتہ چینیوں کا کہنا ہے کہ جنرل مشرف تو ایسے ارکان پارلیمنٹ چن چن کر لائیں گے کہ پارلیمنٹ محض ''ڈمی'' ہو، وہ اتنی کمزور ہو کہ متنازعہ معاملات کو اُٹھانے کی جرأت ہی نہ کرسکے۔

سالہا سال سے پاکستان کی فوجی اسٹیبلشمنٹ پاکستانی سیاست دانوں پر کرپشن کا الزام لگاتی رہی ہے۔ سیاست دانوں کا موقف یہ ہے کہ یہ الزامات فوج نے سیاسی انداز میں عائد کیے ہیں، ان کا مقصد سیاسی ہے اور فوج کے حامی حکومت پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق وہ دیانت دار تحقیقاتی افسر، جنہوں نے فنڈز کے غبن کا سراغ لگایا تھا، ایک اور بنک ''مسلم کمرشل بنک'' کے بارے میں بھی تحقیقات میں مصروف ہیں۔ اب اس بنک کا مالک یونائیٹڈ بنک آف پاکستان کو بھی خریدنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس بات پر تشویش کا اظہار کیا جارہا ہے کہ خلیج کے ممالک کے سرمایہ کاروں سے، جو پاکستان میں سرمایہ لارہے ہیں، اچھا سلوک نہیں کیا جارہا، کیونکہ فوجی حکومت کا جھکاؤ ملک کے اندر بینکنگ کے شعبہ میں اجارہ داری قائم کرنے کی طرف ہے۔

عمر اصغر خان ای او بی آئی کے فنڈز میں غبن کے عینی شاہد تھے، جس طرح وہ اکاؤنٹنٹ تھا، جو فوت ہوچکا ہے۔ عمر اصغر جانتے تھے کہ اس فنڈ کی رقم اُن کی جگہ کس نے پنشن فنڈ سے دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کی ہدایت کی، جہاں سے یہ غائب ہوگئی۔ عمر اصغر یہ سب راز اپنے ساتھ قبر میں لے گئے ہیں۔

دہشت گردی کا خاتمہ، جمہوریت کے ہاتھوں!

جمہوریتیں نہ تو جنگیں لڑتی ہیں اور نہ ہی بین الاقوامی دہشت گردی کوفروغ دیتی ہیں۔ جولائی میں امریکہ کے وزیر خارجہ کولن پاول جب جنوبی ایشیا کے دورے پر آئیں گے تو امریکہ کے ایجنڈے میں سرفہرست پاکستانی لوگوں کو بااختیار بنانا ہونا چاہیے۔ 11 ستمبر کے واقعات اور المیوں کے بعد عالمی برادری نے اپنی توجہ طالبان حکومت کے خاتمے، القاعدہ کو تباہ کرنے اور افغانستان میں مستحکم حکومت تشکیل دینے اور ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کم کرنے پر مبذول رکھی۔

یہ بات مغرب کے نوٹس میں نہیں آئی کہ جنرل پرویز مشرف کا عسکری جتھہ تسلسل کے ساتھ پاکستان کے جمہوری اداروں کو تباہ و برباد کررہا ہے۔ شیڈول کے مطابق نئی پارلیمنٹ کے لیے انتخابات 10 اکتوبر کو ہونے والے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف امریکہ کے لیے افغانستان کی تزویراتی اہمیت کو استعمال کرکے پاکستان کے انتخابی عمل میں دھاندلی کے ذریعے اپنی آمریت کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔

جنوبی ایشیا میں سلامتی اور، جیسے کہ 11 ستمبر کے واقعات نے ظاہر کیا، دنیا کی سلامتی شدید خطرات سے لاحق ہے۔ صرف جمہوری پاکستان ہی انتہا پسندی، عسکریّت پسندی اور دہشت گردی کا قلع قمع کرسکتا ہے۔ مختصر وقفوں کے لیے جب پاکستانی عوام کو جمہوری حکومت کا موقع دیا گیا تو انہوں نے تسلسل کے ساتھ اُن پالیسیوں کی مخالفت کی، جنہوں نے افغانستان میں دہشت گردی کو فروغ دیا اور ہمسایہ ملک بھارت کے ساتھ کشیدگی میں اضافہ کیا۔

عسکریت پسند پھر سے پاکستان میں منظم ہو رہے ہیں۔ گزشتہ برس افغانستان میں انہیں شکست ہونے کے بعد تباہ کن خودکش حملوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ معاشرے میں انتہا پسندی سے سختی کے ساتھ نمٹنا ضروری ہے، تاکہ داخلی اور بین الاقوامی سلامتی کو استحکام حاصل ہو۔ پاکستانی سماج کو اس برائی سے پاک کرنے کے لیے سیاسی جماعتیں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ وہ جماعتیں، جنہیں عوام کی وسیع تر حمایت حاصل ہے، انہیں چاہئے کہ وہ انتہا پسندی کی قوتوں کے خلاف عام آدمی کو متحرک کر کے سڑکوں پر لائیں۔

گزشتہ اپریل میں منعقد ہونے والے صدارتی ریفرنڈم سے یہ بات سامنے آئی کہ پاکستان میں عدم قناعت کی کیفیت بہت زیادہ ہے۔ نمائندہ پارلیمنٹ قومی بحث میں عوام کی شمولیت کے لیے موزوں فورم فراہم کرتی ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ دھاندلی پر مبنی انتخابی عمل عسکریت پسندوں کے ہاتھوں میں کھیلے گا۔ وہ بیلٹ (ووٹ) کے بجائے بلٹ (گولی) پر انحصار کریں گے۔

جنرل پرویز مشرف کے دور میں عسکریت پسند افغانستان اور کشمیر میں نازک صورت حال کی شکار سرحدوں پر صورتِ حال کو بگاڑنے میں کامیاب ہوئے۔ جب تورا بورا میں بمباری میں شدت پیدا ہوئی، یا جب پاکستان کے قبائلی علاقہ جات میں القاعدہ پر سختی کی جاتی ہے تو عسکریت پسند حملے سے بھارت کے ساتھ کشیدگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بھارت کے انحراف سے عسکریت پسندوں کو فائدہ پہنچتا ہے، جو بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، کیونکہ عالمی توانائیاں ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح دو ممالک کے درمیان جنگ ٹالنے میں صرف ہوتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ڈینیئل پرل کیس میں عدالت نے عمر شیخ کو سزائے موت کا جو فیصلہ سنایا ہے، اس سے پہلے مقبوضہ کشمیر میں 22 سویلین دہشت گرد حملے میں مارے گئے۔ مشرف حکومت تقریباً تین برسوں تک بلا شرکتِ غیرے لامحدود اختیارات کی حامل رہی۔ انہوں نے اُس وقت تک طالبان کی ناز برداری اُٹھائی، جب تک کہ صدر بش نے ''دوست، یا دشمن'' میں سے ایک کا انتخاب کرنے کو کہا۔ کشمیر کے متنازعہ مسئلے سے متعلق تقریباً تین تنازعات سے یہ قیادت ہم آہنگ رہی۔ حکومت نے بھاری ٹیکس عائد کیے، لیکن اس سے داخلی طور پر آمدنی (Revenue) میں اضافہ نہیں ہوا، بلکہ معیارِ زندگی میں کمی واقع ہوئی۔

امریکہ کے وزیرِ خارجہ کولن پاول کے دورے سے امریکہ کو یہ موقع ملے گا کہ وہ پاکستانی عوام کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شامل کر سکے اور پاکستانی عوام کے بنیادی اور جمہوری حق کی حمایت کر کے عسکریت پسندی کی قوتوں کو دیوار کے ساتھ لگا سکے۔ امریکی وزیرِ خارجہ کو خاص طور پر چاہیے کہ وہ:

1- جنرل مشرف کو متنازعہ آئینی ترامیم واپس لینے کو کہیں، جو مقننہ سے اختیارات لے کر فرد واحد کے ہاتھ میں تھمائی ہیں۔ اتفاق رائے اور برداشت کے لیے تکثیری معاشرے میں چیک اینڈ بیلنس کا ہونا ضروری ہے۔ پاکستان کے صدارتی آمرانہ اختیارات کو دیکھتے ہوئے۔ جس میں انتخابات کے بغیر وزیراعظم، پارلیمنٹ اور کابینہ کی یک طرفہ برطرفی بھی شامل ہے، کہا جاسکتا ہے کہ یہ انتہا پسندی کا نسخہ ہے۔

2- عالمی الیکشن مانیٹرنگ فورس تشکیل دیں، جو اس بات کی یقین دہانی کرائے کہ 10 اکتوبر کو پاکستان میں ہونے والے انتخابات تمام جماعتوں اور اُمیدواروں کے لیے کھلے اور شفاف ہوں۔ جنرل پرویز مشرف کے افسران ذاتی طور پر اپوزیشن کے اُمیدواروں کو خوفزدہ کر رہے ہیں اور نیا غیر حاضر باش قانون استعمال کر رہے ہیں اور اسے موثر بہ ماضی قرار دے کر لوگوں کو Popular Choices سے محروم کر رہے ہیں۔

3- جنرل پرویز مشرف پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ سیاسی قیدیوں کو آزاد کریں اور جلاوطنی کی زندگی گزارنے والے سیاسی قیدیوں کو واپسی کی اجازت دیں، جنہیں بدنام کیا گیا ہے اور سیاسی مقاصد کے لیے نشانہ بنایا گیا۔ نام نہاد احتساب کا قانون ڈھونگ ہے۔ وہ لوگ جو مشرف کے ساتھی ہیں، وہ آزاد ہیں چاہے وہ مجرم ہی کیوں نہ ہوں۔ سیاسی مخالفین کو عدالت کی طرف سے بری کیے جانے کے باوجود جیل میں ہی رکھا جارہا ہے اور اُن پر مزید الزامات عائد کردیئے جاتے ہیں۔

امریکی وزیرخارجہ کولن پاول اس بات کو واضح کرسکتے ہیں کہ امریکہ مستقبل کی امریکی امداد، عالمی قرضہ جات اور قرضوں میں ریلیف، شفاف اور عالمی سطح پر توثیق کردہ انتخابات کے انعقاد سے مشروط کرسکتا ہے، جس سے پاکستانی عوام کے بنیادی اور انسانی حقوق کی پاسداری ہو۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ ایک نئے مرحلے میں شروع ہوگئی ہے۔ پاکستان میں ایسے حالات ہیں، جو دہشت گردی کو فروغ دینے کے لیے بنیاد فراہم کرسکتے ہیں۔ آئندہ کئی برسوں تک یہ صورت حال برقرار رہے گی۔ یہاں تک کہ مغرب اور خاص طور پر امریکہ ایسا معاشرہ تشکیل دینے میں موثر کردار ادا کرے، جس کی بنیاد تکثیریت، تحمل اور جمہوریت پر ہو۔ ماضی میں بھی اور اب بھی جب کبھی انہیں اپنی مرضی کے مطابق رائے کی آزادی کا اظہار کرنے کا موقع دیا جائے گا، پاکستانی ایسی حکومت منتخب کریں گے، جو اُمید کی شمع جلائے گی۔

امریکہ کو پاکستان میں جمہوریت سے پہلوتہی کرنے سے باز رہنا چاہیے۔ دہشت گردوں اور

طالبان کے خوفناک خواب، جس نے دنیا کو تباہی سے دوچار کیا تھا، اسے دوبارہ وقوع پذیر ہونے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ جنوبی ایشیا اور امریکہ کی سلامتی کے لیے امریکی وزیر خارجہ پاکستانی لوگوں کی اس سلسلے میں مدد کر سکتے ہیں اور انہیں ضرور مدد کرنی چاہیے کہ وہ 10 اکتوبر کو اپنے مقدر پر آزادی کے ساتھ کاربند رہیں۔

شطرنج کی نئی عالمی بساط

گیارہ ستمبر ہماری تہذیب وتمدن کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کو دوسرا پرل ہار بر کہا جا سکتا ہے، جس سے ایک دور ختم ہو جاتا ہے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس بدقسمت دن دنیا کمیونزم کے خطرے سے باہر نکل آئی، جو ایک ایسا خوف اور ایک ایسا رویہ تھا، جسے روکنا ضروری تھا۔ دنیا ایک دوسرے دور میں داخل ہوگئی، جب اسلام اور مسلمان ممالک نے بظاہر ایک نیا خطرہ بن کر کمیونزم کی جگہ لے لی۔ ایک نیا خوف اور نئی دنیا، جسے روکنا ضروری تھا۔ امریکہ پر حملے سے جب ساری دنیا ہل گئی تھی، اس کے بعد بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ شہری آزادیوں کو دھچکا لگا ہے۔ امریکہ میں بہت سے مسلمان دہشت میں گھرے ہوئے ہیں کہ کہیں انہیں محض شک کی بنا پر پکڑ نہ لیا جائے۔ کچھ مسلمانوں نے اپنی داڑھیاں بھی منڈ والی ہیں اور نفرت سے بچنے کے لیے اپنا حلیہ تبدیل کر لیا ہے۔ اب بنیادی حقوق کے بجائے نئے دور کی آواز سلامتی کے لیے ہے۔ بہت سے مغربی ممالک اپنے تحفظ کے لیے اپنے آئینی حقوق اور شہری آزادیوں کی قربانی دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے نے مغرب کو ہلا کر رکھ دیا اور اس کے جھٹکے اسلامی دنیا میں بھی محسوس کیے گئے۔ تقریباً ہر اسلامی ملک دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شریک ہو گیا۔ انہوں نے امریکہ اور امریکی عوام سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ بہت سے مسلمان ممالک حیران ہیں کہ امریکہ کے ساتھ یکجہتی کے اظہار اور اسامہ بن لادن اور اُن کے ساتھیوں کی مذمت کرنے کے باوجود انہیں شک کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نسلی امتیاز کی بنا پر مسلمانوں کو شک وشبہ کا نشانہ بنایا جا رہا

ہے۔مسلمانوں کوایک اُمہ کی حیثیت سے اسامہ اور القاعدہ کی کارروائیوں سے نقصان پہنچا ہے۔

یہ وقت ہے کہ مذہب کے نام پر جرائم کا ارتکاب کرنے والوں اور اُن لوگوں کے درمیان فرق محسوس کیا جائے، جو دوسرے مذاہب کے ساتھ امن اور سکون کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک المیہ ہوگا، اگر مسلمانوں کے خلاف شک وشبہ سے شدید ردّعمل کے نتیجے میں تہذیبوں کا تصادم شروع ہو جائے۔ اسامہ اور اُن کے ساتھیوں نے کمرشل طیاروں کو بموں کے طور پر استعمال کیا، جس سے شطرنج کی ایک نئی عالمی بساط وجود میں آئی ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کرنے والے تمام 19 ہائی جیکر عرب تھے۔عرب ملکوں سے ایسے لوگ سامنے آئے ہیں، جنہوں نے حملے میں حصہ لیا اور اس طرح اکیسویں صدی میں عرب ممالک جانچ پڑتال کا مرکز بن گئے ہیں۔کوئی اسے پسند کرے، یا نہ کرے، آنے والے برسوں میں مسلمانوں پر عمومی طور پر اور عرب ممالک پر خاص طور پر نگاہ رکھی جائے گی اور انہیں محدود رکھا جائے گا۔ جیسا کہ سرد جنگ کے دنوں میں کمیونسٹ ملکوں کے خلاف رویہ اختیار کیا گیا تھا۔اس طرح اسلامی دنیا میں جارحانہ ذہنیت کو فروغ مل رہا ہے اور بدقسمت دن کے ایک سال بعد ایک تبدیلی واضح طور پر نظر آ رہی ہے۔امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اسلامی دنیا امریکہ کے گرد جمع ہو گئی تھی۔اب اسلامی دنیا کے بہت سے ممالک دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں امریکہ کے نئے مقاصد کی وجہ سے اس سے دور ہو رہے ہیں۔ایک سال پہلے عراق میں صدر صدام حسین کی حکومت تنہا رہ گئی تھی۔اب حالت یہ ہے کہ اس سال کے آغاز میں لبنان میں منعقد ہونے والی سربراہی کانفرنس میں عراقی حکومت بھی شریک تھی۔سربراہی کانفرنس کے موقع پر معانقوں کی وجہ سے دوریاں ختم ہو گئیں۔

صدر بش نے بار بار کہا ہے کہ ان کا ہدف ہے کہ عراق میں حکومت کو تبدیل کر کے دنیا کو خطرے سے بچایا جائے۔اسلامی دنیا کے بیشتر ممالک ان کے مؤقف سے مطمئن نہیں۔ بہت سے لوگ عراق پر حملے کو اسلامی ممالک کے خلاف ایک وسیع حملے کی پیش آگہی سمجھ رہے ہیں، جن میں ممکنہ طور پر ایران، شام، یمن، صومالیہ، سوڈان، سعودی عرب، مصر اور پاکستان شامل ہیں۔

امریکہ میں بہت سے دانشور، عرب اور اسلامی ممالک کو ناکام ممالک سمجھ رہے ہیں، جہاں ایسے شر پسند لوگ پیدا ہوئے، جنہوں نے نیویارک اور واشنگٹن میں تین ہزار بے گناہ افراد کی ظالمانہ ہلاکت کا منصوبہ بنایا۔اگرچہ مسلمان دانشور بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملوں کی مذمت کرتے ہیں، مگر وہ سمجھتے ہیں کہ حل طلب سیاسی مسائل سے پیدا ہونے والے ماحول کی وجہ سے شر پسند وجود میں آتے ہیں۔فلک بوس عمارتوں کے ساتھ طیاروں کے ٹکرانے کے بعد امریکہ ایک مزید طاقت ور

ملک کے طور پر سامنے آیا ہے۔ صدر بش نے وسیع جوابی فوجی کارروائیوں کی قیادت کی ہے اور ملک کے اندر حفاظتی اقدامات کیے ہیں۔ ان اقدامات کی وجہ سے امریکی عوام مزید حملوں سے محفوظ ہو گئے۔ مسلمان ممالک کو علم ہے کہ جنونیوں کے کسی حملے سے وہ خود بھی زد میں آ جائیں گے، لیکن فوجی کارروائی مسئلے کے حل کا صرف ایک حصہ ہے۔ کچھ امریکی لیڈروں کو بھی اس بات کا احساس ہے۔ سابق صدر کارٹر کے نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر مسٹر برزنسکی نے کہا ہے "دہشت گردی کی ہر کارروائی کے پیچھے ایک خصوصی سیاسی عمل ہوتا ہے۔" تشویش اس بات پر ہے کہ چند افراد کی شرپسندی کی وجہ سے مسلمان ملکوں میں اچھے آدمیوں اور عورتوں کو بھی موردالزام ٹھہرائے جانے کا خطرہ ہے۔ عالمی برادری نے مجموعی طور پر ابھی دہشت گردی کی وضاحت نہیں کی۔ جب تک اس بات پر سمجھوتہ نہ ہو جائے کہ دہشت گردی کا کوئی مذہب اور تہذیب وتمدن نہیں ہوتا، ہم اس وقت تک خطرے میں گھرے رہیں گے۔ افغانستان پر بمباری اور مشرق وسطیٰ اور کشمیر میں مسلسل ظلم وتشدد کا عام لوگوں پر بہت اثر پڑ رہا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ عوام کب بلوائیوں کی صورت اختیار کر لیں۔ مسلمان ممالک میں مظاہرے ابھی تک محدود رہے ہیں۔ بیشتر مسلمانوں کو احساس ہے کہ امریکہ کو غلط طور پر ہدف بنایا گیا اور اسے اپنے دفاع اور اُن مجرموں کا پیچھا کرنے کا حق حاصل تھا، جنہوں نے بموں سے حملے کا منصوبہ بنایا اور دہشت گردوں کو تربیت اور انہیں پناہ دی۔ تشویش یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں وسیع کش مکش کی وجہ سے بلوائیوں کے غم وغصے کا مرکز غیر ملکی اہداف بھی بن سکتے ہیں۔ آیت اللہ خمینی کے دور میں ایران میں امریکی سفارت خانے پر حملہ اس کی مثال ہے، جب امریکیوں کو یرغمال بنالیا گیا تھا۔ اسی طرح جنرل ضیاء کے دور میں اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے میں آتش زنی ایک اور مثال ہے۔ مسلمان عوام کے غم وغصے سے جنونی لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور ان میں اتنی زیادہ برافروختگی پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ مغربی اہداف کو نشانہ بنا سکتے ہیں اور اس طرح تہذیبوں کے تصادم سے ساری دنیا آگ کی زد میں آ سکتی ہے۔

آج امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور ہے۔ اسے کسی کارروائی کا منصوبہ بنانے، یا اپنے دفاع اور اپنے عوام کی سلامتی کے لیے کسی دوسرے ملک کی حمایت کی ضرورت نہیں۔ باقی دنیا کو خاموش رہنا پڑے گا، چاہے وہ امریکی کارروائی سے اتفاق کرے، یا نہ کرے۔ لیکن امریکہ ایک جمہوریت ہے، جو اتفاقِ رائے کی سیاست پر یقین رکھتی ہے۔ امریکی موقف کی راست بازی اسے یک طرفہ کارروائی کی طرف لے جا رہی ہے۔ اجتماعی سلامتی کا تصور اس وقت دنیا کے لیے ایک سہارا تھا، جب کمیونزم ایک بہت بڑا خطرہ نظر آیا کرتا تھا۔ یہی تصور اب بھی جاری رہنا چاہیے کیونکہ ایسا دکھائی

دیتا ہے کہ کمیونزم کے خطرے کی جگہ اسلامی ممالک کے خطرے نے لے لی ہے۔ آنکھ جھپکنے میں ایک دور سے دوسرے دور تک کے سفر اور ٹریڈ ٹاورز سے بلند ہوتے ہوئے شعلوں کی وجہ سے وقت آ گیا ہے کہ حالات پر غور کیا جائے۔ سلامتی کے ایک مشترکہ تصور اور دہشت گردی کی تشریح کے بغیر دنیا حقیقتاً اپنے آپ کو اسلام اور مغرب کے درمیان ایک مقدس جنگ میں گھرا ہوا دیکھ سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے، جس کی کوئی خواہش نہیں رکھتا، سوائے انتہا پسندوں کے!!!

آئینی بُحران کا خاتمہ

پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر نے آئینی اور سول حکمرانی کی بحالی کے لیے وعدے کے مطابق گزشتہ سال اکتوبر میں انتخابات منعقد کرائے، جو متنازعہ تھے۔ جنرل صاحب، جو 11 ستمبر 2001ء کے دہشت گرد حملوں کے بعد مغرب کے اہم اتحادی بنے ہوئے ہیں، نے اعلان کیا ہے کہ انتخابات اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ خلوصِ نیت سے اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کا یہ دعویٰ حقیقت سے بعید تھا۔ انتخابات میں بُری طرح دھاندلی کی گئی تھی۔ یورپی یونین نے کہا کہ انتخابات نقائص سے بھرے ہوئے تھے۔ امریکہ میں انسانی حقوق کی ایک کمیٹی نے کہا کہ انتخابات سیاسی پارٹیوں کے خلاف ترتیب دیئے گئے تھے۔ فوج کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو ایک ایسی سیاسی پارٹی تشکیل دینے کا کام سونپا گیا، جو پاکستان پیپلز پارٹی کا مقابلہ کر سکے، جس کی سربراہ میں ہوں۔ اس کنگز پارٹی میں بہت سے ایسے افراد بھی شامل تھے، جن پر ماضی میں قومی احتساب بیورو نے کرپشن کا الزام لگایا تھا۔ عوامی نمائندوں کی لاتعلقی کے نتیجے میں آئینی بحران پیدا ہوگیا ہے۔ نئی پارلیمنٹ میں ابھی تک کوئی اپوزیشن لیڈر موجود نہیں، جس کی دو وجوہ ہیں: اوّل، کیونکہ یہ عہدہ میرے ساتھیوں کو ملے گا۔ دوم، کوئی اعتدال پسند متبادل مغرب کو خوفزدہ نہیں کرسکتا۔ جنرل مشرف چاہتے ہیں کہ مغرب یہ یقین کرلے کہ پاکستان میں انتخاب فوجی آمریت اور مذہبی آمریت میں سے کرنا ہے۔ وہ پی پی پی پارلیمنٹرین گروپ سے مزید افراد کو توڑنے کی کوشش کررہے ہیں، تاکہ اپوزیشن لیڈر کا عہدہ مذہبی پارٹیوں کو مل جائے۔ (مختلف وجوہ کی بنا پر وہ بھی ان سے نالاں ہیں۔) پاکستان میں ایٹمی اثاثوں کے کنٹرول کے لیے فوج اور مذہبی

پارٹیوں میں سے انتخاب میں مغرب فوج کا ساتھ دے گا، مگر یہ دلیل ایک فریب ہے۔ اصل میں پاکستان میں اس وقت انتخاب فوجی آمریت اور جمہوریت میں سے کرنا ہوگا۔ اس میں تبدیلی بھی آ سکتی ہے اگر پاکستان میں ادارے ملک میں جمہوری قوتوں کی توڑ پھوڑ روکنے میں ناکام ہو جائیں۔ دریں اثناء فوج کی سرپرستی میں حکمران پارٹی، جو کنگز پارٹی کے نام سے مشہور ہے، کو بھی مشکلات درپیش ہیں۔ اس کے ارکان ناراض ہیں۔ وہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت سے انکار کر دیتے ہیں، جو اکثر کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ صورت حال اتنی مایوس کن ہے کہ ایک حالیہ اجلاس میں پولیس سے کہا گیا تھا کہ وہ پارلیمانی ارکان کو گھروں سے نکال کر پارلیمنٹ میں لائے۔ پارلیمنٹ اس لیے منتخب کی جاتی ہے کہ وہ قانون سازی کرے، لیکن جنرل صاحب چاہتے ہیں کہ پارلیمنٹ کسی حیل وحجت کے بغیر ایک نیا قانون قبول کر لے، جو اُن کے وردی والے ریٹائرڈ ساتھیوں نے تیار کیا تھا۔ پارلیمنٹ کو اصرار ہے کہ وہ پوری طرح غور کرے گی۔ چنانچہ احتجاج اور بائیکاٹ ہو رہے ہیں۔ اپوزیشن کے ایک رُکن کو ایک خط کے انکشاف پر گرفتار کر لیا گیا، جس میں مسلح افواج کی خفگی ظاہر کی گئی تھی۔ اسے اظہار کی آزادی کا حق استعمال کرنے پر اور ایک منتخب نمائندے کی حیثیت سے پارلیمنٹ کو قومی اہمیت کے معاملات سے آگاہ کرنے کے باوجود غداری کا مقدمہ قائم کرنے کی دھمکی دی جا رہی ہے۔ اسلام آباد یہ تسلیم کرتا ہے کہ پاک فوج کے کچھ افراد ہمسایہ ملک افغانستان میں طالبان کی طرف سے لڑتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ انہیں ''غنڈہ عناصر'' کہا جا رہا ہے۔ اکتوبر میں ایک امریکی اہلکار نے دعویٰ کیا تھا کہ فوج میں بعض لوگ جنرل مشرف کے احکام پر عمل درآمد نہیں کر رہے۔ فوج کے ترجمان نے اس کی سختی سے تردید کی اور دعویٰ کیا کہ جنرل مشرف کو مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ تاہم ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو سیاسی محاذ پر اور نہ ہی فوج کے ضمن میں صورت حال اچھی ہے۔ یہ بات تکلیف دہ ہے کہ ایک اہم خطے کا ایک اہم ملک، جسے دنیا کے خطرناک ترین ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے، اندرونی طور پر خود عدم استحکام کا شکار ہے۔ عوام کی ایک مقبول لیڈر ہونے کی وجہ سے میں حکومت کا ہدف بنی ہوئی ہوں۔

شیکسپیئر کے ڈرامہ ہیملٹ میں بھوت کی طرح میں بھی، اگرچہ ملک سے باہر ہوں، سیاسی کہانی کا کردار بنی ہوئی ہوں۔ مجھے پاکستان کے عوام سے محبت ہے اور میں اُن کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں واپس آ کر جدید دور میں داخل ہونے میں اُن کی مدد کروں۔ جتنی عظیم یہ محبت ہے اسی قدر زیادہ تلملاہٹ اور خدشہ ہے، جو اُن

لوگوں میں پیدا ہوتا ہے، جو بڑھتی ہوئی غربت، پسماندگی اور مذہبی پارٹیوں کے فروغ کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ایک قانون کے تحت حکومت نے میرے لیے پاکستان کی وزیراعظم کا انتخاب لڑنے کی پابندی لگا رکھی ہے۔ ایک اور قانون کے تحت مجھے پارلیمنٹ کے انتخاب میں حصہ لینے کی بھی اجازت نہیں۔ میں اپنے گھر، یا اپنے ملک میں بحفاظت نہیں آسکتی۔ میں نے کئی سال سے اپنے شوہر کو نہیں دیکھا۔ 1996ء میں جب جمہوریت کو قتل کیا گیا تھا تو انہیں اسی وقت گرفتار کر لیا گیا تھا۔ انہیں جب بھی رہا کیا جاتا ہے تو کسی دوسرے الزام میں پھر گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ انہیں 20 بار رہا کیا گیا اور 21 بار پھر سے گرفتار کیا گیا ہے۔

سمندر پار کانفرنسوں میں شرکت کرنے اور یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے سے مجھے جو شہرت ملی ہے، حکومت اس سے خوش نہیں اور وہ جلاوطنی میں بھی میری نقل و حرکت پر پابندی لگوانے کی کوشش کر رہی ہے۔ حکومت نے سوئس حکام کے پاس یہ غلط دعویٰ کیا ہے کہ میں نے اپنے شوہر کو فائدہ پہنچانے کے لیے ایک کنٹریکٹ کے سلسلے میں ہیرا پھیری کی تھی، میں نے ایسی کوئی ہدایت نہیں کی۔ اگر چہ میری حکومت کا تختہ اُلٹے سات سال گزر چکے ہیں مگر کسی عدالت نے مجھے اس ضمن میں سزاوار قرار نہیں دیا۔ سات سال بعد ایک سوئس تحقیقاتی مجسٹریٹ کو معلوم ہوا کہ مبیّنہ اکاؤنٹ میرا نہیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ میری اس اکاؤنٹ تک ''رسائی'' تھی۔ میں نے جنیوا حکام کے فیصلے کی تردید کی۔ مجھے خوشی ہے کہ 4 نومبر 2003ء کو انہوں نے تحقیقاتی مجسٹریٹ کے فیصلے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ پاکستان میں 1996ء میں جمہوریت کو پٹڑی سے اُتارنے کے بعد سے جنوبی ایشیا میں بہت سے ڈرامائی واقعات رونما ہوئے ہیں۔ میری سربراہی میں پی پی پی کی حکومت موجود نہ ہونے کی وجہ سے بھارت اور پاکستان تین بار ممکنہ ایٹمی جنگ کے دہانے تک پہنچ چکے ہیں۔ مقبوضہ جموں و کشمیر میں ظلم و تشدد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ ظلم و تشدد خود بھارت کے اندر تک بھی پہنچ گیا ہے اور اس کی پارلیمنٹ پر حملہ کیا گیا۔ میرے جانے کے بعد طالبان نے القاعدہ کو دعوت دی اور اسے اجازت دی کہ نوجوان مسلمانوں کو بھرتی کرے اور دہشت گردی کے لیے انہیں تربیت دے۔ میری حکومت کے خاتمے کے دو سال بعد القاعدہ نے افغانستان میں بیٹھ کر مغرب کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ جڑواں ٹاورز پر حملے سے تین ہزار بے گناہ افراد ہلاک ہو گئے۔ جوابی اقدام کے طور پر شروع کی گئی جنگ کے نتیجے میں مزید بے گناہ لوگ مارے گئے۔ ایک عورت اور ایک ماں ہونے کی حیثیت سے میں اسے اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ سرحدوں کو پُر امن بنایا جائے۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ پاکستان کی بیٹیاں اور بیٹے کسی تصادم میں مارے جائیں۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان تین

جنگوں کو دیکھ کر مجھے علم ہے کہ جنگ کتنی دہشت ناک ہوتی ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان تمام جنگیں اس وقت ہوئیں، جب ملک کی سیاسی تقدیر فوج کے ہاتھوں میں تھی۔

حال ہی میں پانچ بچوں کے ایک باپ نے اس وجہ سے خودکشی کر لی کہ وہ اپنے بچوں کو روٹی مہیا نہ کر سکتا تھا۔ اس کی موت سے معاشی حالات کی وجہ سے کی جانے والی خودکشیوں کی تعداد میں ایک اور کا اضافہ ہوا ہے، جو اس وقت پاکستان میں کی جا رہی ہیں۔ میرے بھی بچے ہیں، میرا دل اس وقت ٹوٹ گیا، جب میں نے پڑھا کہ سندھ کے ایک گاؤں میں ایک بارہ سالہ لڑکی سکول کے بنچ سے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ جب اسے ہوش میں لایا گیا تو اُس نے اپنی ٹیچر کو بتایا کہ وہ اور اُس کے گھر والے گزشتہ دو دنوں سے بھوکے ہیں۔ اُس کا والد بیمار ہے اور اُس کے بھائی کو کوئی ملازمت نہیں مل رہی۔ سٹیٹ بنک آف پاکستان نے اس سال رپورٹ میں کہا ہے کہ پاکستان میں غربت میں 30 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان میں تین میں سے ایک شخص انتہائی مفلسی کے حالات میں زندگی گزار رہا ہے۔ افسوس، ایک ایسا ملک، جسے بھوک اور غربت کے خاتمے، اپنے سکولوں کی حالت بہتر بنانے اور اپنے نوجوانوں کو اکیسویں صدی کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنا چاہیے، اقتدار کی کش مکش میں ملک کی مقبول قیادت کے خلاف اپنی توانائیاں ضائع کر رہا ہے۔ اس کا حل ایک ایسے سیاسی نظام میں ہے، جس میں پارلیمنٹ اپنی مرضی کے مطابق کام کر سکے اور قوانین سازی میں اسے آزادی حاصل ہو۔ اس کا حل ایک ایسے پارلیمانی سمجھوتے میں ہے، جس کے تحت پارٹیاں پاکستان میں مکمل جمہوریت لانے کی پابندی کریں۔ اگلے انتخابات ہیومن رائٹس کمیشن کی سرپرستی میں ہوں اور تمام پارٹیوں اور لیڈروں کو انتخابات لڑنے کی آزادی ہو۔ پاکستان کی ایک بیٹی کی حیثیت سے مجھے جمہوریت، معیشت اور سماجی حالات میں عدم توازن دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ دنیا میں ناکام ریاستوں کی تعداد کو مدّنظر رکھتے ہوئے ان تمام لوگوں کو اس پر توجہ دینی چاہیے، جو جنوبی ایشیا کو مستحکم دیکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

دُرست کیا ہے؟

آمریّت معاشرے میں مایوسی کو پروان چڑھاتی ہے اور ایک قنوطی منظرنامے اور عوام میں افسردگی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ افسردگی کے نیچے مایوسی، پست ہمتی اور ایک شکست خوردہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ شکست خوردہ ذہنیت پاکستان اور متعدد ایسے ملکوں میں بڑھتی جارہی ہے، جن کی تاریخ پاکستان جیسی ہے۔ تضادات کی ایک تاریخ، جہاں نوآبادیاتی نظام سے آزادی حاصل کرنے کے فوری بعد ملکی استبدادیت آ گئی تھی۔

گزشتہ صدی میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف تحریک کی سربراہی دلیر اور بااُصول لیڈروں نے کی تھی۔ انہوں نے ایک لچک دار معاشرے کو فروغ دیا، جس سے عوام میں زیادہ بلندیوں اور عظیم قربانیوں کا جذبہ پیدا ہوا۔ آمریّت میں ذاتی مفاد، ایک پلاٹ، پرمٹ، یا عہدے کی طرف رجحان ہوتا ہے۔ اس سے کرپشن کا کلچر پروان چڑھتا ہے، جس سے فرد کی فضیلت اور معاشرے کی روح کو گھن لگ جاتا ہے۔ ذاتی مفاد کے پیچھے بھاگنے کا نتیجہ زندگی کی مخصوص خوبیوں کے فقدان کی صورت میں نکلتا ہے، جہاں لوگوں کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس سیاسی پارٹیاں اپنے لوگوں سے کہتی ہیں کہ ذاتی مفاد چھوڑ کر دوسروں کی مدد کرو۔ یہ ایک بڑے مقصد کے لیے ذاتی مفاد تیاگ دینے کا عمل ہوتا ہے، جس سے کسی قوم کی روح میں زندگی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس عمل میں کوئی فرد اپنا عزیز ترین اثاثہ بھی تیاگ دیتا ہے، مثلاً زندگی، آزادی، جوانی، خاندان، صحت اور ذرائع آمدن، تاکہ اپنی ذات کے بجائے کسی زیادہ بڑے مقصد کے لیے کام کیا جائے۔ خوشحال معاشرے قانون کی عظمت کے بل بوتے پر تعمیر کیے

جاتے ہیں۔ جج کسی فرد کو تحفظ دینے کے لیے حکومتی زیادتیوں کی پروانہیں کرتے۔ کسی مسلّمہ زیادتی کو خاطر میں نہ لانے کا عمل انصاف کا عمل ہوتا ہے، جو قانون کی حکمرانی کی عظمت کو بڑھاتا ہے۔ قدیم دور کی اسلامی تہذیب کا دارومدار عدل اور انصاف پر ہوتا تھا۔

اکیسویں صدی میں خطرہ یہ ہے کہ لیڈر شپ عوام کے اعتماد کو فریب دیتی ہے اور اس کی دلیرانہ ماضی کی بدنامی کا باعث بنتی ہے۔ قانون کی حکمرانی کی خاطر لڑنے کی وراثت اور معاشرے کی آزادی طاقت کے استعمال کے سامنے پسپا ہو رہی ہے۔ چند ایک لوگ اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے طاقت استعمال کرتے ہیں اور انہیں اس کی پروانہیں ہوتی کہ ان کی کمیونٹی اسے درست سمجھتی ہے، یا غلط۔ تاریخ ایسے لوگوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے، یہی وہ مقام ہے، جہاں کچھ مسلمان معاشرے کی عظمت اور شان کا دور دیکھنے کے بعد اپنے راستے سے بھٹکنا شروع ہو گئے تھے۔ کچھ مسلمان مکاتب یہ تعلیم دینے لگے کہ اگر کوئی مقصد درست (حلال) ہے، تو اس کے لیے کوئی غلط (حرام) عمل کا ارتکاب بھی جائز ہے۔

عظمت کا انحصار انصاف پسندی پر ہوتا ہے۔ کسی انصاف پسند لیڈر شپ، کسی انصاف پسند معاشرے کی بات کریں تو تاریخ کے ایوانوں میں ایک انصاف پسند جنگ کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس کی گونج اس لیے سنائی دیتی ہے کہ ہر عظیم معاشرے اور لیڈر شپ کا منبع انصاف، غلط پر درست کی فتح، کمزور کا طاقت ور کو چیلنج کرنا ہوتا ہے۔ تہذیبیں منہدم ہو گئیں اور معاشرے منہدم ہو رہے ہیں، کیونکہ درست اور غلط، حق اور طاقت کے درمیان امتیاز ختم ہوتا جا رہا ہے۔

ایک اخلاقی اقدار کا نظام اس بات پر زور دیتا ہے کہ طاقت کے مقابلے میں حق زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جہاں کمزور اور افلاس زدہ لوگوں کو بھی اُمرا اور مراعات یافتہ لوگوں کے برابر سمجھا جائے۔ ایک اخلاقی بنیاد انفرادی خوشحالی کا سبب بنتی ہے، چاہے معاشرتی پس منظر کچھ بھی ہو۔ درست کردار کے معاشروں کی تعمیر کے لیے نوآبادیاتی نظام کے خلاف تحریکوں کے دوران میں بہت سے لوگوں نے بہت سی قربانیاں دیں، جس کے نتیجے میں بیسویں صدی میں متعدد ملکوں کو آزادی ملی۔ آج ان آزاد ملکوں میں یمن سے مالا کا تک کچھ ملکوں کو انتشار کا خطرہ درپیش ہے۔ اس خطرے کی وجہ استبدادی اور یک شخصی نظام حکومت ہے۔

آمر حکمران ظلم و تشدد، ناانصافی، کرپشن کا استعمال کرتے ہیں، یا اپنی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے دہشت پیدا کرتے ہیں۔ وہ انفرادی طور ان لوگوں کو کرپٹ کر دیتے ہیں، جو حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ کسی معاشرے کا وہ تانا بانا، جس پر کسی قوم کی عظمت کا

انحصار ہوتا ہے، ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب نے لفظ ''انصاف'' پر زور دیا ہے۔ اللہ ہمیشہ انصاف کرتا ہے۔ اللہ نے اپنے تصور کے مطابق انسان کی تخلیق کی۔ جب انسان درست عمل نہیں کرتا تو انسانیت اپنا مقدس جذبہ کھودیتی ہے۔ جذبے کے بغیر زندگی میں تنزل شروع ہوجاتا ہے اور موت پر اختتام ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اسلام آباد ایک مثال ہے۔ یہاں انتخابات میں دھاندلی کی گئی، پارلیمنٹ کا مذاق اُڑایا گیا، پارلیمنٹ کے ارکان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اپنے آپ کو بیچ دیں۔ پاکستان بار کونسل کی طرف سے عدلیہ کی مذمت کی گئی۔ ہماری نسل کے بچے پاکستان اور دوسری ہر جگہ پر مصیبتیں اُٹھا رہے ہیں۔

مشرق وسطیٰ بھی ایک ایسی ہی مثال ہے۔ یہاں اسرائیلی اور فلسطینی دونوں ایک دوسرے کے بچوں کی پروا کرنا چھوڑ گئے ہیں۔ اہداف صرف فوجی ہی نہیں، اہداف عام شہری ہیں، جنہیں آسانی سے ہلاک کیا جاسکتا ہے۔ نفرت سے نفرت ہی پیدا ہوتی ہے اور نفرت کی آگ میں قومی سوچ ناممکن ہوجاتی ہے۔ اگر ایسا ماحول برقرار رہا تو کوئی بھی فلسطینی ردِّعمل میں کسی اسرائیلی وزیراعظم کو ہلاک کرسکتا ہے اور پھر اسرائیلی بھی اس کا ردِّعمل ظاہر کریں گے اور پھر تشدد کا یہ شیطانی چکر چلتا رہے گا۔ ہر عمل مساوی اور مخالف ہوتا ہے، مثلاً تشدد کا اور امن کا، درست کا اور غلط کا، لیکن یہ سبق بھلایا جاچکا ہے۔ اب اعتقاد اس بات پر ہے کہ طاقت سے دشمن کو کچلا جاسکتا ہے اور یکطرفہ فتح حاصل ہوسکتی ہے۔ دنیا جو کبھی کسی ہلاکت کو ایک شیطانی عمل کہہ کر مذمت کرتی تھی، اب خاموش ہے۔ انسانی زندگی کی تقدیس ختم ہوگئی ہے بدلتی ہوئی اقدار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقیات کی خوبیاں مٹ رہی ہیں۔ کیا یہ تبدیلی براعظمی ہے؟ ماضی کی غالب اقدار یورپی ملکوں نے پھیلائی تھیں، جہاں شہری حقوق اور رواداری عظمت کا نشان تھے۔ آج یہ امریکہ ہے، جس نے غیر اعلانیہ طور پر دنیا کو اپنی سلطنت بنالیا ہے۔ اس سلطنت نے ایک ایسے ماضی سے جنم لیا ہے، جہاں انصاف کا بھدا اور فوری مقولہ تھا: ''مردہ، یا زندہ۔''

یہ یورپی مزاج کے بالکل برعکس ہے، جہاں ہر فرد حتیٰ کہ ایک قابلِ نفرت قاتل کو بھی حقوق حاصل تھے اور وہ غیر جانبدارانہ عدالتی کارروائی کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ ماضی میں کوئی شخص جرم ثابت ہونے سے پہلے بے گناہ سمجھا جاتا تھا اور اقوام متحدہ کا ہیومن رائٹس کنونشن بھی ابھی تک یہی کہتا ہے۔ لیکن اقوام متحدہ اب وہ نہیں ہے، جو پہلے کبھی تھی۔ اب پہلے ہی کسی شخص کو مجرم تصور کرلیا جاتا ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ طاقت ور کو نمائندہ اداروں کی بات، یا عوام کی مرضی پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان کا آمر ملک کے صدر اور آرمی چیف کے عہدے پر برقرار رہ سکتا ہے،

چاہے پارلیمنٹ جو بھی چاہے سوچے، اور پاکستان کے پارلیمنٹ کے ارکان بھی وفاداریاں تبدیل کر سکتے ہیں، چاہے اُن کا انتخاب کرنے والے، یا پارٹیاں، جو بھی چاہے سوچیں۔

یہ سوال پوچھا جانا چاہیے: ''کیا اقدار کا یہ نظام ایسے معاشرے پیدا کر سکتا ہے جو بچوں کو تحفظ دے اور پروان چڑھائے، اپنے نوجوانوں کا سر فخر سے بلند کرے اور قوم کو اس کی عظمت دے؟'' جواب کا انحصار اس اہم فرق پر ہے، جو کبھی اس وقت پیدا کیا گیا تھا جب مذہب، معاشرے اور عظیم لیڈروں نے درست اور غلط کے درمیان فرق محسوس کرنا سکھایا تھا۔

''ایک بے مثال مُحبِّ وطن کی یاد میں''

پاکستان کے پہلے جمہوری طور پر منتخب ہونے والے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پچاس سال کی عمر میں ایک فوجی آمر نے معزول کر دیا۔ آئین معطل کر دیا گیا اور نوجوانوں پر لاٹھیاں برسائی گئیں۔ بعض کو پھانسی دی گئی اور بہت سوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ پاکستان کے آئین کے بانی وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد 1967ء میں رکھی۔ ایک بلا کی حمایت رکھنے والے اور مقبول لیڈر کی حیثیت سے انہوں نے عوام کو اُمید اور باعزت مقام دیا۔ انہوں نے 1971ء میں ایک ملٹری ڈکٹیٹر جنرل یحیٰی خان کی پالیسیوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والی ذلّت سے ملک کو بچایا۔ قائد عوام کے نام سے پہچانے جانے والے شخص ذوالفقار علی بھٹو کو ایک عوامی لیڈر کی حیثیت حاصل تھی۔ اُن کے تصورات، نظریات اور شخصیت نے دنیا بھر کے سیاسی اور سفارتی حلقوں میں بے شمار لوگوں کو متاثر کیا۔ بھٹو کی پیپلز پارٹی نے اُس وقت کے مغربی پاکستان میں بے مثال فتح حاصل کرنے کے بعد اُن کی مقبولیت اور اُن کے پروگرام نے میدانِ سیاست کے بڑے بڑے بتوں کو اکھاڑ پھینکا۔ پیپلز پارٹی کے سبز رنگ کے جھنڈے اور اس کے ولولہ انگیز پیغام ''روٹی، کپڑا اور مکان'' نے عوام کے دل جیت لیے مگر اُس نے اقتدار کے ''دلالوں'' اور اُونچے طبقے کے لوگوں کو دہلا دیا۔ اُن کی قومیائے جانے کی پالیسیوں نے 22 بڑے سرمایہ دار خاندانوں کی اجارہ داری کو ختم کر دیا، جنہوں نے زمین اور وسائل کا ناجائز استعمال کیا تھا۔ اُن پالیسیوں سے نہ صرف پاکستان کا اقتصادی ڈھانچہ تعمیر و ترقی کی جانب بڑھنے لگا بلکہ درمیانے طبقے کے لوگوں کے لیے بھی آگے بڑھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔

جدید پاکستان کی بنیاد بھٹو نے رکھی۔ انہوں نے سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے خاتمے کے لیے زرعی زمین کی حد 150 ایکڑ تک محدود کر دی۔ انہوں نے آئین میں حبسِ بے جا سے متعلق آرٹیکل متعارف کروایا۔ انہوں نے خواتین کی ترقی، جاب گارنٹی اور مزدوروں کے لیے فلاحی مراعات کا آغاز کیا۔ عالمی پاسپورٹ کا اجراء انہی کے وقت میں شروع ہوا۔ وہ ایک پین اسلامک قوت کے لیڈر تھے، جنہوں نے دنیا کے مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بھی بانی تھے، جو اسلامی دنیا میں پہلی کوشش تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو دسمبر 1971ء سے جولائی 1977ء تک اقتدار میں رہے۔ انہوں نے جنرل مانک شاہ کے پاکستان کو مزید ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے عزم کو پورا نہ ہونے دیا، وہ کشمیری مجاہدین کے زبردست حامی تھے اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف لڑنے والے تھے، جنہوں نے "Myth of Independence" نامی کتاب لکھی۔ ان کے دوسرے کارناموں میں "The Great Tragedy" ہے۔ جس کا آغاز انہوں نے اپنی بیٹی کے نام ایک خط سے کیا۔ اُن کی تیسری کتاب "My Dearest Daughter" ہے، جو جیل میں لکھی گئی۔ اُن کی دوسری تحریریں عدالتی دستاویز اور دنیا کے معروف رسالوں میں موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے بے مثال انداز بیان اور ذہانت کی قوت سے سننے والوں کے دل موہ لیے۔ اقوام متحدہ میں اُن کی تقاریر سننے والوں پر سحر طاری کر دیتی تھیں۔ بھٹو کو کئی بار جیل میں قید کیا گیا۔ انہیں کوٹ لکھپت جیل، میانوالی جیل، سکھر جیل، راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل اور کراچی جیل میں رکھا گیا۔ انہیں راولپنڈی جیل میں شہید کیا۔ اُن کی موت پر عالمی لیڈروں اور سربراہوں نے بھٹو خاندان سے افسوس کیا۔ اُن میں سے کئی نے اپنے نمائندے جنرل ضیاء الحق کے پاس بھیجے کہ وہ اس شخص کی جان بخشی کر دیں، جس نے مسلم اُمہ کو متحد کیا اور جو مسلم دنیا اور ترقی پذیر قوموں کا فخر تھا۔

جنرل ضیاء الحق نے پاکستان پیپلز پارٹی کو بھٹو کے فارمولے کے بغیر اپنے ساتھ مل کر کام کرنے کی دعوت دی لیکن پی پی پی نے انکار کر دیا، پھر جنوبی ایشیا نے ایک نہایت جابرانہ دور حکومت دیکھا۔ ''بھٹو زندہ باد'' کے نعرے لگانے والے جوانوں کو فوجی عدالت سے کوڑے مارے گئے اور سزائیں دی گئیں۔ ضیاء کی سیاسی جماعت کی حیثیت سے کام کرنے والی ''آئی ایس آئی'' نے انہیں اذیتیں دیں۔ اُن میں سے کئی کو سمری ملٹری کورٹ کی جانب سے پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا' اس کا ایک ثبوت شہید ناصر بلوچ کا کیس ہے، جس کے بارے میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ اسے ملٹری کورٹ کی جانب سے سزا کے اعلان سے پہلے ہی جنرل ضیاء الحق کی جانب سے موت کا

حکم دے دیا گیا تھا۔عظیم قائدعوام کی حراست اور پھانسی کے خلاف احتجاج کے طور پر کئی نوجوانوں نے معروف کاروباری مراکز کے سامنے خود کو جلا ڈالا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ جنوبی ایشیا نے ایسا ذہین اور شعلہ بیان لیڈر نہ اُن سے پہلے دیکھا نہ اُن کے بعد دیکھے گا۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو 4 اپریل 1979ء کو پھانسی دے دی گئی۔ جنرل ضیاء الحق نے سپریم کورٹ کی جانب سے اُن کی سزائے موت کو منسوخ کرنے کے متفقہ فیصلے کو مسترد کر دیا۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو نے آخری لمحے تک اپنی زندگی کی بھیک مانگنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔شہادت کے بعد بھی ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے سیاسی اُفق پر چھائے رہے۔نوجوانوں نے جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ یہ صورتِ حال شہید بھٹو کی بیٹی بے نظیر کے الیکشن لڑنے تک ایسی رہی۔ بھٹو کے دونوں فرزند قتل کر دیئے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو جوناگڑھ کے وزیراعظم شاہنواز بھٹو کے بیٹے تھے، جنہوں نے بمبئی کو سندھ سے الگ کرایا، جو پاکستان بننے کی راہ ہموار کرنے میں معاون ثابت ہوا۔ اُن کی والدہ لیڈی خورشید بھٹو تھیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے کیلیفورنیا یونیورسٹی برکلے اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے گریجوایشن کیا۔ انہوں نے لنکز اِن لندن سے بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی اور کچھ عرصہ قانون کی تعلیم دیتے رہے۔ وہ اپنے وقت میں اقوام متحدہ میں سب سے کم عمر نمائندہ، سب سے کم عمر کابینہ کے وزیر اور سب سے کم عمر سربراہ مملکت تھے۔انہیں دنیا کی نامور شخصیات اور سیاست دانوں نے سراہا، جن میں فلاسفر بریٹنڈ رسل، صدر بش، ڈاکٹر ہنری کسنجر اور نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر فرانس کے صدر کسکارڈ، سعودی عرب کے شاہ فیصل اور دیگر کئی افراد شامل ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے وقت کا بہترین خوش لباس شخص مانا جاتا تھا۔نوجوان اُن کے نہایت گرویدہ تھے۔اُن کی جدوجہد کا آغاز کالجوں اور یونیورسٹی کے ہالوں سے ہوا اور جب انہیں شہید کیا گیا تو تمام دنیا نے اُس کا سوگ منایا۔حتیٰ کہ کھاریاں میں فوجیوں کی بڑی تعداد نے تین وقت کا کھانا نہیں کھایا حالانکہ اس فوجی چھاؤنی سے جنرل ضیاء الحق کا بھی تعلق تھا۔ 4 اپریل کو ذوالفقار علی بھٹو کا نام ساری دنیا میں گونجتا ہے۔ اُن کا یوم شہادت پاکستان، مشرق وسطیٰ، یورپ اور امریکہ میں منایا جاتا ہے۔ اُن کے حامی آج بھی یہی کہتے ہیں ''زندہ ہے بھٹو زندہ ہے'' اور حقیقت بھی یہی ہے۔

علم، ٹیکنالوجی اور روشن خیالی ہماری ساکھ بدل سکتی ہے!

جنرل مشرف کا ایک بیان گزشتہ دنوں خاصے بحث مباحثے کا باعث بنا، جس میں انہوں نے کھلے لفظوں میں اس بات کا اظہار کیا کہ پاکستان خطرات سے دوچار ہے۔ اُن کے اس فقرے پر لے دے بھی ہوئی کہ لوگ کہتے ہیں کہ عراق کے بعد پاکستان کی باری بھی آ سکتی ہے۔ میری کوشش ہے کہ ہماری باری نہ آئے۔ گویا کہ وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ عراق کے بعد پاکستان کی باری آ سکتی ہے۔ یہ ہر آمر کی طرح اس ذہنیت کا عکاس ہے، جو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ ملک کے لیے ناگزیر ہے اور خود بھی اس زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہی درد کی دوا ہے۔ یہ ایک ایسا ذہنی عارضہ ہے، جس میں مبتلا ہونے والوں نے بالآخر ملک کو بھی نقصان پہنچایا اور خود بھی تاریخ کے صفحات پر عبرت کے نشان چھوڑ گئے۔ قطع نظر اس نفسیاتی کیفیت کے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ کیا پاکستان سچ مچ خطرات میں گھرا ہوا ہے اور ان خطرات کی اصل نوعیت کیا ہے اور ان سے نکلنے کا راستہ کیا ہے۔

آج میں اپنے ملک کے دانشوروں، ادیبوں، مفکروں، غریب مزدوروں، کسانوں، صنعت کاروں، سرمایہ کاروں، نوجوانوں، طالب علموں اور ملک کے محبِّ وطن جمہوریت پسند اور ترقی پسند لوگوں سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان خطرات سے دوچار ہے۔ یہ خطرات کہیں باہر سے ہم پر نہیں ٹھونسے گئے بلکہ ہمارے اندر سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم دوسروں کو

اپنی کوتاہیوں پر موردالزام ٹھہرا کر مطمئن ہونا چاہتے ہیں تو دوسری بات ہے وگرنہ ہمیں خرابی اپنے اندر سے تلاش کرنی چاہیے۔ سب خرابیوں کی جڑ تو سامنے کی بات ہے، ہمارے ہاں عوام کو ملک کے فیصلوں میں شریک ہونے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ جمہوریت ذرا سر اُٹھانے لگتی ہے کہ اُسے کچل دیا جاتا ہے، عوام کی آواز دبادی جاتی ہے۔ جب کبھی لولی لنگڑی جمہوریت آتی بھی ہے تو اسٹیبلشمنٹ کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ عوام کے نمائندوں کو آزادانہ عوام کی خدمت کا موقع نہ دیا جائے۔ فوجی حکمرانوں کی کوشش رہی ہے کہ جمہوری ادارے، عدلیہ اور سول سوسائٹی نہ بننے پائیں، اس نے نہ صرف دنیا میں ہمارے امیج کو خراب کیا ہے بلکہ ہمارے جسد سیاست کو اُدھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ ہمارا پورا سماجی نظام تلپٹ ہوکر رہ گیا ہے، ہماری خارجہ پالیسی ہے نہ دفاعی حکمت عملی، ہم نہ تعلیم میں کچھ پا رہے ہیں نہ صنعتی بنیادوں کو بہتر کر رہے ہیں۔ عوام کا معیار زندگی بلند ہو رہا ہے، نہ ملک کو استحکام مل رہا ہے۔ ہمیں پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ہمارے ان امراض کا علاج ہمارے ہاتھ میں ہے، کسی دوسرے کو آ کر ہمارے لیے یہ کام نہیں کرنے۔ یہ استحکام کبھی بھی کوئی فرد، یا چند افراد نہیں لا سکتے۔ یہ استحکام اداروں اور جمہوری عمل سے آتا ہے کیونکہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔

ہمارے مسائل اور بڑھ رہے ہیں، جب مسائل کے اس سمندر میں ہم ایک جزیرے کی طرح خود کو تنہا کر لیتے ہیں۔ پچھلے 25 برسوں میں ہماری غلط پالیسیوں نے ہمیں پہلے خطے میں تنہا کیا، پھر اسلامی ملکوں میں تنہا کیا، اس کے بعد تیسری دنیا اور پسماندہ ممالک میں ہماری کوئی ساکھ نہیں رہی ہے۔ ہماری غلط پالیسیوں کے نتیجے میں اپنے سے بعد میں آزاد ہونے والے ملکوں حتیٰ کہ بنگلہ دیش سے بھی پیچھے چلے گئے ہیں۔ گلوبلائزیشن اچھی ہو یا بری، اب ایک حقیقت ہے۔ ہم اب اس سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ یہ درست ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کو اس کے بارے میں کچھ تحفظات ہیں مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گلوبلائزیشن کے اس عمل کو نہیں روکا جا سکتا ہے، نہ اس سے باہر رہا جا سکتا ہے۔ عالمگیریّت کا یہ سفر اتنی تیزی سے جاری ہے کہ جس نے اس کا ساتھ نہ دیا اور ذرا بھی رُکنے کی کوشش کی تو وقت کی رو اسے کچل کر رکھ دے گی۔ جو قومیں اس سے باہر رہنے کی کوشش کریں گی، بہت نقصان میں رہیں گی۔ اس لیے دنیا کی تمام سوچنے سمجھنے والی قوموں نے اس عمل میں شریک ہونے کے لیے اپنی حکمتِ عملی وضع کر لی ہے۔

چین ہی کی مثال لیجیے۔ چین جو سال ہا سال تک دنیا سے قدرے کٹ کر اپنے اندر تبدیلیاں لانے میں منہمک تھا، اب اس عالمگیریّت کا حصہ بن کر دنیا کو حیرت زدہ کر رہا ہے۔ ہمارے پڑوسی

ملک ہندوستان اور بنگلہ دیش بھی اس کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہمیں بھی اپنے ملک کی بقا اور اپنے عوام کی بہتری کے لیے خود کو اس عمل میں شریک کرنا پڑے گا۔ ہم دنیا سے کٹ کر نہیں رہ سکتے، صرف سیاسی طور پر ہی نہیں، اقتصادی اور علمی طور پر بھی ہمیں نئے علوم اور ٹیکنالوجی کو گلے سے لگانا ہوگا اور خود کو عالمی برادری کا باوقار حصہ بنانا ہوگا۔

پاکستان کے پاس کیا نہیں ہے، بے پناہ وسائل کی دولت ہے، محنتی، جفاکش اور ذہین لوگ ہیں۔ اگر ہم ان پر انحصار کریں تو ملک میں انقلاب لا سکتے ہیں۔ ہماری اصل طاقت ہمارے یہ لوگ ہیں۔ صرف سیاسی معنوں میں ہی نہیں، اقتصادی اور علمی انقلاب کے لیے بھی، اب دنیا کا مقابلہ علم اور ٹیکنالوجی ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی حکومت اپنے لوگوں کی صلاحیتوں اور اپنے ملک کے وسائل کو استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو وہ ملک کا مقدر بدل سکتی ہے۔ ایسا صرف وہی حکومت کر سکتی ہے، جس کو اپنے لوگوں پر اعتماد ہو اور لوگوں کو اس پر اعتماد ہو اور علامہ اقبال کی فکر اور قائداعظم کے اُصولوں پر چلتے ہوئے حکومت اور عوام کے فیصلے عوام کے ذریعے، عوام کے لیے پارلیمان اور عدلیہ کی بالادستی میں ہوں۔

یہ وقت ہے کہ ہم اپنے اردگرد کے حقائق کا صحیح صحیح اندازہ کریں، اس وقت وسط ایشیا سے لے کر مشرق وسطیٰ اور جنوب ایشیا تک ایک دنیا ہماری پیش رفت کی منتظر ہے۔ یہ سب ہماری مارکیٹ بھی ہے، جس میں سخت مقابلہ ہے اور ہمارے لیے ایک مضبوط بنیاد بھی، ہمیں طویل اور مختصر مدت دونوں کی منصوبہ بندی کرنا ہے۔ اصل چیز علم اور ٹیکنالوجی ہے۔ پھر ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہے کہ ہم اس طرح سرمایہ کاری کریں کہ اس کا فائدہ ملک کے اقتصادی استحکام ہی کی صورت میں ظاہر ہو بلکہ اس کے ساتھ خوشحالی کے یہ ثمرات عام آدمی تک بھی پہنچیں۔ ہمارے ہاں بیروزگاری کا عفریت منہ کھولے کھڑا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے غریب لوگوں میں اضافہ ہو رہا ہے، لوگوں کو برسر روزگار کرنا ہماری منصوبہ بندی کا حصہ ہونا چاہیے۔ اصل میں اقتصادی منصوبہ بندی صرف جمع تفریق کا نام نہیں، بہی کھاتے درست رکھنے کا نام نہیں بلکہ اس بات کا اندازہ لگانے کا نام ہے کہ آنے والے دنوں میں ہمارے اردگرد کی دنیا کدھر جا رہی ہے اور ساتھ ہی اس بات کا شعور رکھنے کا بھی نام ہے کہ اس کے نتیجے میں عام آدمی کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ علم اور ٹیکنالوجی کے شعبوں کا تعین انہی حوالوں سے کیا جانا چاہیے۔ ہم خود کو دنیا سے کاٹ کر نہیں جی سکتے اور جب ہم خود کو اس عمل کا حصہ بنا لیتے ہیں تو دنیا نہ صرف ہمیں قبول کر لیتی ہے بلکہ ہمارے خلاف منفی سوچ بھی ترک کر دیتی ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم اگر دو باتوں کا خیال رکھیں تو ہمارے مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے:

1- ایک یہ کہ عوام کو اپنے فیصلے خود کرنے دیں، ان پر جبر کا نظام نافذ نہ کریں، ان پر اعتبار کریں۔ اس صورت حال میں عوام کی بہتری کی طرف قدم بڑھایا جا سکے گا اور

2- دوسرا یہ کہ ہم دنیا سے کٹ کر اپنے جذباتی خول میں قید ہونے کے بجائے یہ جان لیں کہ گلوبلائزیشن، اچھی یا بری، اب ایک حقیقت ہے۔

ان دو باتوں سے ہماری ترجیحات بھی واضح ہوتی جائیں گی، عوام کا شعور بھی جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی کا عکاس ہوگا اور ملک کی سمت بھی صحیح ہوگی۔

اب اس میں تفصیلات ہیں کہ

- یہ سب کام کیسے کر سکتے ہیں۔
- تعلیم کیسے سستی ہو سکتی ہے۔
- صنعت و تجارت میں ہم کیسے آگے بڑھ سکتے ہیں۔
- مقابلے کی اس دوڑ میں ہم اپنی مصنوعات میں کیسے اضافہ کر سکتے ہیں۔
- کس طرح عوام کو روزگار پر لگا سکتے ہیں۔
- علم و ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے کیا راستہ اختیار کر سکتے ہیں اور ان میں سے بھی کون سے شعبے اہم ہیں۔

صرف یہی نہیں پھر ہماری خارجہ پالیسی کا رُخ بھی حقیقت پسندانہ ہو جائے گا اور دنیا بھی ہمیں شک کی نگاہوں سے دیکھنا چھوڑ دے گی۔ ہماری سلامتی، ہماری خوشحالی اور ہمارے استحکام کا راستہ یہی ہے۔ ہمیں اسے اختیار کرنا ہے ورنہ محض آمرانہ ذہنیت سے اس سمت ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا جا سکتا۔

قائدِ عوام......شیر کی زندگی

قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو شہید 5 جنوری 1928ء کو پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ عطیۂ خداوندی تھے، اس شکستہ دل قوم کے لئے جو دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ قدرت نے انہیں اس قوم کو از سرِ نو مجتمع کرنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ بہت سے لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ پاکستان دسمبر 1971ء میں سازشوں اور خطروں کے چنگل سے بچ کر سلامت نکل سکتا تھا۔ جرنیلوں نے 90 ہزار فوجیوں کو ڈھاکا کی ریس گراؤنڈ میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ بھارتی جرنیل مانک شاہ نے اس پر قوم سے نئے سال کی خوشی میں ایک اور تحفہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

پاکستان ایک بہادر اور جرأت مند قائد کی وجہ سے مزید کسی المیے سے بچ گیا۔ وہ ایک ایسے قائد تھے جو قائدِ عوام تھے، جن کے پاس غربت کے شکنجے توڑ کر عوام کو آزاد کرانے کا وژن تھا اور جو قوم کی ایک ایسے نئے عشرے میں رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے جو طاقت وقوت، شان و شوکت اور کامرانیوں سے عبارت ہو۔

وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو افراد کی کامیابی اور ترقی کو قسمت، یا مقدر کا کھیل سمجھتے ہوں۔ قائدِ عوام اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ہر شخص اپنا مستقبل خود بناتا ہے اور اپنی تقدیر خود لکھتا ہے۔ انہوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ خود کیا، اپنے لیے ایک منزل کا تعین کیا۔ اُن کے ذہن میں اپنی قوم اور اپنی دھرتی کی خدمت کی ایک واضح تصویر تھی۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اُن کا ایمان تھا کہ کسی شخص کو ناانصافی اور ظلم کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالنا چاہئیں۔ اپنے ان معتقدات اور نظریات کے لیے انہوں نے اپنی جان قربان کر دی۔ وہ قائدِ عوام تھے، جو عوام کے لیے جئے اور مرے۔

نوجوانوں کے لیے قائد کی زندگی یہ سبق دیتی ہے کہ اپنے لیے منزل کا تعین کرو اور قسمت کو کوسنا چھوڑ دو۔ کامیابی اُن کے قدم چومتی ہے، جو چند اُصولوں پر چلتے ہوئے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم ایسے زمانے میں جی رہے ہیں، جب موقع پرستی اور مصلحت کوشی نے پختگی کردار کی جگہ لے لی ہے۔ اس عہد میں جب حکمران قانون شکنی کر رہے ہوں اُن کی یاد اور شدت سے آتی ہے، کیونکہ وہ قانون کی حکمرانی پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کو ایک متفقہ جمہوری اور اسلامی آئین دیا، جس میں صوبائی خودمختاری اور انسانی حقوق کی ضمانت دی گئی تھی۔ یہ پہلا آئین تھا جو پاکستانی عوام کے انسانی حقوق کو تسلیم کرتا تھا۔ اس وقت عالمی سطح پر انسانی حقوق بڑی اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔ اُن کے بغیر انسانیت کا وقار داؤ پر لگ جاتا ہے اور معاشرے کی روح تباہ ہو جاتی ہے۔

سیاست اُن کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی۔ نوجوانی ہی سے سیاست اُن کا ارمان تھا۔ ایک متجسس طالب علم کے طور پر وہ قائداعظم کے مطالبہ پاکستان کے پُرجوش حامی تھے۔ قائد عوام خود کو ''اسلام کا سپاہی'' سمجھتے تھے۔ اُن معنوں میں نہیں، جن معنوں میں مذہبی جنونی سمجھتے ہیں اور جو اسلام کو دہشت گردی اور آمریت کے جواز کے آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ خود کو اُن معنوں میں ''اسلام کا سپاہی'' سمجھتے تھے کہ مسلم اُمہ کو آزادی اور قانون کی حکمرانی کے ساتھ ایک متحد مسلم برداری بنایا جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ اسلام کا اتحاد مسلم اُمہ کے ایسے اتحاد سے پیدا ہو سکتا ہے جو مشترکہ منڈی اور مشترکہ دفاع کے اُصولوں پر تعمیر کیا جائے۔ اس لحاظ سے وہ اس تصور کے بانی تھے، جس نے آج یورپی یونین، خلیجی ممالک کے تعاون کی کونسل اور جنوب ایشیا کے ممالک کی علاقائی ایسوسی ایشن کی شکل اختیار کی ہے۔

اُن کے دوست پیلو مودی کا کہنا ہے ''زلفی جناح کے دوقومی نظریے کے جنون کی حد تک حامی تھے اور جناح جو کچھ کہتے، یا کرتے تھے، اُن کے لیے وہی سچ تھا۔ اُن کا اپنے قائد سے مسلسل رابطہ تھا۔ 1945ء میں قائداعظم کے نام ایک خط میں انہوں نے لکھا ''چونکہ میں ابھی سکول میں پڑھتا ہوں اس لیے پاک سرزمین کے قیام میں کوئی مدد نہیں کر سکتا، مگر وہ وقت آئے گا جب میں پاکستان کے لیے اپنی جان تک قربان کر دوں گا۔'' یہ گویا ایک ایسے شخص کی سچی پیش گوئی ثابت ہوئی جس نے وطن عزیز کی آزادی کے استحکام کے لیے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا۔ بھٹو اپنے لیے پاکستان کی سیاست اور عالمی منظر پر ایک اہم کردار دیکھتے تھے۔ وہ مظلوموں کے قائد تھے، اُن

مظلوم عوام کے جو ظالمانہ نظاموں کی چکی میں پس رہے تھے، مظلوم قوموں کے لیے جو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی جدوجہد کر رہی تھیں۔ وہ مسلم اُمہ اور تیسری دنیا کے قائد تھے۔ 1948ء ہی میں قائدعوام نے کہا تھا: ''ہم نے تہذیب انسانی کو آگے بڑھنے کا جذبہ دیا ہے اور اس کا بدلہ ہمیں یوں دیا گیا کہ ہمیں غیر ملکی طاقتوں کے ہاتھ کا کھلونا بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے عوام کا مستقبل اور اُن کی آزادی کی حفاظت کی ذمہ داری ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے۔'' وہ ہمیشہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ہمارا مستقبل ہمارے ہاتھ میں ہے اور آدمی کو اقدار کی حفاظت کے لیے ڈٹ جانا چاہیے۔ اس سے مجھے خیال آتا ہے کہ وہ اس تہذیب سے کتنا مختلف تھے، جو اُن کی شہادت کے بعد آج ہمارے سامنے ہے، جس کے زیر اثر لوگ خود کو وزارتوں کے لیے بیچ دیتے ہیں اور بڑے بڑے اچھے لوگ بھی اس حرص کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جب وہ کیلی فورنیا میں پوسٹ گریجوایٹ کے طالب علم تھے تو انہوں نے اسلام کے قیمتی ورثے کے بارے میں کس خوبصورتی سے اظہار خیال کیا تھا۔ لاس اینجلس کی یونیورسٹی آف کیلی فورنیا میں اپریل کے مہینے میں اپنی شہادت سے کوئی 30 سال پہلے یکم اپریل 1948ء کو تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ''اسلام کے دور عروج میں عیسائیوں کے ساتھ مشفقانہ سلوک کیا جاتا تھا، وہ اپنے طریقوں سے عبادت کرنے میں آزاد تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے بار بار کہا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی جان و مال اور قانون سب خدا کی پناہ میں ہیں''۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا ''اگر کوئی شخص اُن کے حقوق کو سلب کرتا ہے تو میں خود اُس کے خلاف لڑوں گا اور خدا کے سامنے اُس کے خلاف استغاثہ پیش کروں گا''۔ ذوالفقار علی بھٹو کہا کرتے تھے: ''جرأت ہمارے خون میں شامل ہے، ہم ایک قیمتی اثاثے کی پیداوار ہیں۔ ہم اسلامی اتحاد کے خواب کو تعبیر دینے میں ضرور کامیاب ہوں گے کیونکہ یہ قسمت کا فیصلہ ہے، سیاسی حقیقت ہے اور آنے والی نسلیں اس کے انتظار میں ہیں''۔

انہوں نے اسلام کے اس قلعے کی تعمیر کے خواب کی بنیادیں 1974ء میں اسلامی سربراہی کانفرنس کی شکل میں رکھ دی تھیں۔ اس کے بعد ایک خونیں باب ہے جو قائد اور اُن کے ساتھیوں کے خون سے رنگین ہے۔ انہیں اُن کے اپنے جرنیل نے پھانسی دے دی، جس نے کبھی یہ کہا تھا کہ ''پاک فوج کو جتنی اہمیت وزیراعظم بھٹو سے ملی، اس کی 1971ء سے پہلے پاکستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی''۔ قائدعوام کی زندگی کی نصف صدی قومی، علاقائی اور عالمی مقاصد کے حصول کے لیے گزری۔ پاکستان نے اُن کے دور حکومت میں افریقہ میں نسلی امتیاز اور اقلیتی حکومت کے

خلاف افریقی اقوام کی کھلی اور مخفی ہر طرح کی حمایت کی۔

وہ تیسری دنیا کے ہیرو تھے، جنھوں نے بڑی جرأت سے نسل پرستی، نوآبادیت اور سامراجیت کے خلاف آواز اُٹھائی۔ وہ کشمیری اور فلسطینی عوام کی سب سے توانا آواز تھے۔ پاکستان کے لیے بھٹو عظیم تبدیلیوں کے نقیب تھے۔ انہوں نے ملک میں جوہری ادویات اور جوہری پاور پلانٹ کا آغاز کیا۔ انہوں نے وہ بلیو پرنٹ تیار کیا، جس نے پاکستانی سائنس دانوں کو یورنیم کی افزودگی اور ایٹمی ہتھیار بنانے کے قابل بنایا۔ جب بھارت نے 1974ء میں ایٹمی دھماکہ کیا تھا۔ تو انہوں نے ایٹم بم بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ پاکستان میں یورنیم کی افزودگی کے پروگرام کو چھپانے کے لیے قائدعوام نے فرانس کے ساتھ نیوکلیئرری پروسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ کیا۔ ری پروسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ منسوخ کرنے کے لیے اُن کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا، مگر اصل پروگرام کی کسی کو بھنک بھی نہ پڑسکی اور یہ پروگرام کامیابی سے چلتا رہا۔

قائدعوام 1978ء میں ایٹمی دھماکہ کرنا چاہتے تھے، اُن کی اقتدار سے علیٰحدگی نے اُسے موخر کردیا۔ تاہم اگر وہ زندہ رہتے تو چار سال کے عرصے میں پاکستان اس بے مثال کامیابی کو حاصل کرلیتا۔ اُن کے ترقی پسندانہ سماجی و معاشی اور جمہوری خیالات کی وجہ سے انہیں عوام کی ایسی حمایت اور طاقت حاصل تھی، جس کے بل بوتے پر انہوں نے روٹی، کپڑا اور مکان جیسے فلاحی نظریئے کی بنیاد پر مملکت کو مستحکم کیا۔ وہ سیاست کو پوش علاقوں کے ڈرائنگ روموں سے نکال کر حقیقی پاکستان تک لے گئے۔ اُن کی بنائی ہوئی پیپلز پارٹی اسٹیبلشمنٹ کے لیے ایک مضبوط چیلنج بن گئی۔ اگرچہ وہ نوے ہزار فوجی قیدیوں کو عزت وآبرو سے وطن واپس لائے اور جرنیلوں کو جنگی جرائم کے ٹربیونلوں سے ملنے والی موت کی سزا سے چھٹکارا دلایا، مگر اسٹیبلشمنٹ نے انہیں اور اُن کی پارٹی کو کبھی معاف نہیں کیا۔ اُن کی بنائی ہوئی جماعت آج بھی اسٹیبلشمنٹ کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لیے اسٹیبلشمنٹ نے کئی کنگز پارٹیاں بنائیں۔ وہ سب کی سب عوام کے دل اور ذہن جیتنے میں ناکام رہیں۔ اُن میں کوئی بھی جماعت پاکستان کو جدید خطوط پر اُستوار کرنے، یا غربت کا خاتمہ کرنے کے مقاصد نہیں رکھتی تھی۔ اُن میں سے ہر ایک اسٹیبلشمنٹ کی بنائی ہوئی تھی، جس کا مقصد ایسی دیوالیہ سوچ پر مبنی پالیسیوں کو جاری رکھنا تھا، جو عوام دشمن استحصالی ایجنڈے کا حصہ تھیں۔ قائدعوام اُصولی طور پر غریبوں، مجبوروں اور مظلوموں کے دوست تھے۔ وہ اپنے نظریات میں بے باک تھے اور خدا کے سوا کسی بھی طاقت کے سامنے جھکنے سے انکاری تھے۔

بھٹو کی سب سے لازوال خدمت یہ ہے کہ انہوں نے عوام میں جمہوریت کا شعور پیدا کیا، انہیں اس بات کا احساس دلایا کہ وہ سیاسی طاقت کا حقیقی سرچشمہ ہیں۔ انہوں نے کسانوں، محنت کشوں، طالب علموں، عورتوں اور دوسرے عام لوگوں کو روشنی دی۔ انہیں اُن کی اہمیت کا احساس دلایا، اپنے حق رائے دہی کا شعور بخشا۔ انہیں بتایا کہ عام آدمی کی زندگیاں بدلنے اور بہتر بنانے کا یہی اصل راستہ اور ذریعہ ہے۔ وہ جمہوریت اور جمہوری اقتدار کے دل دادہ تھے اور بالآخر زندگی کے ان عظیم مقاصد کی خاطر انہوں نے اپنی جان دے دی۔

پاکستان کے حوالے سے وہ سمجھتے تھے کہ فوجی حکومت اُن اُصولوں کی نفی ہے، جن کی خاطر پاکستان بنایا گیا۔ یہ ملک ووٹ اور جمہوری عمل کے ذریعے وجود میں آیا تھا۔ بھٹو سمجھتے تھے کہ فوج سیاست سے باہر رہ کر ہی اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کی حفاظت کرسکتی ہے۔ انہوں نے صاف صاف کہا ''پاکستان کی مسلح افواج اپنی اصل ذمہ داری سے ایک لمحہ بھی غفلت برتنے کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ جو سپاہی اپنے بیرکیں چھوڑ کر حکومت کے ایوانوں کا رُخ کرتے ہیں، وہ بالآخر جنگ ہار کر جنگی قیدی بن جاتے ہیں، جس طرح کہ 1971ء میں ہوا''۔

بھٹو شہید نے ایوب، یحیٰی اور ضیاء جیسے فوجی صدور کے خلاف جدوجہد کی۔ اُن میں ہر کوئی اب منوں مٹی تلے تاریخ کے کسی فٹ نوٹ کے طور پر دفن ہے کیونکہ آمریت صرف ولن پیدا کرتی ہے۔ بھٹو آج بھی تاریخ کے صفحات میں ایک ہیرو کے طور پر زندہ ہے۔ ایک ناقابل تسخیر پاکستان کی تعمیر میں قائدِ عوام کی خدمات دیکھنا ہوں تو کامرہ ایرونائیکل کمپلیکس، ٹیکسلا ہیوی مکینیکل کمپلیکس، کراچی شپ یارڈ کی ماڈرن انجینئرنگ ورکس کا قیام، پاکستان اسٹیل ملز، پورٹ قاسم اور پاکستان آٹوموبائل کارپوریشن اُن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ 1972ء میں شملہ معاہدے پر مذاکرات کرکے انہوں نے بھارت اور پاکستان کے درمیان امن کے طویل ترین دور کا آغاز کیا۔ اُن کی سماجی اصلاحات پاکستان میں ایک فلاحی معاشرے کی بنیاد بنیں۔ اُن کی عدم وابستگی کی خارجہ پالیسی نے قوموں کی برادری میں پاکستان کو ایک باوقار مقام دلایا۔ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی ہوئی قوم کو انہوں نے ہمالیہ کی بلندی تک پہنچا دیا۔ بھٹو کی ولولہ انگیز قیادت نے پاکستانیوں کو اُمید، قوت اور توانائی کی دولت سے مالا مال کردیا۔ ملک کو امن وخوشحالی کی تلاش کے لیے ایک مطمع نظر اور ایک سمت میسر آئی۔ اقتصادی شرح نمو میں اضافہ ہوا اور تارکین وطن کی بدولت، جو اَب عالمی شہری تھے، پاکستان کی طرف دولت کا بہاؤ بڑھ گیا۔ مسلم ممالک نے تقریباً پانچ سو ملین ڈالر سالانہ کی امداد دی تاکہ پاکستان عالمی اقتصادی اداروں سے آزاد ہوسکے۔ لوگوں کو نوکریاں ملیں،

مواقع ملے۔ ملک میں خواتین کوآزادی ملی اور وہ ملک کی تاریخ میں پہلی بار پولیس فورس، فارن اور سول سروس، ماتحت عدلیہ میں جانے لگیں۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے اُس وقت کے صدر جان ایف کینیڈی نے اُن کے ساتھ روز گارڈن میں ٹہلتے ہوئے کہا،''بھٹو اگر آپ امریکی ہوتے تو میری کابینہ میں ہوتے''۔ قائدعوام نے ساڑھے پانچ سال حکومت کی، اُن کی پاکستان سے محبت اور وابستگی پاکستان کے ہر پہاڑ، ہر صحرا، ہر دوسرے حصے سے ظاہر ہے۔ انہوں نے شمال میں شاہراہ قراقرم تعمیر کی تو بحیرہ عرب پر پورٹ قاسم بنوائی۔

انسان یہ سوچ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اُن جیسے وژن اور کردار رکھنے والے شخص کی قیادت میں پاکستان نے ترقی کی نئی منزلیں طے کر لی تھیں۔ انہوں نے آزادی، امن اور ترقی کے اپنے پیغام کے ذریعے عام لوگوں کی روح تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ موت کی وہ کال کوٹھری، جس میں اُن کے قاتلوں نے انہیں قید کیا، فوجی حکمرانوں کے خلاف اُن کے عزم اور ارادے کو شکست نہ دے سکی اور وہ عوام کے قائد کے طور پر ڈٹے رہے۔ انہوں نے کہا میری قوم مجھے ایک شاعر اور انقلابی کے طور پر یاد رکھے گی، میں پیدائشی طور پر ایسا ہی ہوں۔ اُن کے آخری الفاظ تھے''خدا میری مدد کرے، میں بے گناہ ہوں۔'' پیپلز پارٹی کے حامیوں کو کوڑے اور پھانسی کی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا، وہ فوجی اور سول آمروں کی آنکھوں میں اس لیے کھٹکتے تھے کہ وہ بھٹوازم کے حامی تھے۔ بھٹوازم ہر شخص کے لیے الگ مفہوم رکھتا تھا، چند موقع پرست چوغہ بدل کر خود کو بے نقاب کر چکے ہیں، مگر یہ تعداد میں بہت کم ہیں۔ بھٹو کو اس سے بڑا اخراج تحسین اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی ایک بڑی تعداد ہر حال میں بھٹوازم کی حمایت میں چٹان کی طرح ڈٹی ہوئی ہے۔ قائدعوام کی طرح اُن کا بھی ایمان ہے کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سوسال کی زندگی سے بہتر ہے۔

منور سہروردی کو کس نے قتل کیا؟

مجھے یہ جان کر سخت دکھ ہوا کہ میرے بھائی اور میرے سکیورٹی انچارج منور سہروردی کو 17 جون 2004ء کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ منور سہروردی پیپلز پارٹی کے ساتھ اُس وقت سے ہیں، جب وہ طالب علم تھے اور انہوں نے 1977ء میں قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری پر احتجاج کیا تھا اور قید کر لیے گئے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی سندھ کے سیکرٹری اطلاعات کے عہدے تک پہنچے اور انہوں نے سنیٹر بننے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ پارٹی کے کارکن تھے اور کارکن ہی رہے۔ منور سہروردی کراچی، سندھ اور پاکستان کے بہترین سپوتوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے نہایت بے خوفی سے انصاف، آزادی اور پاکستانی عوام کے حقوق کے لیے جدوجہد کی۔ میں منور سہروردی پر بے انتہا اعتماد کرتی تھی۔ وہ اس وقت سے میرے باڈی گارڈ کی حیثیت سے میرے ساتھ رہے، جب ہم نے جنرل ضیاء کی فوجی ڈکٹیٹر شپ کے خاتمے کے لیے مہم چلائی۔ انہوں نے میری زندگی پر کسی بھی حملے کو روکنے کے لیے تربیت حاصل کی اور یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ وہ خود ایک اسی قسم کے حملے کا شکار ہو گئے۔

منور سہروردی کے کھو جانے کا غم مجھے اتنا ہی ہے جتنا مجھے اپنے سگے بھائیوں شاہ نواز اور مرتضیٰ بھٹو کے جُدا ہو جانے کا ہے۔ مجھے اس کی نوجوان بیوہ اور بچوں پر رحم آتا ہے۔ منور سہروردی ایک انتہائی شفیق باپ اور ایک محبت کرنے والے شوہر تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُن کا گھرانہ خوشیوں سے بھرپور تھا۔ منور سہروردی ایک انتہائی ذمہ دار بھائی بھی تھے۔ جنہوں نے اپنے بھائی، جو اسی قسم کے ایک حملے میں معذور ہو گئے تھے، کا بہت خیال رکھا۔ ایک ظالم قاتل کی گولی نے ایک بے قصور

خاندان کی خوشیاں چھین لی ہیں۔ یہ غم، اُس غم کا حصہ ہے، جو میں پاکستان میں جمہوری قوتوں کے لیے محسوس کرتی ہوں۔ ہم میں سے ہر ایک کو یہ معلوم ہے کہ قائد عوام نے ہمیں جو مشعل روشنی پھیلانے کے لیے دی تھی، اسے لے کر چلنے کے راستے میں موت کا سایہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ہم بھی وہی کر رہے ہیں، جو منور سہروردی نے کیا اور ہم یہ جانتے ہیں کہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

منور سہروردی پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک انتہائی تخلیقی اور ذہین کارکن تھے۔ انہیں کھوکر ہم ایک حقیقی ہیرو سے محروم ہو گئے ہیں۔ منور سہروردی جمہوریت کے لیے ایسے آئیڈیاز سامنے لاتے تھے، جو کوئی دوسرا نہیں لاسکتا تھا۔ حال ہی میں منور سہروردی نے لندن میں ہونے والے اجلاس میں مجھ سے ملاقات کی اور میرے لیے سپاری لے کر آیا تا کہ مجھے کراچی کی یاد دلا سکے۔ جاتے وقت اُس کے آخری الفاظ یہ تھے کہ میں کراچی کے ہوائی اڈے پر اُتروں اور انہوں نے میری واپسی کے سارے انتظامات کی ذمہ داری قبول کی تھی۔

منور سہروردی پُر امن اور آزادی پسند پاکستانی شہریوں کے دلوں میں زندہ رہے گا۔ وہ ایک حقیقی ہیرو ہے۔ منور سہروردی کو کیوں قتل کیا جاسکتا ہے؟ اس کی تین ممکنہ وجوہ ہوسکتی ہیں، جن کی تحقیقات ہونی چاہئیں اور اسی صورت میں سچ سامنے آسکتا ہے۔

پہلا شک یہ ہے کہ منور سہروردی کو ایم کیو ایم کے جنگ جو افراد نے مارا کیونکہ منور سہروردی کراچی میں امن کی علامت تھا اس سلسلے میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کراچی میں دہشت گردوں اور جرائم پیشہ افراد کو جیلوں سے رہا کیا گیا، تا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو سندھ میں حکومت بنانے سے روکا جا سکے۔ نتیجے کے طور پر 650 پولیس افسران، جنہوں نے کراچی میں امن قائم کرنے کی کوشش میں ہمارا ساتھ دیا تھا، کو نومبر 2002ء سے اب تک قتل کیا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ کراچی کا ایک اور ہونہار سپوت عبداللہ مراد کو ملیر میں شہید کر دیا گیا حالانکہ وہ پارلیمنٹ کے منتخب رُکن تھے لیکن اس کے باوجود اُن کے خاندان کو اجازت نہیں دی گئی کہ وہ ایم کیو ایم کے جنگ جوؤں کے خلاف اُن کے قتل کا مقدمہ دائر کرسکیں۔

دوسرا شک جنرل مشرف پر جاتا ہے کیونکہ جنرل مشرف نے ابھی حال ہی میں ٹیلی ویژن پر آکر کہا ہے کہ وہ مجھے کک ماریں گے۔ چونکہ میں پاکستان واپس آنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اسی ہفتے جنرل مشرف نے اراکین پارلیمنٹ سے ملاقات میں کہا کہ وہ مجھے کبھی دوبارہ حکومت میں آنے کی اجازت نہیں دیں گے کیونکہ وہ مجھے سکیورٹی رسک سمجھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اُن کا

مطلب یہ تھا کہ میں اُن کے لیے خطرہ ہوں۔ان باتوں کے مدِّ نظر جنرل مشرف سے تحقیقات کرنا ضروری ہیں کہ وہ مجھے کِک مارنے اور مجھے واپس اقتدار میں آنے سے روکنے کے لیے کیا اقدامات کرنا چاہتے تھے۔کیا منور سہروردی کا قتل انہی اقدامات میں ایک ہے۔کیا وہ پاکستان میں جمہوری قوتوں کو میری قیادت میں جمع ہونے اور مجھے حکومت میں آنے سے روکنے کے لیے اس قسم کے اقدامات کر رہے ہیں؟

حال ہی میں آصف علی زرداری کے باڈی گارڈ کو بھی فروری کے مہینے میں قتل کر دیا گیا اور یہ اُس وقت ہوا، جب میری واپسی کے پروگرام پر بات ہو رہی تھی۔

تیسرا شک اُن عناصر کی طرف جاتا ہے جو ایٹمی سائنس دان عبدالقدیر خان کے ساتھ بیرون ملک دورے پر گئے، کیونکہ منور سہروردی کے قتل سے وہ یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لیے انتہائی اقدامات کر سکتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ عبدالقدیر خان نے ایٹمی اثاثوں کا سودا تنہا کیا تھا۔میں یہ شک اس لیے ظاہر کر رہی ہوں کہ آصف علی زرداری کے باڈی گارڈ اور منور سہروردی، جو دو دہائیوں سے میرے باڈی گارڈ تھے، کا قتل یکے بعد دیگرے ہوا ہے اور یہ قتل امریکہ کے فوکس ٹیلی ویژن پر فروری کے مہینے میرے انٹرویو اور کینیڈا کے سی ڈی سی کے جون کے مہینے میں انٹرویو کے بعد ہوئے۔ان دونوں انٹرویوز میں، میں نے اس بات کو مسترد کر دیا تھا کہ عبدالقدیر خان نے تنہا ایٹمی اثاثے فروخت کیے تھے۔

کراچی اپنے بہترین سپوت سے محروم کر دیا گیا، منور سہروردی ہمیشہ کے لیے تاریخ کے اوراق میں قائدِاعظم اور قائدِعوام کے جاں نثار کی حیثیت سے جگمگاتے رہیں گے۔اُن کے قتل کی تحقیقات آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہونی چاہئیں۔اگر ایسا نہیں ہوا تو کراچی کا ہر بہادر سپوت قاتلوں کی گولیوں کا نشانہ بنتا رہے گا۔

ذوالفقار علی بھٹو......ایک مثالی لیڈر

پاکستان کے عوام 4 اپریل 2004ء ذوالفقار علی بھٹو شہید کی 25 ویں برسی کے موقع پر انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ 4 اپریل ایک ایسا دن ہے، جب پاکستان کے عوام ذوالفقار علی بھٹو کو یاد کرتے ہیں۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے صدر کا عہدہ اس وقت سنبھالا، جب پاکستان 1971ء کے سانحہ سے دوچار تھا۔ قوم اُس وقت منقسم اور مایوس تھی، جب ہمارے 90 ہزار فوجیوں نے دشمن کے سامنے ہتھیار پھینکے۔ یہ وہ وقت تھا، جب جنرل مانک شاہ اپنی قوم سے یہ وعدہ کررہے تھے کہ وہ آئندہ چند مہینوں میں انہیں ایک سرپرائز دیں گے۔ شکست خوردہ آوازیں یہ کہہ رہی تھیں کہ اب پاکستان کی بقا ناممکن دکھائی دے رہی ہے۔ قائداعظم نے شکست خوردہ قوم کو حوصلہ دیا اور عوام سے وعدہ کیا کہ وہ مایوس نہ ہوں۔ پاکستان کو دنیا میں باعزت مقام دلائیں گے۔ فوج کو طاقت ور اور نوجوانوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں گے۔ بالآخر بھٹو نے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرلی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے قائداعظم کے خواب کو پورا کرتے ہوئے پاکستان کو اسلامی، جمہوری اور وفاق پر مشتمل آئین دیا اور بلوچستان کو علیحدہ صوبہ قرار دیتے ہوئے وہاں ہائیکورٹ قائم کی اور مظفرآباد میں آزاد جموں کشمیر اسمبلی قائم کی۔

اسلامی دنیا میں 1973ء کا آئین واحد آئین تھا، جس میں جس بے جا کے ذریعے عوام کے بنیادی حقوق کا تحفظ کیا گیا۔ اب آئین جنرل پرویز مشرف کے ایل ایف او کے فریم ورک میں خطرات کی زد میں ہے۔ پارلیمنٹ موجود ہے لیکن اس کے اختیارات سلب کیے جاچکے ہیں۔ اس طرح لوگوں کے حقوق کا مذاق اُڑایا جارہا ہے۔ پارلیمنٹ سے باہر اختیارات کے ذریعے حکمرانوں

نے احتساب کے اسلامی اور جمہوری اُصولوں کو پامال کیا ہے اور اس طرح کرپشن، اقربا پروری اور قوم کی لوٹ کھسوٹ کا جواز بنایا ہے۔ جس کے نتیجے میں غربت اور بیروزگاری کا بھوت ہر لمحے عوام کی زندگیوں کو اجیرن بنا رہا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو واضح انداز میں فوجی حکمرانی کے خلاف تھے اور اُن کا اس بات پر مکمل یقین تھا کہ قوم کی بہتری کے مقاصد اُس وقت حاصل کیے جا سکتے ہیں، جب فوج سویلین قیادت میں اپنی آئینی ذمہ داریاں بخوبی سرانجام دے۔ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بانی تھے۔ جب بھارت نے اپنا پہلا ایٹمی دھماکہ کیا تو اُس وقت انہوں نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ ہم گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کا اُن کا خواب پورا ہوگیا تو انہیں ''عبرت کا نشان'' بنایا جاسکتا ہے لیکن انہوں نے قوم کے مفاد کی خاطر اپنا ارادہ ترک کرنے کے بجائے جان کی قربانی دینا قبول کرلی۔

ایٹمی ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ کے ذمہ داروں نے پاکستان کے ایٹمی اثاثہ جات کو خطرات میں ڈال دیا ہے، جس کے لیے بھٹو نے اپنی جان کی قربانی دی۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے اسلامی ورثے کی تھی، وہ اکثر کہتے تھے: ''جرأت ہمارے خون میں شامل ہے، ہم ایک قیمتی اثاثے کی پیداوار ہیں، ہم اسلامی اتحاد کے خواب کو تعبیر دینے میں ضرور کامیاب ہوں گے کیونکہ یہ قسمت کا فیصلہ ہے، سیاسی حقیقت ہے اور آنے والی نسلیں اس کے انتظار میں ہیں۔'' انہوں نے اسلام کے اس قلعہ کی تعمیر کے خواب کی بنیادیں 1974ء میں اسلامی کانفرنس کی صورت میں رکھ دی تھیں۔ اس طرح وہ علاقائی اتحاد کے داعی بھی تھے، جس کی وجہ سے آج یورپین یونین، خلیجی ممالک کا اتحاد اور سارک ممالک کا اتحاد معرض وجود میں آیا ہے۔ اُن کے دورِ حکومت میں پاکستان نے افریقہ میں نسلی امتیاز اور اقلیتی حکومت کے خلاف افریقی عوام کی کھلی اور مخفی ہر طرح کی حمایت کی۔ وہ تیسری دنیا کے ہیرو تھے، جنہوں نے جرأت اور بہادری کے ساتھ نسل پرستی، نوآبادیت اور سامراجیت کے خلاف آواز اُٹھائی۔ وہ کشمیری اور فلسطینی عوام کی سب سے مضبوط آواز تھے۔

بھٹو کو اُن کے اپنے جرنیل نے پھانسی دے دی، جس نے کبھی یہ کہا تھا کہ پاک فوج کو یقینی اہمیت وزیراعظم بھٹو سے ملی۔ اس کی 1971ء سے پہلے پاکستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے عوام میں جمہوریت کا شعور پیدا کیا۔ انہوں نے عوام کو بیدار کیا۔ انہیں اس بات کا شعور دیا کہ وہ سیاسی طاقت کا حقیقی سرچشمہ ہیں، انہیں حق رائے دہی کا شعور بخشا۔ انہیں اس بات سے آگاہ کیا کہ عام آدمی کی زندگیاں بدلنے اور بہتر بنانے کا یہی اصل راستہ ہیں۔ وہ جمہوریت اور جمہوری اقتدار کے دل دادہ تھے اور بالآخر زندگی کے اِن عظیم مقاصد کی خاطر انہوں

نے اپنی جان دے دی۔ پاکستان کے حوالے سے وہ سمجھتے تھے کہ فوجی حکومت اُن اُصولوں کی نفی ہے، جس کی خاطر پاکستان بنایا گیا۔ یہ ملک جمہوری عمل اور ووٹ کے ذریعے وجود میں آیا تھا۔ افواج کی سیاست کاری کی وجہ سے کلاشنکوف و ہیروئن کلچر، پیدا ہوا۔ لسانیت، فرقہ واریت اور شدت پسندی میں اضافہ ہوا اور عدلیہ، پولیس، اُمور خارجہ میں فوج کی حصہ داری بڑھی اور آزادی صحافت ختم ہوئی۔ اس طرح جمہوری منتخب حکومتوں کا زوال شروع ہوا اور ملک انٹیلی جنس کے ادارے کا پابند ہوگیا۔ انٹیلی جنس کا عمل دخل بڑھتا ہی چلا گیا اور پاکستان میں سیاسی پارٹیوں کو توڑنے اور دبانے کا عمل جاری رہا اور تمام پالیسیاں احتساب اور کسی بحث وتمحیص کے بغیر بنتی گئیں اور فوجی اداروں میں نوجوانوں کی برین واشنگ کے لیے سلیبس دوبارہ ایجاد کیے گئے۔ سلامتی کے اداروں کا نچلی سطح تک پھیلاؤ، جمہوریت کی موت، عدل کا زوال، بیروزگاری میں اضافہ، افغان پالیسی کی تبدیلی، کارگل کا حادثہ، انڈیا کے ساتھ تیسری جنگ کا امکان اور نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی برآمد پر منتج ہوا۔ یہ خوفناک واقعات کا سلسلہ کبھی وقوع پذیر نہ ہوتا اگر قائدعوام، جو قائداعظم کے صحیح وارث تھے، کی پالیسیوں کی پیروی کی جاتی اور افواج اپنی بیرکوں میں بدستور رہتیں۔ اگر قائدعوام اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ترقی اور فوجی حکومت ایک دوسرے کی ضد ہیں تو وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ مذہبی عناصر کا کردار سیاست میں نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ لوگ جو سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کا استعمال کرتے ہیں، وہ قوم کی ترقی اور خوشحالی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

متواتر آمروں کے اقتدار نے مذہبی پارٹیوں کو عروج بخشا جنہوں نے مسلمان ملکوں کے بارے میں منفی تشخص پیدا کیا۔ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کا لحاظ رکھتے ہوئے قائدعوام نے فوج اور عدلیہ کے اداروں میں ٹریننگ پروگراموں اور تعلیمی سلیبس سے مذہبی رہنماؤں کی تشریحات کو باہر رکھا۔ انہیں یقین تھا کہ ایک مکتب فکر کی تعلیمات پر زور دے کر دوسرے مسلک کو مشتعل کیا جاتا ہے اور اس طرح مسلمان مسلمان سے لڑنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ ایک خوفناک منظر نامہ تھا، جس پر انہوں نے محسوس کیا کہ اس سے گریز کیا جانا چاہیے۔ انہیں یقین تھا کہ ہر پاکستانی اپنے ملک، اپنے مذہب، اپنی جنسیت اور نسل کے باوجود اللہ، ریاست اور قانون کی نظر میں برابر ہے۔ مشرف کے دور میں سرحد اسمبلی نے مولانا مودودی کی متنازعہ مکتب فکر کی تعلیمات کو رائج کر دیا ہے۔ جب تک مذہبی، یا تعلیمی نظام کو مولانا مودودی کی فکر سے آزاد نہیں کیا جاتا، نئی نسل کے لیے نتائج بہت تکلیف دہ ہو سکتے ہیں۔ اُن کی تعلیمات، نظام تعلیم کے استحصال پر ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ اس کا مطلب نئی نسلوں کو ایک مخصوص نظریاتی پہلو تک محدود رکھنا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کا پیغام ہے

انصافیوں کے خاتمے اور استحصال سے نجات کا پیغام تھا۔اُن کا پختہ یقین تھا کہ عوام کی خدمت سے بڑھ کر اور کوئی کام نہیں ہوسکتا، جسے کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے شاندار اصلاحات کیں، حتیٰ کہ آزادانہ بین الاقوامی سفر کے حقوق، مفت تعلیم، مزدوروں کے حقوق اور زرعی اصلاحات متعارف کرائیں، جس کے ذریعے عوام کے لیے ترقی کے نئے باب رقم کیے۔ وہ غریبوں کے ہمدرد تھے۔ وہ عوام کو غربت اور بیروزگاری کے شکنجے سے نکالنے کی سوچ رکھتے تھے۔ وہ سیاست کو ڈرائنگ روموں سے نکال کر حقیقی پاکستان تک لے گئے۔ کامیابی کی راہ قائدعوام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حاصل ہوسکتی ہے۔ ایک شخص اپنی خودغرضی کی وجہ سے نہیں بلکہ نظریاتی وجہ سے اعلیٰ رتبہ حاصل کرتا ہے، جس کے لیے وہ اپنی زندگی وقف کردیتا ہے۔ نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی برآمد کی ذمہ داری لینے کے بجائے، جس کا مطلب جنرل مشرف کے اقتدار کا خاتمہ تھا، اس کی حکومت نے سائنس دانوں پر حکم عدولی کا الزام لگایا۔ یہ فرق ہے ایک عوامی لیڈر میں، جو ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اپنی قوم کے لیے زندہ رہتا اور مرتا ہے، اور ایک آمر میں جو قومی سلامتی اور یک جہتی کی قیمت پر اپنے اقتدار کو طول دینا پسند کرتا ہے۔ سائنس دانوں پر یہ الزام دھرتے ہوئے مشرف کی حکومت نے تمام دنیا میں افواج پاکستان اور سلامتی کے اداروں کو بدنام کیا۔ مشرف یہ کہنے کی کوشش کررہا ہے کہ فوج اتنی کمزور ہے اور فوج کے انٹیلی جنس ادارے اتنے ہی نااہل ہیں کہ محفوظ ترین راز بھی فوجی طیاروں میں باہر سمگل ہوجاتے ہیں، جن کا سائنس دانوں کو بھی علم نہیں ہوتا۔

1979ء میں قائدعوام کی شہادت کے نتیجے میں افواج پاکستان کی مداخلت اور اُن کا تسلط بڑھا۔ افواج کی سیاست کاری نے پاکستان کی شہرت کو داغ دار کیا اور پاکستان کی صنعتی اور اقتصادی ترقی کو زوال پذیر کیا۔ ہندوستان اور چین اپنی ترقی پذیر اقتصادیات کی بدولت خوشحال ہوتے جارہے ہیں مگر اسلام آباد قرضوں کی ری شیڈولنگ سے کام چلا رہا ہے اور بیروزگاری اور ذلت کے سمندر پر تیر رہا ہے۔

آج کل پاکستان متصادم جگہ پر کھڑا ہے۔ ایٹمی ایشو، طالبان، انڈیا، شدت پسندی، مذہبی جماعتیں، جمہوریت اور اقتصادیات کے بارے میں تمام پالیسیاں دگرگوں ہیں۔ شہید بھٹو کو یقین تھا کہ افواج کے سیاست سے باہر رہتے ہوئے ملکی اداروں کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے کہا ''وہ سپاہ جو بیرکوں سے نکل کر حکومتی محلات میں داخل ہوجاتی ہیں، وہ جنگوں میں شکست پذیر ہوتی ہیں اور جنگی قیدی بن جاتی ہیں، جیسا کہ 1971ء میں ہوا'' اُن کی شہادت کے بعد 25 سالوں میں قائدعوام کے الفاظ کانوں میں گونجتے ہیں۔ بطور تنبیہ ادا ہوئے اور ملک کے لئے رہنما ثابت

ہوئے، تاکہ اُس کی عزت، اُس کا افتخار اور اُس کی پوزیشن کو بچایا جاسکے اور اُن سنہری اُصولوں کی پاسداری ہوسکے، جن کی وجہ سے یہ وجود میں آیا۔ قائدعوام کی قبر سے آزادی اور ترقی کا لازوال پیغام درہ خنجراب کی وادیوں سے خیبر تک اور بحیرہ عرب کے ساحلوں سے کراچی تک لاکھوں دلوں میں گونجتا ہے۔ یہ اُن لوگوں کی جدوجہد میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، جو قید ہوئے، جلاوطن ہوئے اور اذیت کا شکار ہوئے۔ شہید دھنی بخش کی قربانی میں بھی اس کا علامتی اظہار ہوا، جس نے فوجی حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے خودسوزی کی۔ آنے والی نسلیں اُن سے سبق حاصل کریں اور حوصلہ، عزت اور اُمید کے ساتھ زندہ رہیں۔ 4 اپریل کو ہر وہ شہری جو قائداعظم کے پاکستان میں یقین رکھتا ہے، وہ قائدعوام اور اُن تمام معلوم، یا نامعلوم مرد وزن جنھوں نے اپنے خون، پسینہ اور آنسو دیئے، اُن کو خراجِ عقیدت پیش کیا جائے۔

کشت وخون کی گرم بازاری

پاکستان کی تاریخ میں 12 مئی 2007ء کو اس کے تاریک ترین دنوں میں سے ایک کے طور پر یادرکھا جائے گا۔ اس دہشت ناک دن، پُرامن احتجاج کرنے والے لوگ نقل وحرکت کا آئینی حق استعمال کرتے ہوئے ایئرپورٹ جارہے تھے کہ حکمران اتحاد میں شامل ایم کیوایم کے ارکان نے اُن پرگھات لگا کر حملہ کردیا۔

چیف جسٹس افتخار چوہدری کے استقبال کے لیے ریلی میں شریک ہونے والوں کے مطابق ایم کیوایم کے ارکان نے شاہراہ فیصل سے ملیر تک سڑک پر قبضہ کرلیا۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ پولیس اور رینجرز کے اہلکار مبینہ طور پر پاکستان پیپلز پارٹی اور عوامی نیشنل پارٹی کے حامیوں کو فائرنگ کرکے قتل وزخمی کرنے والوں کو تحفظ فراہم کررہے تھے۔ دونوں پارٹیوں کے حامیوں کو کراچی کی مین روڈ شاہراہ فیصل پر چار بسیں اور ٹرک کھڑے کرکے محاصرے میں لے لیا گیا اور وہ دہشت گرد جنہوں نے پلوں اور اس جیسے دیگر مقامات پر پوزیشنیں سنبھال رکھی تھیں، اُن پر فائرنگ شروع کردی۔

عدلیہ کو چاہیے کہ وہ ازخود نوٹس لیتے ہوئے انکوائری کرکے ان دہشت گرد عناصر اور ان کے ساتھ سازباز کرنے والے مشتبہ سرکاری ارکان کی نشاندہی کرے جنہوں نے یہ مجرمانہ کارروائی کی۔ عدالت اس الزام کی صداقت کو بھی پرکھے کہ دہشت گردوں کو یہ تحفظ وزیراعلیٰ سندھ کے ایک غیر منتخب مشیر کی ہدایات پر فراہم کیا جارہا تھا۔

کسی ریلی میں ابتری پھیلانے کا یہ پہلا واقعہ نہیں۔ اس سے قبل 2005ء میں جب سینئر

زرداری پاکستان واپس آئے تو ہزاروں افراد کو گرفتار کرلیا گیا، اُن پر لاٹھی چارج کیا گیا اور آنسو گیس کے شیل برسائے گئے۔ اس کے علاوہ ریل گاڑیوں، بسوں اور کاروں کو روک دیا گیا اور بعض پر قبضہ کرلیا گیا۔

اس وقت کسی نے اس زیادتی کا نوٹس نہ لیا جس سے ریاستی دہشت گردی کے حامیوں کے حوصلے بڑھے اور بالآخر 12 مئی 2007ء کو کہیں بڑھ کر ابتر صورت حال سامنے آئی، جب کراچی کے بے گناہ لوگوں کو خون بہانے کے لیے موت کے سوداگروں کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ اب یہ خونِ ناحق ہمارے اجتماعی ضمیر کو پکار رہا ہے...... یا تو ہم اس پاگل پن کو روکنے کے لیے اپنے عزم کا اظہار کریں یا پھر دہشت گردوں کو آہستہ آہستہ ملک کے دیگر مختلف علاقوں پر بھی تسلط قائم کرنے کی اجازت دے دیں۔

ایسا لگتا ہے کہ حکومت نے شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے کے بجائے ملک کے مختلف حصے طرح طرح کے مافیاز، دہشت گردوں، ٹھگوں اور چور اُچکوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے ہیں۔ قبائلی علاقے کم وبیش طالبان کی حامی قوتوں کے حوالے کردیئے گئے ہیں اور حکومت ان کے ساتھ امن کے معاہدوں پر دستخط کررہی ہے۔ جواباً ان لوگوں نے قانون ہاتھ میں لے لیا ہے اور وہ ان لوگوں کو قتل کررہے ہیں جو ان سے مختلف انداز میں سوچتے ہیں، جب کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

ٹانک، بنوں اور مالاکنڈ میں دہشت گردوں کے مختلف گروپوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہے اور وہ لوگ قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے کر مقامی آبادی کو ہراساں کرنے میں مصروف ہیں جب کہ پولیس دور کھڑی یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہی ہے۔

دارالحکومت اسلام آباد کا ایک حصہ لال مسجد کے امام کی سربراہی میں انتہا پسندوں کے سپرد کردیا گیا ہے۔ وہاں وہ لوگ مذہب کے نام پر اراضی پر قبضے کررہے ہیں، پولیس اہلکاروں سمیت شہریوں کو اغواء کیا جارہا ہے، سڑکوں اور بازاروں میں گشت کرکے خواتین کو ہراساں کرنے کے علاوہ حجاموں، بیوٹی پارلروں اور تفریحی صنعت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ لیکن وہاں بھی پولیس خاموش کھڑی ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا خیال ہے کہ ملک کو یہ جاننے کا حق ہے کہ 12 مئی 2007ء کو پولیس کو بڑی حد تک غیر مسلح کیوں کردیا گیا اور یہ کام کس کے حکم پر ہوا۔ اب تک بے رحمی سے قتل ہونے والوں کی تعداد 42 ہو چکی ہے۔ عدلیہ کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھنے، ملک اور بے گناہوں کو

بچانے کے لیے صورت حال کا ازخود (suo motu) نوٹس لے۔ اگر اعلیٰ عدلیہ نے اس وقت مداخلت نہ کی تو اگلی دفعہ اس سے کہیں بڑھ کر خراب صورت حال پیش آ سکتی ہے۔ حالت یہ ہے کہ دہشت گردوں کے حوصلے بڑھائے جا رہے ہیں اور ریاست ان کے خلاف کارروائی کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔

اس صورت حال کا افسوسناک ترین پہلو یہ ہے کہ اعلیٰ عدلیہ کے معزز ارکان کو بھی نہیں بخشا گیا۔ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ سکیورٹی کی خاطر عدالت کے بلانے پر بھی کور کمانڈر نہ آئے۔ کور کمانڈر کی کمان میں جتنے جوان ہوتے ہیں اس کے پیش نظر یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ فوج انہیں ہائی کورٹ تک نہیں پہنچا سکتی تھی جہاں عدلیہ ہلاک شدگان اور مارے جانے والوں کی مدد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ حالات 1970ء میں آرمی آپریشن سے پہلے والے ڈھاکے کا نقشہ پیش کر رہے تھے جہاں مکتی باہنی نے سڑکوں اور گلیوں کا کنٹرول سنبھال رکھا تھا اور وہ شہریوں کو خوفزدہ کرنے میں مصروف تھے۔

بار کے سینئر ممبران، جنہوں نے سالہا سال تک قانون وانصاف کی خدمت کی تھی، بھاگنے اور جائے پناہ تلاش کرنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ بار کے ایک حصے کو بھی جلا دیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کی آئینی مشینری آئین کے تحت اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں بُری طرح ناکام ہو چکی ہے۔

ماضی میں غلط بنیادوں پر جمہوری حکومتیں برطرف کی جاتی رہیں، جس سے آئینی مشینری کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا لیکن 12 مئی کو حکومتی مشینری واقعتاً زمین بوس ہو گئی۔ بتایا گیا ہے کہ انسپکٹر جنرل آف پولیس نے عدلیہ سے کہا کہ وہ کشت وخون اور ہنگامہ آرائی نہیں روک سکتے۔ ظاہر ہے اس شرمناک کھیل کو سیاسی تحفظ حاصل تھا۔

اس سے یہ سنجیدہ اور بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ملک کسی ایسی حکومت کا متحمل ہو سکتا ہے جو قاتلوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے کی مرتکب ہو رہی ہو، اور مجرموں کے خلاف مرنے والوں کے ورثاء اور اقدام قتل کا نشانہ بننے والوں کی جانب سے مقدمات درج کرنے سے انکاری ہو۔ بدقسمتی سے پوری حکومت یہی کچھ کر رہی ہے۔ وہ نہ صرف 12 مئی کے قتل عام کے مجرموں کو تحفظ دے رہی ہے بلکہ اس سے پہلے بھی وہ کئی واقعات میں بھی یہی کچھ کر چکی ہے۔ جس سے ثابت ہو گیا ہے کہ جب تک کوئی نہ کوئی قدم نہیں اُٹھائے گا سیاسی افراتفری ختم نہیں ہو گی، جس پر موجودہ حکومت کا دارومدار ہے۔ اداروں کی تباہی کے اس دور میں عدلیہ واحد ادارہ ہے جس سے اُمید وابستہ کی

جاسکتی ہے۔ اس لیے قوم کو بجا طور پر اُمید ہے کہ عدلیہ فعالیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مداخلت کر کے ملک کو دہشت گردی اور ڈکٹیٹر شپ سے نجات دلائے گی۔

پاکستان پیپلز پارٹی عدلیہ سے درخواست کرتی ہے کہ وہ آئین کے تحت لوگوں کی مدد کو آئے اور 12 مئی 2007ء کے واقعات کا از خود نوٹس لے۔ آئینی مشینری کی مکمل ناکامی کے بعد لوگوں کا اعتماد بحال کرنے کے لیے کم از کم از خود نوٹس لیتے ہوئے اُن لوگوں کو بے نقاب کرنے کے لیے انکوائری کرے جو قتل و غارت اور مہلک اسلحے کے کھیل میں حصہ دار ہیں، اور جنہوں نے پاکستان کی تاریخ کے ایک سیاہ ترین دن میں کراچی کی سڑکوں کو خون سے رنگین کر دیا۔

میں کٹھن منزلوں کی راہی ہوں

تاریخ میں کچھ لمحات مستقبل کے لیے اہم موڑ ثابت ہوتے ہیں۔ امریکہ میں خانہ جنگی ایک ایسا ہی لمحہ تھا۔ دیوار برلن کا انہدام بھی جرمنی اور یورپی یونین کے لیے ایک ایسا لمحہ ثابت ہوا۔ آج پاکستان لمحہ صداقت پر کھڑا ہے۔ آج جو فیصلے کئے جائیں گے انہی پر منحصر ہوگا کہ آیا پاکستان کو اندرونی تباہی سے بچانے کے لیے انتہا پسندی اور دہشت گردی پر قابو پایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ آج صرف پاکستان کا استحکام ہی نہیں بلکہ مہذب دنیا کا امن بھی خطرے میں ہے۔

پاکستان کے جمہوری دور میں انتہا پسند تحریکیں سر نہیں اُٹھا سکیں۔ تمام جمہوری انتخابات میں انتہا پسند مذہبی جماعتیں کبھی 11 فیصد سے زائد ووٹ حاصل نہیں کر پائیں۔ لیکن آمر حکمرانوں کے ادوار، خصوصاً 1980ء کے عشرے میں جنرل ضیاء الحق اور بدقسمتی سے رواں دہائی میں جنرل مشرف کی حکومت کے دوران مذہبی انتہا پسندوں نے میرے وطن کی سرزمین میں جڑیں گہری کر لیں۔

ضیاء الحق جیسے لیڈروں نے مذہب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہو یا آمریت نے مایوسی و محرومی کو جنم دیا ہو، یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ انتہا پسندی میری قوم ہمارے خطے اور پوری دنیا کے لیے ایک خطرہ بن کر ابھری ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بین الاقوامی دہشت گردی کی پناہ گاہ انتہا پسند ہی ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ عمل واپسی کی جانب پلٹنا چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

میری وزارت عظمیٰ کے دونوں ادوار میں میری حکومت نے پاکستان کے تمام حصوں میں

قانون کی عملداری نافذ کی۔ ملک کے چاروں صوبوں اور وزیرستان سمیت فاٹا میں بھی قانون کی حکمرانی تھی۔ ہم نے انہی قبائلی علاقوں کے عوام کی حمایت سے منشیات کے کاروبار میں ملوث اس بین الاقوامی گروہ کا قلع قمع کیا جسے آمرانہ دور میں کھلی چھٹی دیدی گئی تھی۔

آج وہی بین الاقوامی منشیات فروش مذہبی انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کی صفوں میں داخل ہو چکے ہیں۔ موجودہ حکومت نے ہمارے ملک کا بہت بڑا حصہ طالبان اور القاعدہ کے حامیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ رکھا ہے اور اس کا دعوی ہے کہ اسے حکومتی دائرۂ عمل میں نہیں لایا جا سکا۔ مجھے یقین ہے ان علاقوں پر قانون کی حکمرانی قائم کی جا سکتی ہے۔ البتہ وہاں ایک جمہوری حکومت ہی ریاستی عملداری بہتر طور پر بحال کر سکتی ہے۔

ہمیں پاکستان کی تاریخ اور سیاست کے بارے میں حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ ایک کامل دنیا میں شاید فوج کا کوئی سیاسی کردار نہیں ہوگا۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان کاملیت کے درجے سے بہت نیچے ہے۔ پاکستان میں سیکورٹی فورسز نے بنیادی طور پر ایک سیاسی ادارے کا کردار ادا کیا۔ وہ یا تو براہ راست جرنیلوں کے ذریعے حکومت کرتی رہیں یا سازشوں کے ذریعے جمہوری حکومتوں کو برطرف کر کے بالواسطہ یہ شوق پورا کرنے میں مصروف رہیں۔

میں جانتی ہوں، کچھ لوگوں کو حیرت ہوئی ہے کہ میں جمہوریت کی بحالی اور پاکستان کے مستقبل کے لیے جنرل مشرف سے مذاکرات کیوں کر رہی ہوں۔ میں واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ آمریت کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا۔ پارلیمان کو لازمی طور پر سب سے بالادست ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے جنرل مشرف پر واضح کر دیا ہے کہ میری جماعت پاکستان پیپلز پارٹی آئین کی بالادستی کی حامی ہے جس کا تقاضا ہے کہ صدر ایک سویلین شخصیت ہو جسے پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں متعلقہ قواعد وضوابط کے مطابق منتخب کریں۔ میں نے بدھ کے روز اعلان کیا تھا کہ مشرف نے آرمی چیف کا عہدہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

لیکن یہی واحد ایشو نہیں۔ دوبار وزیراعظم منتخب ہونے والوں پر پابندی کا معاملہ جس کی زد میں میں خود بھی آتی ہوں، درپیش ہے تیسری بار اس منصب پر فائز ہونے پر پابندی آئین کا حصہ نہیں تھا، اس لیے اسے ختم ہونا چاہیے۔

ان تمام ارکان پارلیمنٹ اور عوامی نمائندگی کے عہدوں پر فائز افراد جو 1999ء کے فوجی ایکشن سے پہلے منتخب ہو چکے تھے اور جنہیں کسی بھی جرم میں سزا نہیں سنائی گئی، ان کے خلاف سیاسی بنیادوں پر عائد کئے گئے الزامات ختم کر کے ان کے لیے عام معافی کا اعلان کیا جائے۔ تمام

جماعتوں اور تمام پارٹی لیڈروں کو آزادانہ طور پر الیکشن لڑنے کی اجازت دی جائے۔ آئین کے مطابق ایک غیر جانبداری عبوری حکومت قائم کی جائے جو آئندہ انتخابات سے قبل قومی امور کی نگرانی کرے۔ اسی طرح تمام سیاسی جماعتوں کی شرکت سے ایک آزاد اور خود مختار الیکشن کمیشن تشکیل دیا جائے۔

انتخابی فہرستوں کی تیاری میں سیاسی مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔ ووٹنگ اور ووٹوں کی گنتی کو بھی سیاسی مداخلت سے پاک کیا جائے اور پورے انتخابی عمل کی نگرانی بین الاقوامی مبصرین کریں۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ درست ہے کہ فقط آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ہی پاکستان کے مسائل حل کرنے کے لیے کافی نہیں۔ ہمیں ایک آزاد، شفاف اور موثر حکمرانی درکار ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ملک کی تمام ذمہ دار اور اعتدال پسند قوتوں کو متحرک ہونا ہوگا جو ایک ہی ہدف کے لیے متحد ہو کر کام کریں۔

جنرل مشرف کو بین الاقوامی برادری اور مسلح افواج کی حمایت بدستور حاصل ہے لیکن یہ جماعت ان پاکستانی عوام کی خواہشات کا بدل نہیں بن سکتی جنہیں اقتدار سے محروم اور مایوس کر دیا گیا ہے۔ بڑھتی ہوئی غربت اور بیروزگاری سے واضح ہوگیا کہ جمہوریت کے بغیر لوگوں کی ضروریات پوری نہیں کی جا سکتیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک ووٹ کے ذریعے پاکستانی عوام کو اقتدار منتقل نہیں کر دیا جاتا، انتہا پسند ان کی محرومیوں کو اپنے مفاد میں استعمال کرتے رہیں گے۔

مجھے پختہ یقین ہے کہ جمہوریت اور اعتدال پسندی شانہ بشانہ آگے بڑھیں گی۔ دیگر پاکستانیوں کی طرح مجھے بھی اس بات کا شدید دکھ ہے کہ قبائلی علاقوں میں ہماری سرزمین کا ایک حصہ دہشت گردوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فائر بندیوں اور امن معاہدوں سے انتہا پسندوں کو ملکی دھارے میں شامل کر کے انہیں اعتدال پسند بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن پاکستان میں اس تجربے کا الٹ نتیجہ برآمد ہوا۔ ہر سیز فائر اور امن معاہدے سے جنگجوؤں اور دہشت گردوں کے حوصلے بڑھے۔ اس کا بدترین مظاہرہ اسلام آباد کی لال مسجد کے محاصرے کے دوران دیکھنے میں آیا۔

مسجد میں مورچہ بند جنگجوؤں نے پاکستانی قوانین کو بالائے طاق رکھ کر اپنے قواعد و ضوابط مسلط کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے خواتین اور پولیس اہلکاروں کو اغوا کیا، تفریحی سامان فروخت کرنے والے دکانداروں کو خوفزدہ کیا اور ان کی دکانیں بند کرا دیں۔ ان کے ڈنڈا بردار دستے دارالحکومت میں کار چلانے والی خواتین کو خوفزدہ کرتے رہے۔ ان کے ساتھ حکومت کے چھ ماہ

طویل مذاکرات ناکام ہوگئے۔ بالآخر خون خرابہ ہوا اور فوج کی فائرنگ سے 100 سے زائد افراد مارے گئے۔ لال مسجد کے واقعے سے یہ ثابت ہوگیا کہ مذہبی جنونیوں کے ساتھ معاہدے کارگر نہیں ہوسکتے۔

اس وقت پاکستان ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ ہماری کامیابی سے دنیا بھر میں موجود ایک ارب مسلمانوں کو یہ پیغام ملے گا کہ اسلام جمہوریت، جدیدیت اور اعتدال کے راستوں سے ہم آہنگ ہے۔ میں یہ جانتے ہوئے بھی، اسی سال موسم خزاں میں واپس پاکستان جاؤں گی کہ آنے والے دن میرے لیے بہت کٹھن ہوں گے۔ لیکن مجھے عوام پر بھروسہ ہے اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتی ہوں۔ میں خوفزدہ نہیں۔ جی ہاں! ہم ایک اہم موڑ پر پہنچ چکے ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ وقت، عدل وانصاف اور تاریخ کی قوتیں ہمارا ساتھ دے رہی ہیں۔

جب میں پاکستان آؤں گی

میں 18 اکتوبر کو پاکستان واپس جا رہی ہوں تا کہ میں اپنے ملک میں تبدیلی لاؤں۔ پاکستان کا استحکام اور سلامتی عوام کو بااختیار بنانے اور سیاسی ادارے قائم کرنے میں ہے۔ میرا مقصد ہے کہ میں ثابت کروں کہ آنے والی نسلوں کا بہتر مستقبل جمہوریت میں پنہاں ہے۔

پاکستان میں مرکزی مسئلہ اعتدال پسندی اور انتہا پسندی کے درمیان ہے۔ اس مسئلے کے حل سے دنیا خاص پور پر جنوبی اور وسطی ایشیا اور مسلم اقوام پر اثر پڑے گا۔ انتہا پسند صرف وہاں پنپ سکتے ہیں، جہاں عوام کی بنیادی، سماجی ذمے داریوں کو حکومت نظرانداز کرتی ہے۔ سیاسی ڈکٹیٹرشپ اور سماجی بدد لی بہت زیادہ مایوسی کو جنم دیتی ہے، جو مذہبی انتہا پسندی کو ایندھن فراہم کرتی ہے۔

پاکستان کی ساٹھ سالہ تاریخ میں ملک ڈکٹیٹرشپ اور جمہوریت، انتخابات اور دھاندلی سے پُر انتخابات سے دوچار رہا ہے، لیکن مذہبی بنیاد پرست کبھی بھی پاکستان کے سیاسی شعور کا حصہ نہیں رہے۔ ہم بنیادی طور پر معتدل قوم ہیں۔ تاریخی طور پر مذہبی پارٹیوں نے قومی انتخابات میں 11 فیصد سے زیادہ ووٹ کبھی بھی حاصل نہیں کیے۔ ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی میری پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی ہے۔ پاکستان کا سیاسی منظرنامہ بنیادی طور پر پیپلز پارٹی پر مشتمل ہے، جو کہ ایک معتدل پارٹی ہے، جس کی حمایت ملک کے دیہی اور شہری عوام میں یکساں طور پر موجود ہے۔

انتہا پسندی ایک خطرے کی حیثیت سے موجود ہے لیکن اس پر قابو پایا جا سکتا ہے، جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا ہے۔ اس کے لیے اعتدال پسند عوام کو بنیاد پرستی کے خلاف کھڑے ہونے کے لیے متحرک کیا جا سکتا ہے۔ میں اس جنگ کی قیادت کے لیے واپس جا رہی ہوں۔

میں نے ایک غیر معمولی زندگی بسر کی۔ میں نے اپنے والد کی موت کا صدمہ برداشت کیا ہے، جنہیں 50 سال کی عمر میں شہید کر دیا گیا۔ میرے دونوں بھائیوں کو عنفوانِ شباب میں قتل کر دیا گیا۔ میں نے اکیلے اپنے بچوں کی پرورش کی ذمے داری نبھائی، کیونکہ میرے شوہر کو بغیر کسی سزا کے آٹھ سال پابند سلاسل رکھا گیا۔ وہ میری سیاست کے یرغمال رہے۔ میں نے اُس وقت سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا، جب میرے والد کے قتل کے بعد یہ ذمے داری میرے کاندھوں پر ڈال دی گئی۔ میں نے اُس وقت بھی ذمے داری سے دامن نہیں چُرایا اور اب بھی اپنی ذمے داریاں پوری کروں گی۔

میں اس بات سے آگاہ ہوں کہ پاکستان میں کچھ لوگوں نے مذاکرات پر سوالات اُٹھائے۔ میں گذشتہ کئی ماہ سے جنرل پرویز مشرف سے مذاکرات میں مشغول رہی ہوں۔ میں نے یہ مذاکرات اس امید پر کیے کہ مشرف فوج سے مستعفی ہو جائیں گے اور جمہوریت بحال کر دیں گے۔

مذاکرات کرنے سے میرا مقصد کبھی بھی ذاتی مفاد نہیں تھا، بلکہ یہ یقینی بنانا تھا کہ پاکستان میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد ہوں تاکہ جمہوریت کو بچایا جا سکے۔ انتہا پسندی کے خلاف لڑائی کے لیے قومی سطح پر کوشش کی ضرورت ہے، جو کہ صرف جائز انتخابات کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ ہمارے انٹیلی جینس اداروں اور فوج میں ایسے عناصر موجود ہیں، جن کی ہمدردیاں انتہا پسندوں کے ساتھ ہیں۔ اگر یہ عناصر پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ نہیں تو مذہبی انتہا پسندی کے خلاف لڑائی جو پاکستان کی فوج کو ہر صورت میں انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں حصہ لینا ہوگا، لیکن 11 ستمبر 2001ء سے لے کر اب تک کے چھ برسوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ فوج اکیلے یہ لڑائی نہیں لڑ سکتی۔

ہمارے سیاسی ڈھانچے میں متعدد امور اب تک حل نہیں ہو سکے۔ مشرف وردی یا وردی کے بغیر دوبارہ صدر کا انتخاب نہیں لڑ سکتے۔ پاکستانی قانون کے مطابق اگر فوج کا کوئی رکن صدارتی انتخاب لڑنا چاہتا ہے تو فوج سے مستعفی ہونے کے بعد اسے دو سال انتظار کرنا پڑے گا۔ جنرل عوام کی امنگوں کی قدر کر سکتا ہے اور عوام چاہتے ہیں کہ پارلیمانی اور صدارتی انتخابات منعقد کیے جائیں تو وہ انتخابات کروا سکتا ہے یا پھر وہ آئین سے کھیل سکتا ہے۔ اگر آئین سے چھیڑ چھاڑ کی گئی تو یہ عدلیہ، وکلاء برادری اور سیاسی پارٹیوں سے نئے تصادم کو جنم دے سکتی ہے۔ ایسا تصادم ایک نئے مارشل لا کو جنم دے سکتا ہے یا معاشرے میں انتشار پھیلا سکتا ہے اور یہ دونوں ایک ساتھ ہو سکتے ہیں۔

معاشرے میں یہ انتشار انتہا پسند چاہتے ہیں۔ انتشار اور گڑبڑ ان کو موافق ہے۔ مشرف کی

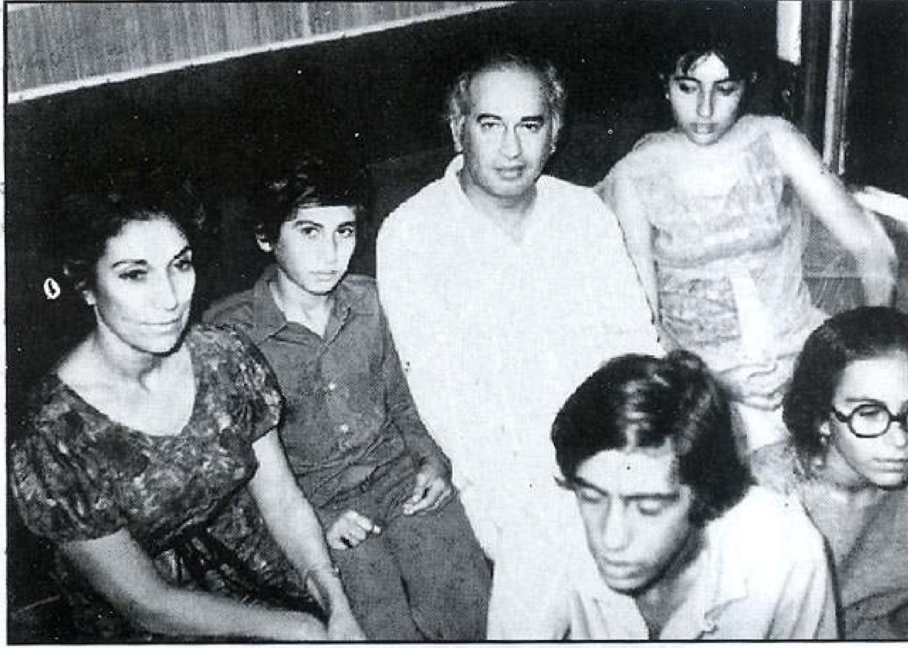
پارٹی میں موجود سیاسی عناصر، جن کے دور میں انتہا پسندوں کو عروج ملا ہے، 1996ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کی برطرفی کے بعد ہر پاکستانی انتظامیہ کا حصہ رہے ہیں۔ یہی لوگ سیاسی تبدیلی کو روک رہے ہیں، جس کے لیے میں نے مشرف سے مذاکرات میں کوشش کی ہے۔ ان کو یہ خطرہ ہے کہ جمہوریت میں انتہا پسندوں اور عسکریت پسندوں کے لیے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ مشرف کے ساتھ مذاکرات کا مقصد ملک سے اس ڈکٹیٹر شپ کا خاتمہ ہے، جو قبائلی علاقوں کو دہشت گردوں کی جنت بننے سے روکنے میں ناکام ہوگئی۔ اب تو دہشت گرد پاکستان کے شہروں میں بھی پھیل رہے ہیں۔ گزشتہ ہفتے ایک نیا چیلنج سامنے آیا۔ صرف چند دن قبل پاکستان کے الیکشن کمیشن نے آئینی شقوں میں یک طرفہ طور پر صدارت کے لیے انتخاب لڑنے کی اہلیت میں ترمیم کر دی۔ آئین میں صرف پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت سے ترمیم کی جا سکتی ہے اور اب ایک نیا عدالتی مسئلہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ میں اور میری پارٹی چاہتی ہیں کہ ایک قومی اتفاق رائے کی حکومت کے تحت قائم کردہ ایک خود مختار الیکشن کمیشن آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کروائے۔ ہم تمام امیدواروں اور پارٹیوں کے لیے برابر کے مواقع چاہتے ہیں۔ اسٹالن سے منسوب کردہ الفاظ ''وہ لوگ جو ووٹ ڈالتے ہیں، کوئی فیصلہ نہیں کرتے، جو لوگ ووٹوں کی گنتی کرتے ہیں، وہ ہر بات کا فیصلہ کرتے ہیں۔'' یہی وجہ ہے کہ ہم نے انتخابی اصلاحات کرنے پر زور دیا ہے، لیکن اب تک ہماری کسی کوشش کا مثبت جواب نہیں دیا گیا۔ صدر بش نے درست طور پر نوٹ کیا ہے کہ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ میں سب سے طاقتور ہتھیار گولی یا بم نہیں، بلکہ عالمی آزادی ہے۔ آزادی کے لیے ہر ذی روح خواہش رکھتا ہے۔'' جب میری پرواز اگلے ماہ پاکستان میں اُترے گی، مجھے معلوم ہے کہ عوام جوش و خروش سے میرا استقبال کریں گے۔ مجھے نہیں پتا کہ میرے ساتھ ذاتی اور سیاسی طور پر کیا سلوک کیا جائے گا۔ میں بہتر حالات کی دُعا کرتی ہوں اور خراب ترین حالات کے لیے تیار ہوں، لیکن ہر صورت میں وطن واپس جا رہی ہوں تا کہ دنیا کی جمہوری اقوام میں پاکستان کا مقام بحال کراؤں۔



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی معصومیت کی ایک جھلک، محترمہ اپنی والدہ کے ساتھ



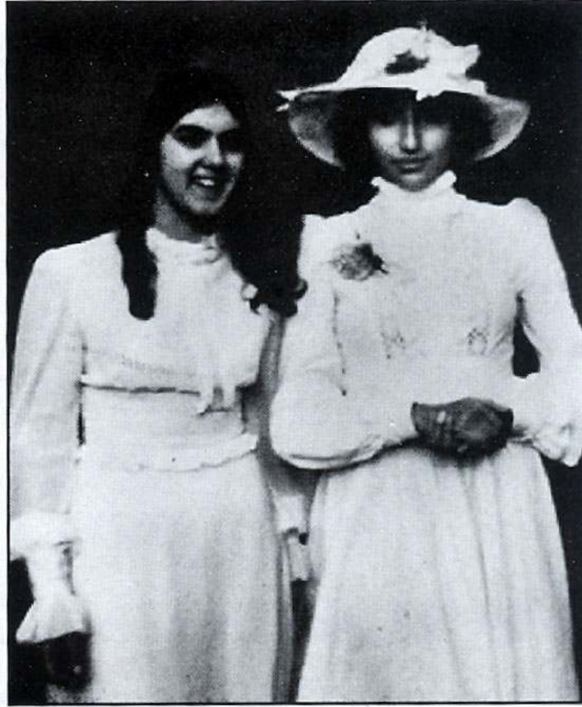
محترمہ بے نظیر بھٹو شہید (پیچھے بائیں) اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو شہید
اور بھائی بہن کے ساتھ (کچھ لمحے امر ہو جایا کرتے ہیں)



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید اپنے عظیم والد اور بھائی بہنوں کے ساتھ



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید اپنے کراچی کے گھر میں



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید اپنی سہیلی کے ساتھ



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید شملہ (انڈیا) میں ڈالز میوزیم کی سیر کے دوران



شملہ دورہ کے دوران محترمہ بے نظیر بھٹو شہید، اندرا گاندھی اور عظیم والد
ذوالفقار علی بھٹو شہید کے ساتھ



شملہ دورہ کا ایک منظر



آکسفورڈ یونیورسٹی کا ایک یادگار لمحہ



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی زندگی کا ایک یادگار تصویر



محترمہ بےنظیر بھٹو شہید اپنے والد کی گرفتاری پر افسردہ ہیں۔



بیگم نصرت بھٹو اپنے خاوند ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری کے بعد
راولپنڈی میں خطاب کرتے ہوئے۔ پیچھے محترمہ بےنظیر بھٹو شہید کھڑی ہیں۔



وطن واپسی کے چند روز بعد محترمہ بےنظیر بھٹو شہید
راولپنڈی، میں عوام سے خطاب کرتے ہوئے



کراچی میں عوام کو ہاتھ ہلا کران کے سلام کا جواب دے رہی ہیں



راولاکوٹ (کشمیر) میں عوام سے خطاب کرتے ہوئے



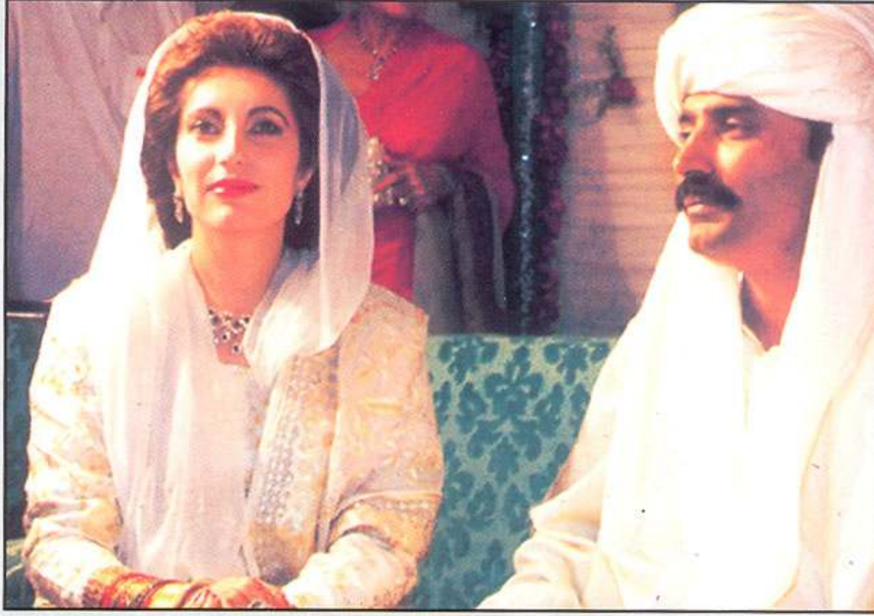
پریس کانفرنس کے دوران ایک انداز



صدر پاکستان غلام اسحاق خان محترمہ بے نظیر بھٹو شہید سے وزیراعظم کا حلف لیتے ہوئے



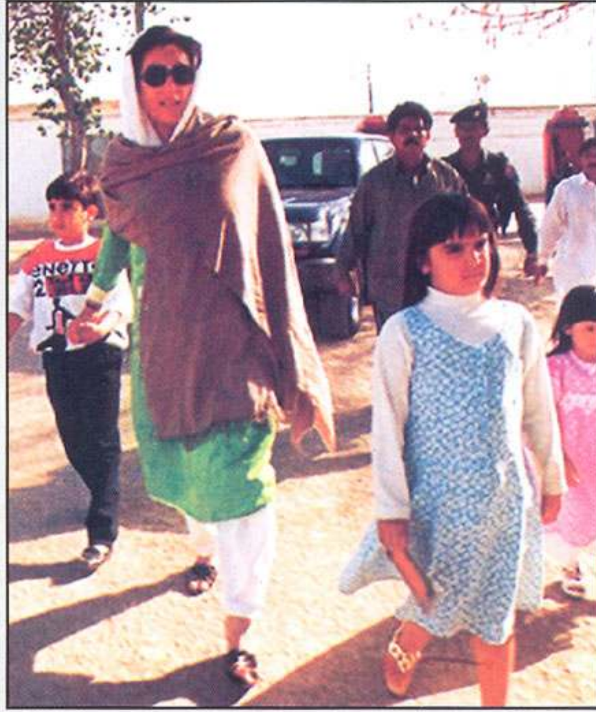
وزیراعظم حلف برداری کا ایک اور منظر



محترمہ بےنظیر بھٹو شہید اور آصف علی زرداری کی شادی کے موقع پر یادگار تصویر



محترمہ بےنظیر بھٹو شہید اپنے خاوند آصف علی زرداری
کے ساتھ پارلیمنٹ ہاؤس اسلام آباد میں



محترمہ بےنظیر بھٹو شہید اپنے بچوں کے ساتھ لانڈھی جیل میں
اپنے خاوند آصف علی زرداری سے ملاقات کے لیے آ رہی ہیں



محترمہ بےنظیر بھٹو شہید امریکی صدر جارج ایچ ڈبلیو بش (سنیئر بش)
سے ٹوکیو (جاپان) میں شاہ ہیروہیتو کے جنازہ کے موقع پر ملاقات کر رہی ہیں



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید، ملکہ برطانیہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید جنوبی افریقہ کے صدر نیلسن منڈیلا کے ساتھ



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید امریکی خاتون اوّل ہیلری کلنٹن کے اعزاز میں دیئے
گئے لنچ کے دوران اسلام آباد ہاؤس میں مسکراتے ہوئے



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید ایک غیر ملکی ٹی وی چینل کے ٹاک شو کے دوران



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید لندن میں میثاق جمہوریت دستخط کرنے کے موقع پر
نواز شریف سے ملاقات کر رہی ہیں



لندن میں نواز شریف سے ملاقات کے بعد پریس کانفرنس میں ایک انداز



محترمہ بےنظیر بھٹوشہید، بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی سے ملاقات کے موقع پر



محترمہ بےنظیر بھٹوشہید شہادت سے چنددن قبل ترکی کے صدر عبداللہ گل سے ملاقات کے موقع پر



محترمہ بےنظیر بھٹو شہید امریکی یونیورسٹی میں لیکچر دیتے ہوئے



محترمہ بےنظیر بھٹو شہید کی ایوارڈ لیتے ہوئے ایک یادگار تصویر



محترمہ بےنظیر بھٹو شہید الیکشن 2008ء کے منشور کے
اعلان کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کر رہی ہیں۔



محترمہ بےنظیر بھٹو شہید واشنگٹن ڈی سی میں "دہشت گردی کے خلاف جنگ اور پاکستان
میں جمہوریت کے مستقبل" کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کے ساتھ ملاقات کر رہی ہیں



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کا تقریر کرتے ہوئے ایک انداز



کراچی حملہ کے بعد سیاہ پٹی باندھے پریس کانفرنس سے کچھ دیر پہلے



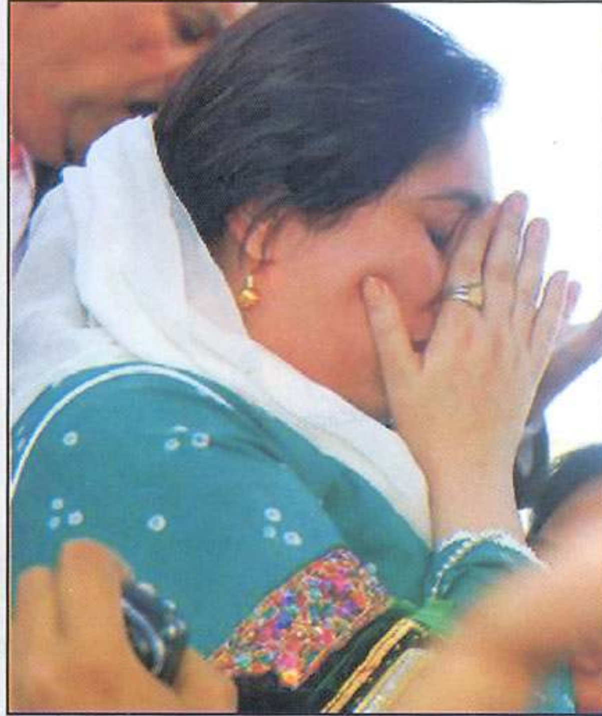
اے آر ڈی کے اجلاس میں محترمہ بے نظیر بھٹو شہید
کا ایک انداز گفتگو



محترمہ بےنظیر بھٹو شہید پاکستان روانگی سے قبل
دبئی میں اپنے گھر میں



محترمہ بےنظیر بھٹو شہید دبئی سے واپسی پر



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید جلاوطنی کے بعد کراچی ائیر پورٹ پر
فرط جذبات پر قابو نہ رکھتے ہوئے رو رہی ہیں



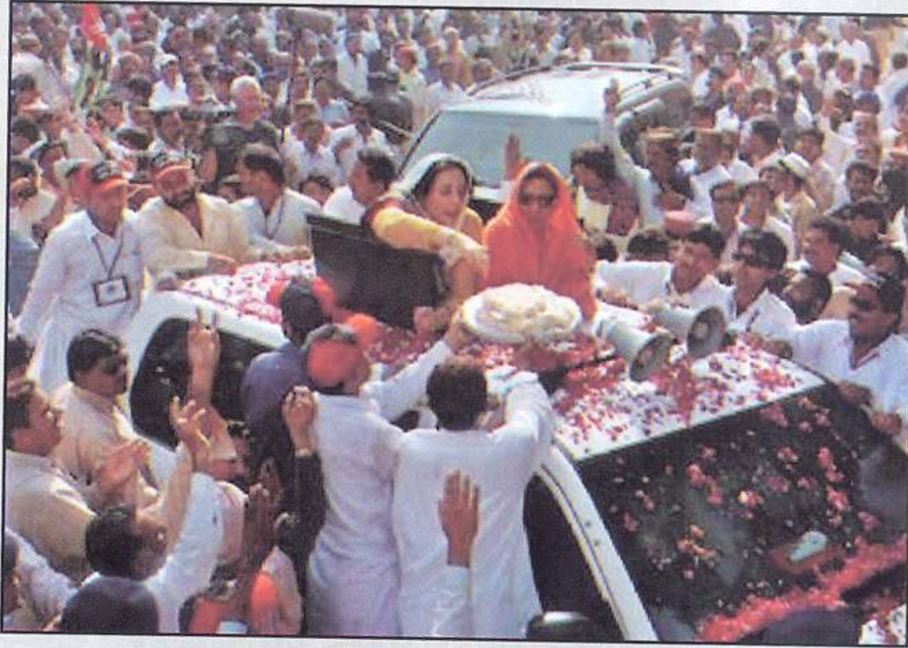
محترمہ بے نظیر بھٹو شہید آٹھ سالہ جلاوطنی کے بعد پاکستان پہنچنے پر خوشگوار موڈ میں



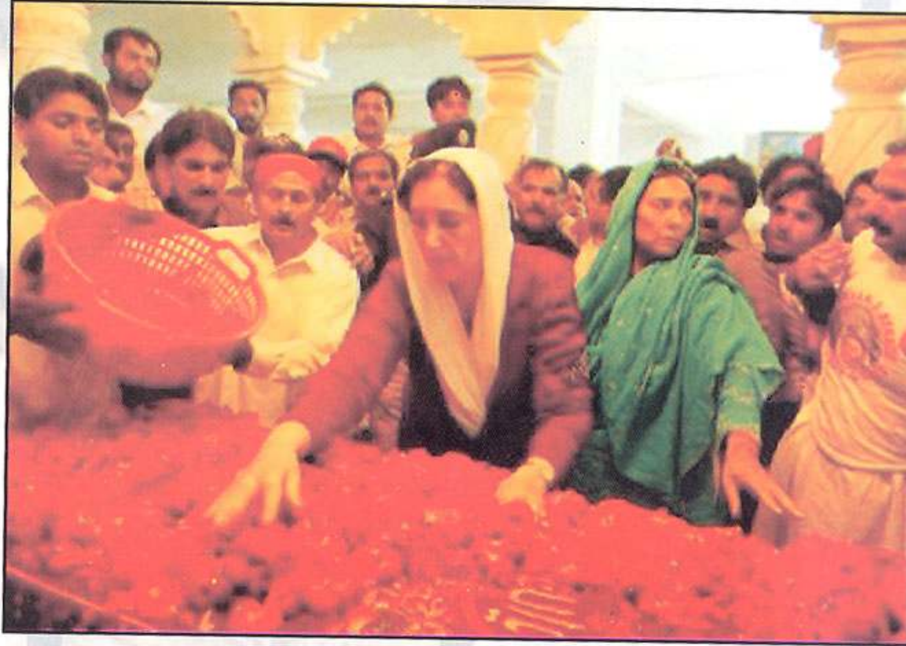
کراچی ایئرپورٹ پر عوام کو ہاتھ ہلاتے ہوئے



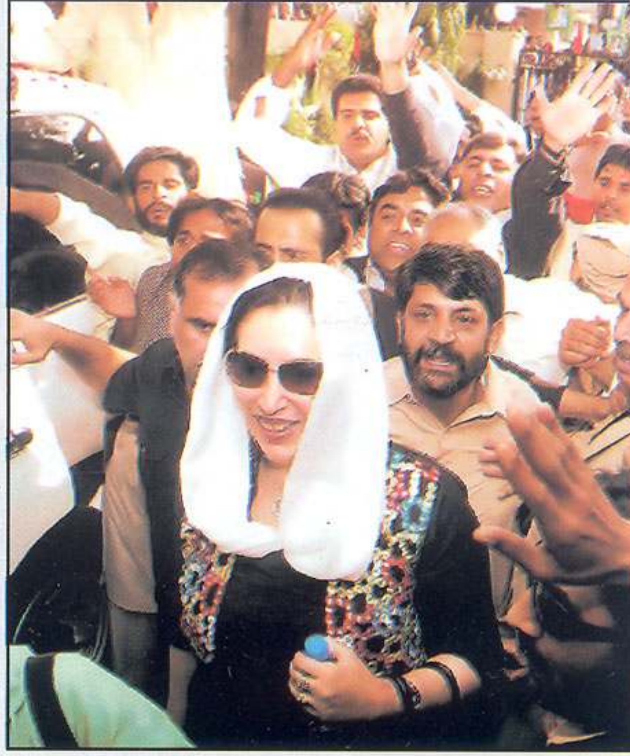
محترمہ بے نظیر بھٹو شہید پاکستان پہنچنے پر۔



کراچی میں عوام کا ایک جم غفیر محترمہ کا استقبال کر رہا ہے



اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو شہید کی قبر پر حاضری دیتے ہوئے۔



پیپلز پارٹی سنٹرل سیکرٹریٹ میں
ایمرجنسی کے خلاف پریس کانفرنس کے لیے آ رہی ہیں



پیپلز پارٹی کی 40ویں یوم تاسیس پر کیک کاٹتے ہوئے



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید انڈین ہائی کمشنر سیتا براتا پال سے ملاقات کے دوران



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کا پریس کانفرنس کرتے ہوئے ایک انداز، امین فہیم بھی ساتھ ہیں۔



جلسہ لیاقت باغ کے چند لمحات



محترمہ شہادت سے قبل جلسہ لیاقت باغ راولپنڈی میں عوام کے نعروں کا ہاتھ ہلا کر خیر مقدم کر رہی ہیں۔



تاریخی لیاقت باغ میں شہادت سے قبل خطاب کرتے ہوئے



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کا آخری دیدار



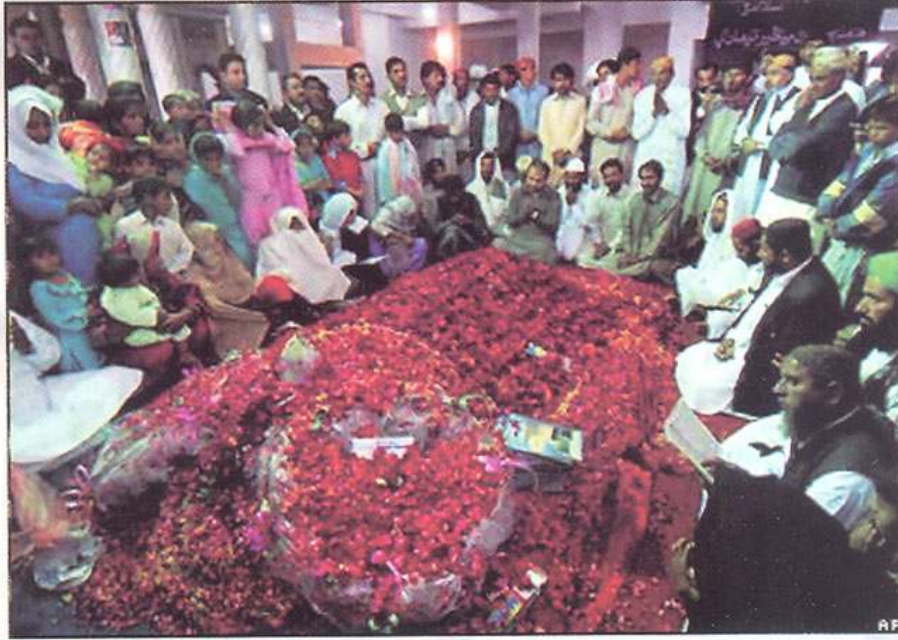
محترمہ کی آخری آرام گاہ کی تیاری



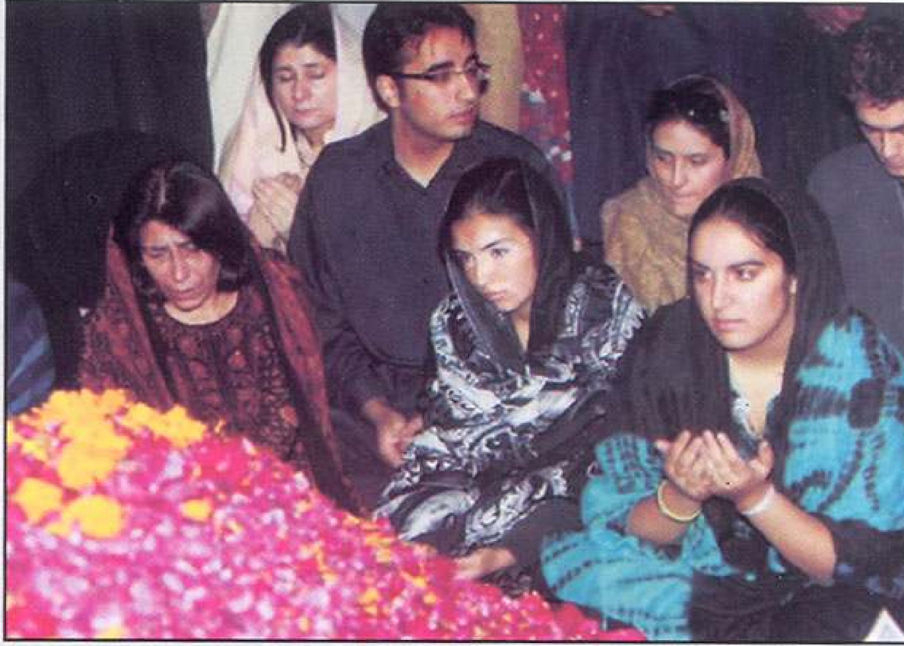
پیپلز پارٹی کے جیالے اپنی محبوب قائد کا آخری دیدار کرتے ہوئے



دخترِ مشرق محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کو لحد میں اُتارتے ہوئے



محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی آخری آرام گاہ



بلاول بھٹو زرداری ، بختاور اور فاطمہ اپنی والدہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کرتے ہوئے

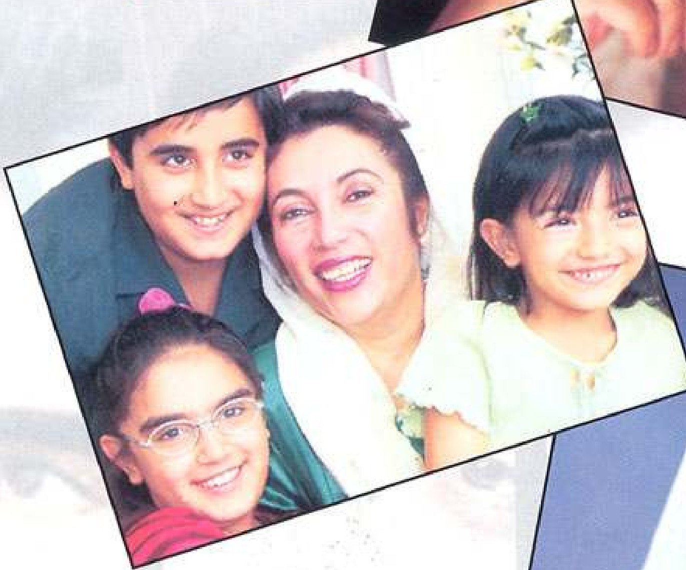


دختر مشرق محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کو خراج تحسین پیش کرنے کا ایک انداز

چند یادگار تصاویر











MILITANTS KNOCK ON ISLAMABAD'S DOORS

The extremist forces, as predicted by the Pakistan People's Party, have made great strides since they were driven out of their safe sanctuaries in Afghanistan. Time has proven the apprehensions that they would regroup in Pakistan if the democracy was not restored in 2002.

The denial of power to the PPP in 2002 through the rigging of the general elections, the postponement of the parliamentary session and the horse-trading to break the PPP parliamentary strength set the stage for this to happen with severe repercussions for Pakistan.

The extremists, a mix of foreign and local Taliban and central Asian al-Qaeda appear, according to reports, to have secured a base in the tribal areas. They have regrouped after their demoralising defeat in 2001. They are re-organised, re-armed and operate irregular armies equipped with suicide bombers and guerrilla tactics.

Most of the forces associated with the Muslim Brotherhood Zia dictatorship of the eighties had ties to the Afghan mujahideen. The Afghan mujahideen went on to become the Taliban and al-Qaeda. Their Pakistani counterparts went on, in large part, to become IJI and then PML (Q).

While Taliban and al-Qaeda forces were operating in Afghanistan during the nineties, their Pakistani counterparts were busy undermining the PPP governments in Pakistan as the obstacle to their advancement. With the closet friends of al-Qaeda and Taliban in power under camouflage of beardless parliamentary leaders, the creeping Talibinisation of Pakistan began in earnest. The aim was to sideline the PPP while strengthening the militant extremists through a network of overtly religious seminaries. The purpose of the seminaries was to brainwash students and create a new class of

Pakistani Talibs-students into taking over Pakistan. They are a tinderbox waiting to create anarchy and chaos in the streets of Pakistan.

The danger is that such elements could gain an upper hand if elections in Pakistan are once again rigged to enable their friends to survive. The present ruling structure is held up by the PML (Q). Some of its members are moderate. However, a series of them are remnants of the Zia military dictatorship put together by the intelligence apparatus of the Zia era to confront and contain the PPP in the form of IJI or PML (Q).

Interestingly enough while the religious parties known as the MMA have distanced themselves from the Lal Masjid and the Jamia Hafsa, the cabinet has not done so. In fact, it is said that a truckload of arms was intercepted on the way to Lal Masjid and released on orders of a cabinet minister. Two policemen were kidnapped and the police could not file a criminal complaint against their extremist kidnappers due to the undue influence of the cabinet.

The cleric who heads the Lal Masjid is appointed by the cabinet. This government appointee has established so-called Shariat courts in Islamabad. The land on which the political religious schools were built under the present regime belongs to the Government of Pakistan and was illegally occupied by the Jamia Hafsa with cabinet compliance.

During the building of these madaris on illegally occupied government land, the regime claimed it would reform madaris and register students. Instead, they were being strengthened with funds given in the name of education permitting them to expand their outreach till they reached Islamabad the capital itself.

It is said that the Jamia Hafsa Masjid cannot be touched because the females studying there are daughters of military officials. This leads one to wonder why the fathers are permitting their daughters to set up vigilante squads. This is the tip of the iceberg. No one knows how many other political madaris have been established in Islamabad and elsewhere. The Lal Masjid cleric could call in his support more militant students from other Islamabad madaris. We could be housing an irregular army in the very confines of Islamabad who are lying low until they are ordered to rise up. The situation is potentially disastrous.

The government says it is not weak but kind and compassionate. In its compassion it does not want to take on the two madaris near the Lal Masjid. No such compassion was shown to the peaceful public gathered to receive PPP leader Asif Zardari at Lahore two years back in 2005, to the women in the Karachi by election polling

booths this February who were shot, beaten and injured so severely that they had to be hospitalised, to a lady United Nations rapporteur or the sister of a judge who were both shamefully treated when participating in a peaceful protest.

Vigilante groups have taken to the streets of Islamabad threatening barbers, beauticians and stores catering to the entertainment industry. I am proud of my religion of Islam as are most Muslims. However, we Muslims are opposed to the right of clerics to interpret Islam for us and to bring about compulsion in religion. Neither Muslims nor the world community can stand idly by while the leftovers of the Afghan Jihad of the eighties turn their guns on nations, religions and people.

While using the name of Islam the extremists are doing everything in their power to destroy Muslim societies one by one.

The wars in Afghanistan and Iraq are a consequence of their attack on the World Trade towers. It has led to the hurting the image of the great religion of Islam. It has led to death and destruction of so many innocent lives, including those of women and children whom God expressly forbids to kill even in times of war.

The suicide bombers think they are serving God. But their actions hurt, not help, Islam, Muslims and all God's creatures irrespective of their religion. Such violence perpetuated in the name of religion will corrode the pluralism, diversity and democracy in western countries which has seen Muslims emerge as a significant immigrant community. No one will be safe. Not Muslims in Muslim countries like Pakistan where vigilantes rise to positions of influence or Muslims in the expatriate community who will be viewed with suspicion and become victims of hate crimes. The extremists crow that they will bring down the international financial markets through acts of terror. But the collapse of the international financial markets will hit the whole world. If there is a collapse, everyone, including the Muslims will go down. That cannot be of benefit to Islam.

We are living in one global village. There are universal values which are common to all great religions. And to live together in harmony we need to respect that there is no compulsion in religion, which Islam specifically proclaims, and agree that God, not the state, will hold us to account on personal, religious issues.

Meantime, in Pakistan the state authority continues to decline where extremists are concerned. The cabinet is offering to build more sites for the followers of Lal Masjid and the Jamia Hafsa on the pretext that they can shift there from Islamabad. This is just a pretext to grab more government land and property for them as they will

keep both in the end.

Unless the militants are reined in, the tide of extremism will rise to high flood through a religious coup. Instead of the military seizing power at the point of a bayonet despite the objections of the people at large, it could be the religious militants seizing power at the point of a bayonet. Already the extremists have been permitted to infiltrate areas like the tribal areas, Malakand, Parachinar and Tank. In Dara Adam Khel private schools for girls closed and barbers promised that they would not shave beards. They lost their livelihood and people lost their right to freedom of choice because the regime capitulated before the extremists. The extremists probably have sleeper cells across the Punjab and in many parts of the rest of the federating units. Pakistan stands at the crossroads and with it so too does the larger world community. The danger signals are ringing loud and clear from Islamabad.

Can Indo-Pak Relations Be Reinvented India Today Conclave-New Delhi

It is a privilege for me to join you this evening at India Today's Conclave in New Delhi, to discuss the Challenges for the Brave New World.

I first came to India as a teenager visiting Simla with my father in 1972.

I still remember the warmth and affection with which the people of India greeted me although we were supposed to be the enemy.

Following the Simla Agreement signed between Prime Ministers Indira Gandhi and Zulfikar Ali Bhutto in 1972, I came away with the strong feeling that peace between India and Pakistan must endure.

It gives me great satisfaction that since the signing of the Simla Agreement thirty-five year ago, India and Pakistan, although engaged in conflict, did not go to full war against each other.

The enormity of this is better understood when we appreciate that between 1947 and 1971, a period of twenty-five years, India and Pakistan fought three wars.

As prime minister of Pakistan, I worked with Prime Minister Rajiv Gandhi to build on the spirit of Simla. Our governments signed the first major agreements since Simla, the agreements not to attack each other's nuclear installations in 1988 amongst others.

In 1988, at the SAARC leaders' summit at Islamabad, I proposed that we transform SAARC from a cultural organisation into an economic one. The South Asian Preferential Tariff Agreement was born as a consequence.

In 1999 at the Indo-Pak Parliamentarians Conference in Islamabad I proposed that India, Pakistan and all the countries of South Asia put aside their differences to create a common market to eliminate poverty, hunger, unemployment and backwardness through soft borders.

So, ladies and gentlemen, I believe that Indo-Pak relations can be creatively re-invented.

Time stands still for no one. The moving finger of history writes and having written, moves on.

We have a choice. The choice is ours to write a success story of free markets, liberty, human rights, gender equality, common values of tolerance and understanding.

The Pakistan People's Party and I, even in opposition, have tried to write a success story co-authored with all the intellectuals, political parties and leaders of both our countries who truly believe that the future welfare of humanity in our part of the world lies in cooperation.

I see the world in terms of competing economic blocs that can best function in an environment of peace and security. I see the world as one where the have-nots can conquer poverty if we come together in an economy of scale as Europe has done.

For these ideas, and for seeking peaceful relations with India, I was once called, a "security risk" by my critics.

But ideas cannot be killed by character assassination or by repression. In time, my political opponents as well as the military establishment of my country realised the importance of peace as a quality that makes or breaks a nation.

I am proud that today India and Pakistan are discussing ways and means to have open borders, trade and travel. We still have a long way to go, but the journey has begun. Of course, the danger is there of the derailment of the peace process. Both our countries nearly came to war in 1999 in the icy glaciers of Siachen.

Both our armies stood eyeball to eyeball in a deadly year long confrontation following a terrorist attack on the Indian Parliament in December 2001. The recent attack on the Samjhota Express this year once again demonstrated the fragility of a peace process which can be disrupted by a deadly act of violence.

We know now that there is a consensus amongst the political parties of India and Pakistan, a consensus between our military and security establishments that peace must be established. We also agree that the one serious danger to the peace process comes from militants and terrorists. Therefore, the challenge for us is to dismantle the militant cells so that they cannot hold the foreign policy of two independent nations hostage to their acts of terrorism.

In this connection, I welcome the decision by both India and Pakistan to work together on anti-terrorism efforts and to share information in this regard. This is a positive step forward.

I commend Prime Minister Manmohan Singh and the

Government of India for refusing to rise to the terrorist bait in blaming Islamabad when a militant strikes its target. The militants are the enemies of peaceful relations, peaceful relations that both our countries want and desire.

Both the governments of India and Pakistan are declaring their deep desire to resolve the Kashmir dispute, to build peaceful relations and to work for greater economic cooperation.

I welcome this effort to re-invent our relations.

Many well wishers advised me to oppose the present peace process between India and Pakistan for two reasons. First, they saw it lacking legitimacy as Pakistan is presently governed by a military regime which holds onto power by virtue of its army constituency.

Secondly, since Indo-Pak relations and the Kashmir dispute excite passions easily, it was felt that, opposing the peace process as a "sell out" would help mobilise public opinion against the military dictatorship and facilitate the restoration of democracy.

The restoration of democracy is a cause dear to my heart.

It is a cause for which my father and brothers laid down their lives as did hundreds of our party workers and others belonging to the democratic opposition.

It is a cause for which my husband cumulatively spent eleven years in prison without a conviction and for which my brothers, mother and I spent long years in exile. However, my party and I did not seek the easy route to create mass frenzy. We believe that the future happiness of the people of South Asia, a happiness flowing from a peaceful environment providing opportunities for our youth was too important to be lost in an internal political battle in Pakistan.

I do agree that there are issues of legitimacy involved when a non-representative government negotiates as the people are not co-opted. The tribal situation in Pakistan, where the Taliban have regrouped is an example. Despite 80,000 troops being sent into the area to clear the militants, a peace treaty was signed with them.

This proves the point that without political participation, it is very difficult to make lasting advances.

Today it is a matter of satisfaction for those of us who envisaged open borders, trade and travel between India and Pakistan, before it became fashionable to do so to witness the Pakistani military dictatorship sign on to the peace process and commit itself to resolving issues with India in a peaceful manner without prejudice to our differing views on Kashmir.

There are voices that claim that the present peace process with India is an eye-wash meant to cover the regime in election year to neutralise the Indian lobby.

They argue that after stage managing the elections schedule in Pakistan later this year, all it will take is one more militant attack to recreate the tensions that have marred Indo-Pak relations in the past. However, once again I do not believe that we should base our political policies on fear.

I believe the challenge for the future is to re-invent our policies so that we build them on hope.

For that hope to be formalised we will have to deal with the issue of both militancy and terrorism.

Militancy and terrorism are the roots of violence, senseless destruction and loss of lives.

We have to protect innocent people of our countries by each one of us working for the dismantlement of militant groups, the elimination of terrorism and the promotion of interfaith tolerance and harmony. These objectives are all the more important in this the 60th anniversary of the independence of both of our countries.

I wonder how many in this audience were present when the British set midnight of August 14th, 1947 as the hour for the clock to strike freedom.

It was an exciting moment in history when the people of India gained their separate nations. Yet it was also one of pain.

Innocent people were killed because they were either Muslims fleeing to Pakistan or Hindus fleeing to India.

And more blood was shed of our citizens who died in the many wars and acts of terror experienced since we both got our freedom from the British.

In this the 60th year of our independence, I propose that the leadership of India and Pakistan put an end to this destructive chapter in the lives of our countries. I propose that on the 60th anniversary of our nations this August they meet to declare their commitment to bring us the permanent tranquillity and progress and prosperity that two neighbouring countries must have.

Ladies and Gentlemen, I have made trade, not conflict with India, a top priority of my forthcoming electoral campaign in Pakistan. At 60 years we must pledge an end to war, terrorism and death.

Sixty years of freedom gives us the maturity to change our direction dramatically.

I am committed to bringing peace between our two countries. My commitment to peace began when I was a young child. I lived through the bombings of the 1965 war between our countries.

I heard the stories of the dead and of the homes destroyed, of the terrible destruction of infrastructure putting both our developing

countries further back in their quest to modernise.

I saw my mother rushing to help the soldiers and their families, help the wounded and the injured.

As a student at Harvard University in America, I joined up with fellow students to protest the Vietnam War, a war that they felt was unjust and did not want to fight. Since then I have seen many more conflicts on television in the Middle East, in Afghanistan, between Iran and Iraq and in Iraq. The more I see of the devastation of war, of how the vultures descend to feed on the bodies of dead children, the more I am convinced that we must keep our region secure and peaceful. We cannot fail our children.

India and China both have a dispute but they do not go to war against each other.

We must learn from this model to develop our own relations. As an undergraduate at Harvard University, I met your late Prime Minister Indira Gandhi. I witnessed the first peace agreement signed by our two countries. In the words of the famous American Secretary of State Dean Acheson, I was "Present at the Creation" of the peace movement between our two countries.

I am proud of the fact that during my two tenures in office, neither of our peoples or armies had to face a Kargil like situation.

I am proud of the fact that during both of my two tenures in office, there were no terrorist attacks on Indian targets such as the Bombay blasts or the Indian Parliament blast. It is not easy to keep the peace but my government did so and reined in the militants too.

On a separate note, we brought peace to Karachi taking on the militants there and we brought peace to our tribal areas taking on the militias of the narco barons in those mountains. My government had the capacity to build nuclear weapons but we chose to remain a nuclear capable state instead of turning ourselves into a nuclear weaponised state. We had the confidence in our people and in our ability to defend ourselves without involving ourselves in adventures which could only turn the clock back on the pursuit of progress for all the people of South Asia who are shackled with backwardness and poverty.

One of the ways that I tried to re-invent the relationship between Pakistan and India was to involve military and intelligence personnel in the process. In this connection, we established intelligence to intelligence contact with a view to help formal diplomacy. Additionally we proposed the induction of retired military officials in the track two discussions.

With terrorism now a global issue, cooperation between India and Pakistan to work on eliminating terrorism from the region offers an

important opportunity to re-invent the relationship. Therefore, it is a welcome development that following the summit meeting in Cuba last year in September both Islamabad and Delhi have agreed on an exchange of terror-related intelligence through quarterly meetings. I know that the hotline established by Prime Minister Rajiv Gandhi and myself between the military headquarters of our two countries has played no small part in preventing escalation of tensions in the relations between the two countries. Ladies and Gentlemen, we live in societies where there are islands of opulence amongst oceans of misery.

It is wrong, morally wrong that the gap between the rich and the poor should be so huge that some people do not have food to eat or a job to give them dignity. I find it so difficult to understand how in the third millennium so many should die because they do not have drinking water or the water they have is contaminated.

We should band together to fight hunger and disease. We should band together to fight discrimination and bigotry against minorities. We should band together in a political and economic condominium that could be a model to the entire world of the what the future hold. These are the real issues that confront our masses.

There is much that the countries of South Asia can learn from each other.

All the countries of South Asia, except Burma and Pakistan, have civilian control over the military and therefore over the conduct of their nations in foreign policy. As the Cuban Missile Crisis of 1962 proved in America, civilian control of the military is essential to the safety and development of a country. Bringing peace between our two countries will help make that happen.

The Cuban Missile Crisis showed that if the American military had had its way, the Americans would have made war against the Soviets. American President John F. Kennedy prevented a war that could have killed 100 million Americans.

Former Prime Minister Nawaz Sharif and I have signed a Charter of Democracy committed to a framework of peace and justice for the people of Pakistan. The Charter of Democracy commits both our parties to friendship and peace with India.

Last year American President George W. Bush said in his annual State of the Union address:

"Dictatorships shelter terrorists and feed resentment and radicalism, and seek weapons of mass destruction. Democracies replace resentment with hope, respect the rights of their citizens and their neighbours, and join the fight against terror."

I agree with President Bush on the nature of dictatorships. I have

dedicated my life working for the restoration of democracy in Pakistan.

In the last election of October 2002, I was not allowed to fight that contest. Yet despite international observers calling the elections "flawed", the Pakistan People's Party (PPP) which I head, was still the largest vote getter at nearly 26 % of the vote almost similar to that of the Congress Party in the elections of 2004. Unfortunately, the parliamentary session was indefinitely postponed to fracture my support. If not I would have formed a government like Mrs. Sonia Gandhi did after the 2004 election.

I am fully on the side of the people. My late and beloved father, Zulfikar Ali Bhutto, named our party – the Pakistan People's Party. We have a long history of fighting for the people of Pakistan.

I have fought dictators and oligarchs before. I will fight them again in the election campaign of 2007, and I intend to win.

Some have asked why I am returning to Pakistan.

The answer is very simple. Pakistan is my home. And I have long ago accepted my responsibilities of leadership. I didn't choose this life. It chose me.

I have been honored by the people of Pakistan to be twice elected their prime minister. During the time of my service in that role, the religious parties never had more than 3% representation in our National Assembly.

A democratic Pakistan standing next to a democratic India and a democratic Afghanistan can start to turn around our part of the world.

On the issue of Kashmir, we must make a viable peace. This is a solvable problem that must not take further lives.

Pending a final settlement, I agree with the statement of your prime minister supporting an autonomous Kashmir running much of its own affairs. A commission can be established between the two countries and the leaders of Kashmir themselves to work out what should be done in foreign and defence affairs.

While working out the solution to Kashmir we should not allow slow progress on it to be an obstacle to work in other cooperative matters.

There are several ways to re-invent our relations. These include through economic integration and trade, business cooperation, media exchanges, transportation links between our two countries, the energy requirements of our economies, sports and entertainment events, cooperation in the Information Technologies, the peaceful uses of nuclear energy, in medicine, education and agriculture.

Let us remember:

1. Economic integration and trade brought Europe the peace and prosperity it has enjoyed since World War II concluded. The Europeans started the European Coal and Steel Community. Jean Monnet, a French economist and Robert Shuman, the French foreign minister, saw this vital industry as critical to those wishing to wage war.

   They brought the major European countries together to control steel and coal thereby stopping the war making capacity of the individual European nations, especially of France and Germany.

   It was the first step that the Europeans took to blunt the instruments of war making within their continent.

   There is no reason we in this subcontinent cannot do the same.

   A dear friend who helped bring China and the United States together told me that the total two-way trade between the US and China before 1972 was just $25 million. Indirect trade mostly through Hong Kong.

   Now in 2007 US-China direct trade is over $200 billion. That trade and other factors have made China the huge economic engine it has now become.

   That is the kind of future that awaits our people if we can re-invent our relations.

2. Regarding transportation links: a start has been made with the bus journey between Srinagar and Muzzafarabad and the train between New Delhi and Lahore. We must increase those links, eliminate visa restrictions and remember that when we can travel between France and Germany – two old enemies – the train or bus does not stop any more for police and customs checks.

3. Energy resources are vital to our economies. The closest readily accessible energy source of hydrocarbons is in Central Asia. My government implemented my father's proposal to build Gwadar Port in Balochistan, Pakistan's largest province, to bring Central Asian gas and oil to world markets through Pakistan. My government agreed to building pipelines for oil and gas to be pumped across Pakistan to India.

   I intend to make these plans a top priority of my country to bring these gas and oil pipelines from Central Asia to the people of Balochistan in Pakistan and to export them to India. It is vital to our economies and our industry.

   The political instability of Afghanistan hampers trade with Central Asia. Therefore, controlling terrorism in the tribal areas

of Pakistan is a priority for my people and for the government we hope they will elect us to make. A peaceful and democratic India, Pakistan and Afghanistan can bring enormous benefits in this programme of bringing new energy resources to all of our economies.

In addition, Pakistan has one of the richest shale deposits in the world. A new low-cost technology now is available to get useable energy from the shale and the residue in water.

We will share both the technology and the product with you.

4. We have all seen the excitement of our peoples when one sport team visits each other's countries. These exchanges must happen frequently without governmental interference. Let the fans from Lahore come and cheer their teams playing in Bombay or Calcutta or vice versa.

   The prime minister of Pakistan-controlled Kashmir Sardar Attique has welcomed investment from all regions and religions of the world, including from Indian-controlled Kashmir. He has offered gas and electricity across the Line of Control. Discussing such proposals can help bring us closer.

   The devastating earthquake in 2005 demostrated that disaster recognises no geographical borders. People on both sides of the Line of Control in Kashmir were killed, injured and lost their homes and loved ones. It was a terrible tragedy and awoke in our minds the need for us to work together even on issues such as disaster control.

   The entertainment industry is huge in India and growing in Pakistan. There must be no boundaries between our countries in this area too.

5. Both of our countries exploded nuclear devices in May 1998. We have now proved to each other and the world that we are firmly in the group of elite countries that have nuclear weapons. We do not have to prove our military prowess anymore.

   We do need to continue investing in an area that brings little economic return to our peoples and countries.

   Let us turn our investment and cooperation towards the peaceful uses of nuclear energy. The people of France get 80 per cent of their power generation of electricity from nuclear methods.

   I have just mentioned a very few of the areas in which we can cooperate. Many more exist.

   Across from the United Nations Headquarters in New York City there is a small peace park with an inscription that says:

"They shall beat their swords into plowshares, and their spears into pruning hooks: a nation shall not lift up sword against another nation, neither shall they learn war anymore."

Or, as Mahatma Gandhi said, "An eye for an eye only makes the whole world blind".

Let us serve the people we all love by bringing peace to these lands we all love!

Thank you for the honour of speaking before you.

[March 24, 2007]

Dictatorship Unable to Enforce Government Writ Ms. Bhutto Speaks on Wide-Ranging Issues with German Daily

Former prime minister and Chairperson Pakistan People's Party, Ms. Benazir Bhutto has reiterated her resolve to return to the country and lead the people to regain their lost political, economic and social rights.

In a wide-ranging interview with the German daily "Junge Welt", the former prime minister dealt with issues ranging from Taliban to tribal areas to Charter of Democracy and to her plans to return to the country.

She said that it must be recognised that the Taliban they went to war with the world under a military dictatorship in Pakistan in 2001. Until the military dictatorship in Pakistan ends, the environment that nourishes the Taliban and their sympathisers will continue to grow in strength, she said.

She said that the tribal areas of Pakistan need to be brought under the framework of a system of laws and representation that can empower the people and allow them to be independent of the Afghan-Arab fighters that today dominate their society.

She asked Islamabad to work closely with Kabul to stop the infiltration of Taliban across the border in Afghanistan. A resurrection of their regime in Kabul will covertly bring back al-Qaeda and the world will be back to square one, she said.

Ms. Bhutto said that Islamabad also needed to reform its security apparatus and end the duality of control that presently exists and bring them under the control of the parliament and the prime minister.

She said that recently Pakistan's foreign minister said in Kabul that he was not denying that people were coming from across the

border but that it was happening despite the government of Pakistan. This statement proves that a military dictatorship is unable to enforce the writ of government across the land. On the other hand, a political government was able to enforce the writ of government in the tribal areas in the end eighties when the narcotics lords ran mafias similar to the Taliban with rocket launchers and private militias, the former prime minister said.

About the ISI's alleged help to Taliban she said that when she took over as prime minister in 1988 she found that many of the intelligence officers who had fought the Afghan Jehad had sympathy for the Afghan mujahideen who went on to morph into Taliban and al-Qaeda. Despite government's declarations the elements that are behind the terrorists have succeeded in presiding over the revival of the Taliban in the tribal areas of Pakistan, she said.

She said that she was worried about the rampant growth in the intelligence community and key positions in the civilian spy agency known as IB are filled with former officials of the ISI who fought the Afghan Jehad.

About the Charter of Democracy she said that it was a pledge to the people that we would support a reformist legislative agenda that could strengthen civilian institutions. It laid a bipartisan vision of the future of Pakistan that supports building of institutions including parliament, judiciary, the Election Commission and grant provincial autonomy. The defence budget will be made accountable and the armed forces will come under the prime minister who is the chief executive, she said.

She said that the ban on a twice elected prime minister was arbitrary aimed at keeping her and Nawaz Sharif out and that the PPP wanted it lifted before the next General Elections. But even if that did not happen she would return and lead the party and the people of Pakistan to regain their lost political, economic and social rights.

She said that the real concern is whether the General Elections will be fair. The PPP has proposed a package of electoral reforms critical to the holding of fair elections, she said. Following is the text of her interview.

Q.1: Five years after their defeat the Taliban have reorganised themselves and are back on their way to power in Afghanistan. What steps need to be taken by Pakistan and the international community in order to prevent this development?

Ans: The first thing the international community needs to do is to

recognise that the Taliban went to war with the world under a military dictatorship in Pakistan in 2001. Until the military dictatorship in Pakistan ends, the environment that nourishes the Taliban and their sympathisers will continue to grow in strength. Second, the tribal areas of Pakistan need to be brought under the framework of a system of laws and representation that can empower the people and allow them to be independent of the Afghan-Arab fighters that today dominate their society. Third, Islamabad needs to work closely with its neighbour in Kabul to stop the infiltration of Taliban across the border in Afghanistan where they are seeking to resurrect their regime. Once they do that they will covertly, if not overtly, bring back al-Qaeda and the world will be back to square one. Fourth, Islamabad needs to reform its security apparatus and end the duality of control that presently exists and bring them under the control of the parliament and the prime minister.

I may point out that last week Pakistan's foreign minister said, "I am not denying that people are coming from across the border but this is happening despite Pakistan." This statement proves that a military dictatorship is unable to enforce the writ of government across the land. On the other hand, a political government was able to enforce the writ of government in the tribal areas in the end eighties when the narcotics lords ran mafias similar to the Taliban with rocket launchers and private militias.

Q.2: When you were prime minister your government initially supported the Taliban. In fact, you were called Mother of the Taliban. What was the reason for this support? And what is your stance today?

Ans: The Taliban were initially seen by my government and others in the West as a factor for peace. But this does not mean that we welcomed them because we subscribed to their world view. They were involved in broad-based negotiations with the United Nations. However, with the overthrow of my government in 1996, the Taliban transformed themselves from an Afghan movement into a transnational one inviting in al-Qaeda and allowing them to declare war against the West. I believe that the Taliban at present are being used and backed by forces sympathetic to al-Qaeda. They pose a threat to the Afghan government, to Pakistan and to the larger world community. We need to work together to stop their subversion of the Afghan people transition to a democratic order where there is development for the Afghan people.

Q.3: It is often described that Pakistan's intelligence service, ISI, since long indirectly helped the Taliban and al-Qaeda. At the same time Gen. Musharraf advertises himself as the key ally in the so-called war on terror of the West. How does this fit together?

Ans: When I took over as prime minister in 1988 I found that many of the intelligence officers who had fought the Afghan Jehad against the Soviet Union had sympathy for the Afghan mujahideen who went on to morph into Taliban and al-Qaeda. What worries me now is the rampant growth in the intelligence community. When I took over as prime minister for the first time, the ISI was headed by a Major General. However, now it has seven major generals in it. Moreover, the other military agency, the MI has also been expanded. In my father's time it was led by a colonel. Today it is led by a major general. More disturbingly, key positions in the civilian spy agency known as IB are filled with former officials of the ISI who fought the Afghan Jehad. The key to Pakistan's well-being and stability is to ensure the intelligence apparatus works according to the demands of a modern and democratic state. General Musharaf has said that he is a key ally in the war against terrorism. However, reports indicate that despite these declarations, the elements that are behind the terrorists have succeeded in presiding over the revival of the Taliban in the tribal areas of Pakistan.

As prime minister of Pakistan, and not having the constitutional powers over the military, I was fortunate to have a team that enabled me to extend the writ of government over the state including in the tribal areas. No major international act of terrorism took place when I was prime minister. Both the attacks on the World Trade Towers and others took place when my party was out of power.

Q.4: Despite the promises made by Gen. Musharraf to Bush and Blair after 9/11, there has been no reform of the madaris and no serious attempt at all to deal with extremists in Pakistan. While NATO troops and Afghans continue to die, the Taliban find a safe sanctuary in Pakistan. How long can this bluff go on? Will militant Islam get the upper hand in this region?

Ans: The international community has pumped in money for educational reform. Most of this money has been diverted to the madaris. However, there is little check on exactly how the madaris have used this huge amount of money, which could have gone instead to upgrade the public sector universities and

educational institutes. The madaris have refused to register foreign students and the regime has given in before them.

Q.5: Recently you joint forces with your former political rival Nawaz Sharif. What are your intentions for this new alliance?

Ans: Mr. Nawaz Sharif and I, as former prime ministers, wanted to make a pledge to the people that we would support a reformist legislative agenda that could strengthen civilian institutions. We hope through this legislative agenda to create a pluralistic democratic and accountable society governed by institutions and not by the whims of an individual. Our legislative agenda is known as the Charter of Democracy and it lays out a bi-partisan vision of the future of Pakistan.

The political parties which are signatories to the Charter will support the building of institutions including parliament, judiciary, the Election Commission and grant provincial autonomy to bring government to the people who are the true owners of Pakistan and should benefit from its system of governance. The armed forces budget will be made accountable and the armed forces will come under the prime minister who is the chief executive. This is our joint intention in the ARD.

Q.6: Given the term limits could be lifted and you would be re-elected as prime minister. What would you do first? And what are your long-term political plans for Pakistan's future?

Ans: My party and I would like to see the lifting of the ban on a twice elected prime minister take place before the next General Elections. The term limit came through an arbitrary amendment brought in to keep out Mr. Sharif and myself who together enjoy the overwhelming support of the people of Pakistan. However, if that does not happen, I intend to return and lead my party and the people of Pakistan to regain their lost political, economic and social rights. Pakistan faces challenges of poverty, lack of roads, drinking water, jobs and sky high inflation in addition to the challenges of terrorism and tensions with its neighbours. The parliament can then decide about the two-term limit. In the meantime, the real concern is whether the General Elections will be fair. My party has proposed a package of electoral reforms which we believe are critical to the holding of fair elections.

[Islamabad, 20 December 2006]

'I WORRY FOR PAKISTAN'S FUTURE'

Newsweek

Q&A: BENAZIR BHUTTO ON PAKISTAN'S FUTURE

After a decade in exile, former Prime Minister Benazir Bhutto is itching to get back into politics – and fearful of militant Islam's growing influence.

Web Exclusive

By Karen Fragala Smith – Newsweek

Updated: 6:19 p.m. ET Nov. 15, 2006

Age has scarcely mellowed Benazir Bhutto. At 53, Pakistan's two-time former prime minister has lost none of the fighting spirit that made her the first woman to be elected leader of a modern Muslim nation nearly two decades ago, when she was only 35. Recently, she publicly joined forces with her former political nemesis (and now fellow exile) Nawaz Sharif, renouncing their past feuds and demanding restoration of democracy in Pakistan. Their pact was yet another headache for the country's military leader, Gen. Pervez Musharraf, who already faces a full share of problems in both embattled Kashmir and on the Afghan border, where Osama bin Laden and other al-Qaeda leaders are believed to be hiding. Bhutto recently travelled to New York to lecture at the Oxonian Society and announce her hope of running for prime minister in 2007. She spoke with Newsweek's Karen Fragala Smith about her views on the Taliban, women's rights and the corruption allegations that plagued her political career. Excerpts:

Newsweek: Why hasn't Osama bin Laden been found?

Benazir Bhutto: I believe that elements of the [Pakistani] military security apparatus have a lot of sympathy for bin Laden. General Musharraf is relying on the [military] to find bin Laden, and it's simply not going to happen. What we really need is a change, and I believe that

change has to come by going to the civilian option.

Q. How would you rate General Musharraf's performance as a partner to the United States in the Bush administration's fight against terror?

Ans: I think General Musharraf took the right decision following the events of 9/11 to stand with the international community to fight terrorism. But I question how effective he has been in eliminating terrorism. There is a lack of implementation of his decisions in many parts of the country, and we have seen in [recent] years how the Taliban have reorganised themselves, and their goal is to take over Afghanistan once again. The religious parties have gained strength within Pakistan and today control of two of our most important provinces that border Afghanistan. Militant groups that were [once] banned – who were attacking New Delhi, Bombay – are re-emerging and hold peace between India and Pakistan hostage. When I look at the rise of the religious parties, the reorganisation of the Taliban and the persistence of the militant groups, I worry for Pakistan's future.

Q. Is it true that you initially supported the Taliban when they first formed in Afghanistan?

Ans: When the Taliban first emerged, the United States, Pakistan and many other countries saw them as a force for peace, but soon we became disillusioned. There's a difference between Taliban with al-Qaeda and Taliban without al-Qaeda. When the first Taliban emerged, there was no al-Qaeda. They were there as Afghans trying to be a political force within Afghanistan. After the overthrow of my government in 1996, they allowed al-Qaeda to set up training camps. At that time, I was leader of the opposition in the Pakistani parliament, and I called upon the government to issue an ultimatum to the Taliban that unless they evicted al-Qaeda, Pakistan would break relations with them. Unfortunately, my calls fell on deaf ears.

Q. Describe your new alliance with former political rival Nawaz Sharif. What are your intentions going forward?

Ans: I travelled to Saudi Arabia last year to meet with Mr. Sharif. I told him that [people] inside and outside Pakistan are concerned that both of us spend so much time fighting each other [and] that if democracy was restored, we might have another round of senseless political battles. We needed to send a signal that we've learned our lessons and that next time it

will be different. We came up with a "Charter of Democracy" [which is] aimed at creating a political system of checks and balances. In Pakistan, politics is a zero-sum game, but we believe that there should be a place within the system for divergent political views. A democratic society will also create tolerance among the young people in Pakistan who are confused by conflicting messages. On the one hand, they hear about the beauty of an accountable, transparent governance system that empowers ordinary people. But the reality is that power flows from the gun. We need to reverse the culture of violence and replace it with a culture of law and tolerance.

Q. Pakistan currently has term limits that would keep you from returning to office as prime minister. Would you consider running in some other capacity?

Ans: In the immediate future, my party and the alliance with Mr. Sharif are both looking to put an end to the term limits. We feel that it should be left to the people of Pakistan. It's not like America, where a president is elected and he completes [one or] two terms. Our terms are interrupted, so they don't really qualify in the American sense of two terms. I am planning to go back to Pakistan to help my party in the next general elections. If that limitation is lifted, I'll run for prime minister.

Q. Your administration was plagued by corruption charges.

Ans: The allegations have been made to destroy my reputation. Despite the rules being stacked against me, none of the courts were able to convict me. I have always proclaimed my innocence, my husband has proclaimed his, and neither of us have been convicted, nor has any other member of my family. These corruption charges have been made to tarnish my image and deny Pakistan a democratic alternative. Since 1950, corruption charges have been made against every civilian prime minister – I believe it's to divert attention from the institutionalised corruption of the military.

Q. What is your view on India-Pakistan relations?

Ans: Irrespective of the differences on Kashmir, India and Pakistan have to move forward. One of the key ways that we can move forward is by copying Europe's example. Europe was torn apart by war until it decided to build a common market. I've spoken to Indian leaders on this, and within Pakistan and India there's an emerging consensus that while we have differences, these differences should not stop us from economic development and cooperation in terms of trade and travel. But obviously we need safe borders. While militants

hold guns in their hands and disturb the peace, it's very difficult to get safe and open borders. Attacking militancy is very important, not only vis-à-vis Afghanistan, but also vis-à-vis India.

Q. What do you think of the current state of women's rights in Pakistan?

Ans: There's a very big debate on the role of women in the Muslim world. Some claim that women must be kept behind closed doors, but I argue that Islam came to emancipate women, not to repress them. The time has come when we within the Muslim world need to realise that each of us has a right to interpret religion as we wish, and we do not need clerics or the state to tell us how to worship.

Q. There are certain religious leaders who say it's against Islam for a woman to rule. What is your perspective?

Ans: When I was first elected prime minister of Pakistan, a leading Saudi cleric said that it was un-Islamic. At the same time, the religious leaders from Yemen, Cairo and Syria all came out in support of a woman leading an Islamic nation. [There is] tremendous debate and discussion between those who would take us to the past, and those who look to the future.

[Nov. 15, 2006]

INTERVIEW OF MS. BENAZIR BHUTTO TO HINDUSTAN TIMES

Q. Since the agreement between you and Nawaz Sharif, have any further developments taken place for the re-emergence of real party system and removal of a military-run administration?

Ans: The Charter of Democracy was agreed on May 14, 2006. Thereafter Mr. Sharif and I met several times in Dubai and London to reaffirm our vision of Pakistan's future as a federal, democratic and egalitarian state at peace with itself and its neighbours. On July 2, the opposition alliance known as ARD met and adopted a number of wide-ranging resolutions. The resolutions aim at building pressure for a government of national consensus to hold the next general elections. The Charter goes beyond elections to the pluralistic and accountable society that we dream of creating a moderate, enlightened and flourishing society is implemented. We affirmed that Mr. Sharif and I shall return to Pakistan before the general elections and warned that any attempt to stop our home coming will be a denial of the constitutional right of impartial and free elections.

We reaffirmed that terrorism and extremism are a by-product of military regimes and can be fought best by a democratically elected government.

We resolved that the military dictatorship has brought the Federation of Pakistan to the precipice when all but one road leads to strife, chaos and the threat of disintegration. The Federation today is at war with its people and itself. The regime today uses brute and naked state force in a war against its own people who demand their constitutional, economic, political and cultural rights.

Parliament's sovereignty is vetoed by the National Security Council. Parliament is denied the right to freely formulate

policy or to protect the rights of the federating units or intercede in the grave political crisis facing the Federation. Parliament has been reduced to a rubber stamp for the chief of army staff who unconstitutionally occupies the office of the president.

We have called upon all moderate and democratic political forces, irrespective of their party positions, to unite on calling for the restoration of democracy, the formation of a government of national consensus to hold free, fair and honest elections within 90 days.

We decided to consider reisgning from the assemblies, in consultation with other opposition parties, should General Musharraf seek to elect himself through the present assemblies.

Q. We had heard that another meeting with Nawaz Sharif was scheduled in Dubai. Have you two kept in contact in the pursuit of joint objectives outlined in the agreement?

Ans: We have met several times since the Charter was signed in May. However, in the meantime senior leadership of the two parties are in regular contact for fine-tuning the political struggle and for consultations with other democratic parties to endorse the Charter of Democracy.

Q. Are there any plans for both of you together or you alone for returning to Pakistan?

Ans: As the two parties are together partners in the ARD it makes sense that both Nawaz Sharif and I return to the country together. But it is premature to decide such matters at this stage.

Q. Is the US ambassador's statement that both of you must be allowed back in Pakistan, an indication of the official thinking in Washington. Do you feel that Musharraf could be swayed to relent, albeit under pressure to permit entry?

Ans: If the US ambassador was correctly quoted in the media that the exiled prime ministers be freely allowed back in Pakistan, it is a positive and welcome statement. The US is the world's strongest democracy. President Bush has spoken of supporting democracy in different parts of the world. Those close to General Musharraf claim that he is a close ally of the international community and the principle of democracy will not be applied to Pakistan. Therefore, the statement of the ambassador, if correctly quoted, is important reflecting the democratic aspirations of the people of Pakistan. Pakistan needs to go forward regionally in relations with India and

Afghanistan as well as in dealing with those forces who are out to Talibinise Pakistan. It needs to eliminate terrorism for its own survival and to protect its people from zealots who kill innocents in mosques and churches and temples. It needs to give social and economic equality to its people. The last thing it needs is more of the last five years which have seen an army chief rules the country singlehandedly and one who has faced two assassination attempts. Moreover, poverty has risen in Pakistan and the international ratings for the country have gone down. People of Pakistan are hardworking, lawful and keen to join the march of civilisation towards freedom, justice, gender equality, peace and prosperity. They can do so through democracy.

Q. If you do return could Musharraf detain either or both of you? This will defeat the very purpose of your going back. What is then the alternative? Is it possible that Washington could persuade Musharraf from such an action? Or you would risk it. There are cases pending against you. He might use them as the reason for detention. Or that could prove the last straw for the people?

Ans: When Musharraf has pardoned the nuclear scientist A. Q. Khan who sold nuclear technology on the international market according to his confession, Musharraf has no moral right to persecute me on unproven allegations that are a decade old. I plan going back irrespective of what Musharraf does. When I was banned from contesting the last elections I did not go back for several reasons. Those elections were too close to 9/11 and Musharraf kept claiming he would not stop my party from forming the government if we won a majority. Well, we did win a majority but Musharraf postponed the parliament and factionalised my party. My party knows I made the sacrifice for it. This time my party wants me back with one voice and I shall be there for them and for our people who have stood by me just as I have stood by them. As I have suffered, I can understand the suffering of my people. They live on less than two dollars a day and young people find it difficult to get jobs. That's wrong. Our hospitals and schools are crying out for funding. My party and I will invest in our people and in peace.

Q. Is there any understanding on how to decide about who will be the PM, if the party system is restored and elections held?

Ans: It is premature to talk about it at this stage. Our first concern is to end bonapartism and the military's involvement in politics. In the Charter we have agreed to recognise the right of a political party to form government and not chased out of office

before completing its term.

Q. Has Musharraf or his people made any tentative move to establish contact with you for a formula to resolve the deadlock?

Ans: We read in the press that Musharraf and his aides are to contact me for a political solution and then we read that Musharraf has changed his mind. I personally doubt that Musharraf or those that are around him would want an understanding with the PPP led by me. What he says is similar to the PPP platform but on the ground the situation is different. Pakistan is a critical country and the stakes are high for those around Musharraf who allowed Osama bin Laden to escape from Tora Bora, allowed the Taliban to regroup and re-assert themselves as well as forced A. Q. Khan to fall on his sword to save others. It seems a contradiction in terms to think such elements would allow the PPP back to power if they can help it. Don't forget that PPP was overthrown twice to set the stage for the war against terrorism. After its first overthrow, Pakistan was on the brink of being declared a terrorist state in 1993. After the PPP's second overthrow the attacks of 9/11 took place. If the PPP had been in power, al-Qaeda would never have established camps in Afghanistan, the attacks on the Trade Towers would not have taken place, the wars in Iraq and Afghanistan would not have occurred and Muslims everywhere would not be under siege because extremists exploit the message of Islam. The policies of the PPP were aimed at bringing peace, harmony and brotherhood. Those who want a clash of civilisations cannot accept the PPP. They fear my popularity with the people whom my father served and gave his life for and whom I served losing my father, brothers, was imprisoned with my mother, saw my husband held for eleven and a half years without a conviction and endured exile bringing up little children and looking after an ailing mother.

Q. Do you apprehend that if Musharraf comes under extreme pressure to give way to you, he might venture into some sort of small-scale skirmish with India?

Ans: It is said that external threats help divert attention from the internal problems and that whenever Pakistan has had a military dictatorship there has been a skirmish or a conflict. I hope better sense prevails this time. Even though Musharraf and I are on different sides of the political spectrum in Pakistan, I am glad to see that he has adopted – at least overtly – the PPP policy enunciated at Simla for good relations

between India and Pakistan. Of course, I remain skeptical of the ability of a military dictatorship to build peace due to inherent historical reasons.

[July 19, 2006]

HOPING AGAINST HOPE

Interview of Ms. Benazir Bhutto

Ashraf Mumtaz

'The Charter of Democracy is a prescription for saving Pakistan from disintegration and degenerating towards being a failed state. Every patriotic person in the country, whether in the military or anywhere else, will support the charter to protect the unity, integrity and well-being of Pakistan,' says PPP chief Benazir Bhutto.

The meeting of the Alliance for the Restoration of Democracy on July 2, 2006 in London is considered more important than the earlier meetings of the coalition. It was in the city of London that all its components signed the Charter of Democracy (CoD). The decision to move a no-trust motion against the Musharraf regime was also taken at the July 2 meeting. To what extent this decision would help the coalition achieve its targets set in the 36-point CoD remains to be seen.

Apparently, despite this decision, the PPP has not changed its stance regarding whether Gen. Musharraf should be allowed to contest presidential elections if he takes off his military uniform and holds free and fair polls. Other parties in the coalition have a different point of view. They say that Gen. Musharraf is not acceptable to them with or without military uniform.

Even after the July 2 meeting, the PPP is not willing to commit whether it will take part in the elections if Gen. Musharraf is still there on the political horizon.

To discuss these issues, recently Dawn Magazine caught up with, PPP chairperson and self-exiled former prime minister of Pakistan, Benazir Bhutto. The following are excerpts from the interview:

Q. A few days before the ARD's July 2 meeting in London, a statement attributed to you was issued. It said that if Gen. Musharraf wants to contest presidential elections, he should

first step down as the COAS and hold free and fair elections. Is it not against the declared policy of your party? Previously, the your party's stand was that Gen. Musharraf is not eligible to contest the elections unless he retires as a general and then waits for two years like any other government servant to take part in politics.

Ans. The army chief cannot contest presidential elections because the Constitution doesn't allow it. Moreover, the armed forces are a national institution and must be above the political fray. General Musharraf's campaigning for the ruling party is undermining the neutrality and universal appeal of the armed forces.

Q. In one of your previous interviews, you opposed agitation saying that it may pave the way for another general to step in and intervene in politics. You also talked of a smooth and controlled transition to democracy. But the ARD meeting called upon all democratic forces to get united in order to form a national consensus government and hold elections within 90 days. Is the ARD decision not in conflict with your views? Which, in your opinion, is the better course for the restoration of democracy?

Ans. The PPP prefers a smooth transition to democracy and believes that pressure should be mounted for a government of national consensus to replace the ruling party which rigged the last local elections. The national government should implement electoral reforms as charted out in the PPP election paper released in March 2006. This paper, amongst other measures, brings the chief secretaries and the inspector-general police under the election commission, thereby preventing provincial and federal administrations from politically exploiting them for election purposes. However, if a national government is not formed nor electoral reforms are undertaken, political parties may be forced into forming a grand alliance.

Q. Will it be right to expect that in future the PPP will not issue any statement contradicting the decisions taken from the ARD's platform?

Ans. The PPP is a member of the ARD and its views, as well as those of other component parties, are the views of the ARD. The ARD is a political alliance formed to achieve a certain well-defined objective, namely the restoration of democracy through holding free and fair elections under an independent election commission and a caretaker set-up of national consensus. The alliance has also recently bound itself to a charter that seeks to banish the role of the military in politics.

As far as the issues before the alliance are concerned, all statements are issued by the alliance and not by any single party.

Q. Will any move to impeach Gen. Musharraf not according him an implied recognition as president because only the head of state can be impeached, not a general? What reaction do you expect from the general in case such a move fails? It is likely to fail because the opposition doesn't have the required strength in parliament.

Ans. The decision taken at the ARD meeting is of a no-confidence vote against the Musharraf regime. A committee has been established to examine the matter further with a view to highlighting loot and plunder committed by the regime following the Supreme Court's verdict in the Steel Mills case. The verdict clearly spoke of illegalities and of a loss of billions of rupees.

Q. When a no-confidence motion was moved against you in 1989, which was defeated by seven votes, you said that such a move 'shakes the country' even if it is defeated. Why will it not shake the country now?

Ans. We will move the no-confidence vote if the regime fails to resign. It is to morally protest the loot and plunder taking place in the country and billions of rupees are being wasted on the so-called National Accountability Bureau. If the opposition were to dig open the privatisation done by the junta, every case will smell foul including the KESC's privatisation to a company that did not have 10-year experience running a utility which is the international benchmark for such privatisations.

As a consequence, the country is experiencing power cuts. The capital market has crashed five times during the Musharraf dictatorship. Chairman SECP Tariq Hassan was stopped from hiring financial forensic experts to track the money back to those who robbed millions of middle class investors. The former prime minister, Jamali also spoke of this fraud and manipulation. The allegations of fraud involving purchase of railway engines remain uninvestigated. The cement scandal, the sugar scandal, the wheat scandal, and the Lahore land scandal are aimed at robbing the people and keeping wealth in a few hands that can be used to destabilise democratic governments in future by creating monopolies with the ability to force shortages of essential items.

General Musharraf says that he would declare his assets annually, but has failed to do so. Those who are close to him

haven't done so either. The Sindh High Court in its judgment of May 2006 in the tractor gate scandal said, "The entire proceedings suffer from a lack of transparency, smack of subjective decision, arbitrariness and excess of jurisdiction as well as favouritism." The Sindh High Court further ruled that "existing notifications are not to be acted upon." These are proofs of financial wrongdoing and abuse of office.

Despite the courts ruling on prima facie corruption, no action has been taken and instead billions are wasted on the so-called National Accountability Bureau whose sole purpose is to keep one man in office by entangling democratic alternative in a series of investigations through trumped up charges.

The people's government established an Engineering Development Board to take pro-people decisions on tariffs, concessions and imports of the engineering industry. But the military dictatorship recently appointed a new chief executive who has never attended an engineering school to sign on the dotted line of specific schemes.

There is a difference when the establishment moves a vote of no-confidence against a democratically elected prime minister and when the opposition moves a vote of no-confidence against an establishment appointee who cannot win a union council seat on merit. The opposition is moving the vote of no-confidence to draw attention towards the financial turpitude and wanton plunder of national assets that are leaving our people impoverished, hungry and miserable.

Q. The CoD is a very good document to go through. How will the ARD implement it when a number of its provisions are against the army or its chief? Are political forces strong enough to take on the army and throw it out of politics?

Ans. When the Quaid-i-Azam declared that the Muslims of the subcontinent would carve out a separate nation state, many said that the Hindu majority and the ruling British would never allow it to happen. But his dream came true. The Charter of Democracy is a prescription for saving Pakistan from disintegration and from degenerating into a failed state. Every patriotic person in the country, whether in the military or anywhere else, will support the charter to save the unity, integrity and well-being of Pakistan.

Q. What steps should be taken to bring the army's role in politics to an end? Can you give our readers the sequence of such measures?

Ans. The political parties which are signatories to the charter will

support the building of institutions including the election commission, parliament, and judiciary, and grant provincial autonomy to bring the government to the people who are the true owners of Pakistan. The armed forces budget will be made accountable and the armed forces will come under the prime minister who is the chief executive.

Q. Federal Minister Sher Afgan insists that in recent times you contacted Gen. Musharraf at least a dozen times. Denials issued by your party have been unable to make him change his claim. What's the factual position? Wouldn't holding a dialogue with the general be more useful than getting into confrontation with him?

Ans. In most countries people look for evidence before they print wild allegations. The minister did not provide any evidence and his allegations are patently false.

Q. On what terms will the PPP be willing to cooperate with Gen. Musharraf?

Ans. The PPP has not considered this issue as there is little likelihood to stand along side those who allowed Osama bin Laden to escape from Tora Bora and the Taliban to regroup and re-assert themselves as well as forced A. Q. Khan to become a scapegoat to save others. Don't forget that the PPP was overthrown twice to set the stage for the war against terrorism. After its first overthrow, Pakistan was on the brink of being declared a terrorist state in 1993. After the PPP's second overthrow, 9/11 took place. If the PPP had been in power, al-Qaeda would never have established camps in Afghanistan; the attacks on the Trade Towers would not have taken place, the wars in Iraq and Afghanistan would not have occurred; and Muslims everywhere would not be under siege. The policies of the PPP were aimed at bringing peace, harmony and brotherhood. Those who want a clash of civilisations cannot accept the PPP and it is futile to even consider such a package while trumped up charges are made, political prisoners languish in jails and exiled politicians are denied the right to live in their own homeland.

Q. Your party, like other parties in the opposition, is opposing Gen. Musharraf's plans to get himself re-elected by present assemblies. The argument is that an assembly whose own life is that of five years can't elect a president for 10 years. If so, how will you justify your own election as chairperson of your party for life when the electoral college is not meant for that long a term?

Ans. There is a difference between a country's parliament where different ideologies compete and the masses decide which way to go, and a political party which has one ideology according to which its workers decide who they wish to lead them.

Q. Can you categorically claim that the PPP will not take part in the elections if they're held in the presence of Gen. Musharraf?

Ans. There are those that would like the PPP to boycott the forthcoming national elections; but it is premature to speculate what the PPP would do. The PPP prefers contesting the elections, but will take the final decision closer to election time and in consultation with other opposition parties.

Q. Why don't you go back to Pakistan and face the cases that are against you in several courts? One says this bearing in mind the judiciary that is so independent that its decision in the Steel Mills case is being appreciated by everyone. If you don't go back, would it be right to infer that you still don't expect a fair trial?

Ans. I am facing cases in several courts in Pakistan and in a number of investigative litigations overseas. No leader in history has faced as much litigation as I have across so many jurisdictions. I am thankful to the people of Pakistan whose prayers are my shield and my defence. I urge my brothers and sisters to continue praying for me because I need their prayers. The regime could get more vengeful as it gets more fearful as the time of elections comes closer. I may mention here that my election petition to be declared a member of parliament on the women's seat was to be decided in six months as per law. It is still not decided. No doubt, the Steel Mills privatisation judgment is a good one and there are many conscientious members in our judiciary. I hope they will take bolder decisions in the future while some bold ones have already come. However, according to national and international human rights organisations, Pakistan's judiciary is under executive pressure.

Q. In a case pending against you before a Swiss Court, any kind of judgment is expected. Who would you hold responsible in case the verdict goes against you: Mr Sharif, who prepared the case, or the present government, which pursued it vigorously?

Ans. The hardliners in the establishment created the National Accountability Bureau as a front organisation to politically re-engineer Pakistan's direction. It used different persons for the

purpose, including Mr. Leghari, Mr. Sharif and Mr. Musharraf. Therefore, the cases continued even after the regimes changed.

Q. Why were red notices issued against you and your spouse? How do you see the government's move to have your assets in the US, the UAE and elsewhere seized?

Ans. All these moves are being made to detract attention from the institutionalised corruption of the regime.

Q. What's your party's stance on cooperating with the MMA?

Ans. The nature of "cooperation" should be defined before a comment can be made. Within the framework of the ARD we are prepared to cooperate with all other political parties to banish dictatorship from the country.

Q. What should be Pakistan's role in the stand-off between the US and Iran?

Ans. Pakistan should seek to use its influence with both countries to bring about a political settlement.

[The Dawn] *[July 16, 2006]*

The Rich have Fun While the Ship Sinks A Budget Critique

Pakistan is witnessing a worrying economic and social divide. There is a growing disparity between the rich and the poor and between the powerful and the powerless.

For the rich, the military dictatorship's high economic growth is a major boon. It means bullish stock markets, booming property prices, and easier bank loans. For the asset-less poor, the recent surge in economic growth is a bane. Prices for essential goods are higher –and purchasing power lower in real terms. Pakistan, in the words of the economist Mahbub-ul-Haq, is like a titanic where the rich are having fun but the ship is sinking down.

These growing economic imbalances threaten to rip apart the social fabric of society. If unchecked, they can deepen ethnic cleavages in a country plagued by militarisation of North Waziristan and Balochistan and a growing sense of alienation in the provinces.

This story of growth and inequality, stark poverty amidst obscene luxury is reminiscent of the 1960s and the so-called "decade of development" under General Ayub Khan.

The divisive economic policies of General Ayub's era sparked a nation-wide protest and ultimately culminated in Pakistan's dismemberment in 1971. Now another military dictator follows similar policies of economic exploitation of the poor, disempowerment of the citizens and faces a rising rebellion in Pakistan's largest province.

Last year, the general price level (measured by the consumer price index) rose by 9.30 per cent. This is the largest annual increase in the last eight years. Over three years, oil prices went up by nearly 70 per cent affecting all aspects of daily life from transportation costs to goods prices.

The military dictatorship's economic mismanagement resulted in

record increases in the prices of edible items including pulses, sugar, vegetables and cooking oil. Such soaring prices played havoc on the monthly budget of fixed income groups.

In the developed world, food prices remained constant. Take the case of United Kingdom where there was no significant increase in the price of milk, oil, poultry, sugar and other items of daily consumption during the last six years.

The Pakistani media rightly highlighted the dramatic increase in food prices. Such price rises transform into real lives with children going hungry because their parents cannot afford the sky-rocketing prices and with increasing malnutrition amongst both young and old. Yet the dictatorship turned to the utility store concept begun by the PPP. The PPP did set up the utility stores but it never saw them as a substitute for deficit reduction and curbing price control. Four hundred utility stores cannot go far in a country with a population of nearly 160 million people.

Ensuring price stability requires good governance. It requires steps to stop hoarding, improve supply networks, reduce the role of middle men, and control business cartels.

Sugar prices nearly doubled in the last six months. The Public Accounts Committee held selected sugar mills responsible involving influential sugar barons in the federal cabinet.

However, when it comes to nabbing sugar hoarders and business cartels whose misdeeds impoverish millions of ordinary citizens, there is a criminal silence. The law is helpless in eradicating corruption since the loyalty of the corrupt is crucial to sustaining the military regime. The country's entire accountability apparatus is geared towards keeping one unelected leader in office.

A misplaced focus on expenditures rather than outcomes

The regime claims to increase pro-poor expenditures through increased subsidies and higher development spending. Greater allocations for development are welcome but who will finance these expenditures and how will they reach the poor?

First, there is a distinction between allocations and actual expenditures. The Musharraf regime regularly failed to utilise amounts allocated for development. Sometimes as much as fifty per cent was unutilised. One chief minister left 70 per cent of the development expenditure unutilised. During last year's first nine months, the NWFP spent only 38.7 per cent of its annual development budget. A higher development allocation does not necessarily mean higher actual expenditures.

Second, given defence expenditure and debt servicing (with more and more loans being taken) fiscal space is limited. By the middle of

the financial year development spending is reduced. This is the second reason why higher allocations do not necessarily make higher expenditures.

Third, the relationship between expenditures and outcomes is not automatic. Examples abound of hospitals without doctors, ghost schools, missing teachers, political patronage, centralised management structures and widespread corruption in education and health departments. In fact, when public resources are channelled through dysfunctional public institutions they rarely reach intended beneficiaries.

Fourth, these higher development expenditures need financing. If new resources are raised through domestic borrowing, they translate into tomorrow's greater debt liabilities which further burdern the weak and downtrodden sections of society.

The poor need a level playing field that ensures socio-economic justice to all. Despite promises of "enlightened moderation", the military regime's managers refuse to change an unequal and unjust system that locks people in a perpetual cycle of poverty. It is a system that taxes the poor and subsidises the rich, a system that keeps ordinary people hostage to the interests of a narrow elite.

Social protection – too little, too late

The budget includes a 15 per cent dearness allowance for government employees, a modest increase in pensions, reduced income tax rates for the salaried class and an increase in the minimum wage. These well-intentioned steps cannot relieve the financial pressures on the poor. Few of Pakistan's people have formal sector employment to take benefit of these schemes.

The budget launched an employment scheme based on personal loans granted through the National Bank of Pakistan. This scheme is unlikely to resolve chronic unemployment in Pakistan. Employment comes through revival of the industrial sector and a fundamental change in national priorities. While masses of young people look for a remunerative job, retired military officers take over civilian positions. These are jobs that could help thousands of families but are used to give a second income to retired military personnel.

Social protection in Pakistan is grossly inadequate. Even on generous accounts, the country spends less than 1 % of GDP on social protection.

Last year, expenses of both the Prime Minister's House and the President's House exceeded their annual budgetary allocation. The Prime Minister's House spent twice as much as originally allocated! The new army General Headquarters in Islamabad, including mansions and luxury clubs for top military bureaucrats, will cost a

whopping $ 2.4 billion dollars.

Defending frontiers or defending the real estate?

To balance the budget, the increase in development expenditures should have been offset by cutting non-development expenditures. Instead, a raise of about Rs. 27 billion in defence spending was announced.

Moreover, the Public Accounts Committee found last month that over Rs. 35 billion in military pensions were paid from the civilian budget!

This is strategic fudging to prevent the ratio of defence expenditures to GDP rising.

At a time when sixty per cent of the people live on two dollars or less a day, when poverty, hunger and unemployment is rising, solidarity with the people could have been demonstrated by reducing perks for the top military brass. This was not done.

The democratic political parties have a record of a strong commitment to defence requirements. But there is a difference between defence requirement and financing lavish life styles for the top brass. The Charter of Democracy signed on May 14, 2006 calls for transparency in defence spending. It is, therefore, important that the military regime allows a healthy parliamentary discussion on the uses for defence allocations.

Privatising the future

It was the vision and hard work of Quaid-e-Awam Zulfiqar Ali Bhutto Shaheed that Pakistan invested in public sector corporations including the Steel Mills. The PPP governments invested in the infrastructure of the country building amongst others the Karakorum Highway, Port Qasim, Heavy Mechanical Factory, Heavy Engineering Factory, Saindak Project, Ormara Naval Base, Pasni and Gwadar ports, the oil refinery, power projects, fertiliser, cement, sugar and other plants.

While the state's involvement in public corporations was overstretched, a rushed, non-transparent privatisation fails to protect the rights of ordinary workers. Most recently this was witnessed in the controversial sale of the Pakistan Steel Mills. Moreover, hundreds of thousands of workers in privatised entities face an uncertain future. The regime must ensure they are able to sustain a secure livelihood for themselves and their children.

The budget mysteriously refrains from providing information on the actual use of privatisation proceeds. The concern is that the military dictatorship has used privatisation proceeds for budget deficit reduction purposes. That would be a shame for far more necessary is the need to retire the national debt. This is what the PPP

government did, becoming the first in history to repay principal debt and lower the debt burden on the unborn generation.

While children sleep hungry and parents cannot find work, the harsh reality of life under the military dictatorship is a stinging rebuke of the inability of unrepresentative systems to deliver economic emancipation to their people.

[June 18, 2006]

QUAID-E-AWAM ___ THE LEADER OF THE PEOPLE

Quaid-e-Awam Zulfikar Ali Bhutto Shaheed's martyrdom anniversary on April 4 falls at a time when Pakistan is faced with a critical situation.

The dark shadow of military dictatorship clouds the political horizon and spawns fissiporous tendencies striking at the solidarity of the country. Rocket launchers and bomb blasts kill innocents while the military is involved in operations against its own people.

The rise of the suicide bomber and armed struggle is reminiscent of an earlier military dictatorship. The tyranny of General Zia's brutal military rule led to the kalashnikov culture where young men picked up automatic weapons. That culture has reasserted itself under the present military dictatorship of General Musharraf. Except the weapons are more dangerous than the kalashnikovs of yesterday.

The country has learnt through tragic lessons of history that each military dictatorship leads to national loss, culture of lawlessness, corruption, nepotism, political persecution, misgovernance and neglect of areas that directly affects the lives of the citizens of the country.

A small elite benefit from the rentier mentality of the military dictatorship which rents out Pakistan's real estate in return for power and hundreds of millions of non-budgetary support which often ends up coming in suitcases. This creates a climate where tragically some have taken to calling bin Laden "the best finance minister Pakistan has" due to hundreds of millions of non-budgetary support that comes for his capture. They argue that while the money may not come directly to the people of Pakistan, it would "trickle down".

The supporters of the military dictatorship often point out that

when the Soviet occupation of Afghanistan ended, the west "turned its back" on Pakistan. By this they mean the suitcase politics ended and the non-budgetary support dried up. It appears that they wish to convey that when the war against terrorism ends, the non-budgetary support would dry up too. That creates a vested interest for stoking the fires that enable Islamabad to emerge as a "strategic" player.

Although we are the closest allies, under the nose of the dictatorship, Taliban forces have reorganised, reasserted themselves and ensured they dispense their form of "justice" in parts of the tribal areas of Pakistan. Neighbouring Afghanistan complains they are destabilising the country and has given a dossier to Islamabad. Instead of examining the dossier, Islamabad chose to use harsh language against Afghanistan and accused its leadership of being "oblivious" to the ground situation.

One could argue that it was Islamabad that was "oblivious" to the ground situation except that too many cynics believe that the regime is not oblivious but choosing to ensure its political survival and economic self-interest.

President Bush came to Pakistan to see whether General Musharraf was still as committed to the war against terrorism as he was after 9/11 and found he was. Musharraf in turn was apologetic about the "slippages" that had occurred.

However, the question that comes to the fore is how credible that apology can be. The military dictatorship knows fully well, having learnt this from the departure of CENTO, SEATO and the Soviet occupation, that without a "strategic threat" the raison d'etre of military dictatorship as well as the unaccountable non-budgetary amounts would dry up. Do they want that? Would they want that?

The non-budgetary support is reported to be in the region of nine hundred million dollars annually. That amount is almost equal to the cotton export of the country. It amounts to significant flows of external support for a country that is additionally getting another five hundred million dollars in budgetary support.

To consolidate its hold on power, the military dictatorship has ruthlessly targeted the mainstream political parties through horse-trading, coercion and inducements. However, they have failed to deceive the people, who are the children of the democratic dream of Quaid-e-Azam and Quaid-e-Awam, into abandoning the mainstream parties. Undeterred by this, the military dictatorship is now seeking to crush the moderate forces in Balochistan, Pakistan's largest province. The suppression of the nationalist Baloch tribes plays into the hands of the bearded and non-bearded leadership that

QUAID-E-AWAM ___ THE LEADER OF THE PEOPLE

Quaid-e-Awam Zulfikar Ali Bhutto Shaheed's martyrdom anniversary on April 4 falls at a time when Pakistan is faced with a critical situation.

The dark shadow of military dictatorship clouds the political horizon and spawns fissiporous tendencies striking at the solidarity of the country. Rocket launchers and bomb blasts kill innocents while the military is involved in operations against its own people.

The rise of the suicide bomber and armed struggle is reminiscent of an earlier military dictatorship. The tyranny of General Zia's brutal military rule led to the kalashnikov culture where young men picked up automatic weapons. That culture has reasserted itself under the present military dictatorship of General Musharraf. Except the weapons are more dangerous than the kalashnikovs of yesterday.

The country has learnt through tragic lessons of history that each military dictatorship leads to national loss, culture of lawlessness, corruption, nepotism, political persecution, misgovernance and neglect of areas that directly affects the lives of the citizens of the country.

A small elite benefit from the rentier mentality of the military dictatorship which rents out Pakistan's real estate in return for power and hundreds of millions of non-budgetary support which often ends up coming in suitcases. This creates a climate where tragically some have taken to calling bin Laden "the best finance minister Pakistan has" due to hundreds of millions of non-budgetary support that comes for his capture. They argue that while the money may not come directly to the people of Pakistan, it would "trickle down".

The supporters of the military dictatorship often point out that

when the Soviet occupation of Afghanistan ended, the west "turned its back" on Pakistan. By this they mean the suitcase politics ended and the non-budgetary support dried up. It appears that they wish to convey that when the war against terrorism ends, the non-budgetary support would dry up too. That creates a vested interest for stoking the fires that enable Islamabad to emerge as a "strategic" player.

Although we are the closest allies, under the nose of the dictatorship, Taliban forces have reorganised, reasserted themselves and ensured they dispense their form of "justice" in parts of the tribal areas of Pakistan. Neighbouring Afghanistan complains they are destabilising the country and has given a dossier to Islamabad. Instead of examining the dossier, Islamabad chose to use harsh language against Afghanistan and accused its leadership of being "oblivious" to the ground situation.

One could argue that it was Islamabad that was "oblivious" to the ground situation except that too many cynics believe that the regime is not oblivious but choosing to ensure its political survival and economic self-interest.

President Bush came to Pakistan to see whether General Musharraf was still as committed to the war against terrorism as he was after 9/11 and found he was. Musharraf in turn was apologetic about the "slippages" that had occurred.

However, the question that comes to the fore is how credible that apology can be. The military dictatorship knows fully well, having learnt this from the departure of CENTO, SEATO and the Soviet occupation, that without a "strategic threat" the raison d'etre of military dictatorship as well as the unaccountable non-budgetary amounts would dry up. Do they want that? Would they want that?

The non-budgetary support is reported to be in the region of nine hundred million dollars annually. That amount is almost equal to the cotton export of the country. It amounts to significant flows of external support for a country that is additionally getting another five hundred million dollars in budgetary support.

To consolidate its hold on power, the military dictatorship has ruthlessly targeted the mainstream political parties through horse-trading, coercion and inducements. However, they have failed to deceive the people, who are the children of the democratic dream of Quaid-e-Azam and Quaid-e-Awam, into abandoning the mainstream parties. Undeterred by this, the military dictatorship is now seeking to crush the moderate forces in Balochistan, Pakistan's largest province. The suppression of the nationalist Baloch tribes plays into the hands of the bearded and non-bearded leadership that

relies on religion or the military for its support. Another dangerous vacuum is being created in yet another part of the country.

The price of "rentier politics" is alienation, divisiveness and the threat of an implosion that could strike at the very territorial integrity of Pakistan.

It happened before. The disempowerment of the people of Pakistan resulted in the disintegration of the country and the emergence of Bangladesh. West Pakistan was threatened with break-up but Quaid-e-Awam Shaheed Bhutto saved the country through his popular support and his empowerment of the people and the provinces. When Quaid-e-Awam Shaheed Bhutto was unjustly killed, the country was once again in turmoil. Sindh threatened to separate. The Baloch leaders were sitting in Kabul. Once again it was the leadership of the Pakistan People's Party which saved the country through honest dispensation to people and provinces. The Baloch and Pakhtoon leaders were invited back from Kabul, given amnesty, they contested elections, development funds were made available and the country re-integrated.

However, since military academies are forced to re-write history to ensure that its dictators are repackaged as knights in shining armour, memory remained short. The drunken rule of General Yayha Khan was exonerated from the military mind as the cause of national disintegation. Blame was placed on the politicians who were out of power and, therefore, powerless to take the decisions that led to disintegration. So too was the tyranny of General Zia whitewashed to paint him as a mard-e-momin (man of faith). His rape of the constitution, hanging of an elected prime minister, creation of sectarian and ethnic violent groups and emptying of the treasury were buried. Instead the politicians were blamed to pave the way once again for another military ruler.

It was during the rule of the present military dictatorship that advertisements were taken out for nuclear export and a ship intercepted on its way to Libya with cargo to assist in nuclear proliferation. Although the nuclear scientist Qadeer Khan chose to confess sole responsibility and fall on his sword to protect others, the damage to national interest was done. India is given nuclear energy packages that Islamabad cannot dream of. As President Bush put it, India and Pakistan are two different countries with two different histories. Yet in 1947 they were cut from the same cloth and Pakistan had parity with India.

Quaid-e-Awam opposed the "rentier" mentality that lies at the heart of military dictatorships and creates the crises that damage national integrity as well as impoverish the people of Pakistan. He believed that Pakistan's true wealth lay in its people. He took

Pakistan from the bullock age to the atomic age. He broke the shackles of ignorance by building universities across the country and opened their doors to the young. He gave hope to the millions of Pakistanis living in poverty by telling them that it was not birth or class but hard work and knowledge that would determine their future. He created a new middle class and sent Pakistanis overseas to work. They were welcomed with open arms because Islamabad's standing reached the skies. In sharp contrast, the presentation of a Pakistani passport at an immigration desk today, sadly, too often means suspicion.

As Balochistan burns, Taliban strength grows in the tribal areas, earthquake victims struggle to survive, innocent civilians are killed, the elite celebrate while the poor sweat, the internal contradictions grow greater. There is a stark need to revert to the democratic legacy of the greatest leaders of Pakistan, namely Quaid-e-Azam and his political son Quaid-e-Awam to avert the danger of a failed state.

The military regime, unfortunately, is still building castles in the air. According to reports, it still conspires at rigging elections to deny the people their right to choose a government of their choice. Attempts are made to offer the main-stream parties either the governments of Sindh or Punjab in return for presidential support and re-alignment with the political orphans who make up the ruling party. The real intent is to break the opposition alliance and continue with a structure that was erected in 2002 and which has failed to meet the needs of reform or institution building.

Recently, Alexander Haig came on television where he described General Musharraf as an endangered species. The reasons that great nations build great institutions is because they realise that greatness lies in enduring structures that are immortal and not in individuals who will have their time on the stage and then move on.

In Quaid-e-Awam Zulfikar Ali Bhutto, a colossus of a leader, Pakistan was fortunate to have a people's hero who studied history and knew the lessons of history. He picked up the pieces of residual Pakistan and energised it with investments all the way from the Karakorum Highway to the Bin Qasim Port. He built the Heavy Mechnical Complex, gave Pakistan the Mushak aircraft, health and education, jobs for the youth, dignity to the women who were inducted into the foreign service and the judiciary, labour rights, land reforms, habeous corpus and most importantly the unanimous federal, democratic, egalitarian and people's constitution of 1973 with provincial autonomy. Quaid-e-Awam brought back 90,000 prisoners of war, prevented their war crime trials and also restored territorty lost to West Pakistan on the battle-field. He laid the foundation for an enduring and honourable relationship with India

on the basis of the Simla Agreement. He negotiated with President Daud of Afghanistan the signing of the Durand Line as a border between Afghanistan and Pakistan but was overthrown before it was signed. He emancipated the people from ignorance and backwardness and hosted the Islamic Summit at Lahore where President Arafat was recognised as the sole leader of the Palestinians paving the way for the establishment of the Palestinian National Authority.

Quaid-e-Awam did not believe that the strength of a party came from the name of a political leader. He believed that the strength of the party came from the masses. When he launched the Pakistan People's Party in 1967, it did not have any famous names. General Musa made fun of the PPP claiming that it had only "rickshawalas and tongawalas". The people of the country did not care for the famous names. They wanted to end military dictatorship and the drawing-room politics where a small elite belonging to the bureaucracy and security decided the destiny of the nation through their subservient puppets. The people said that they would vote for the PPP even if it gave a ticket to a lamp-post because they wanted to take change of their lives. The people of the country, whether professionals, presiding officers, returning officers, election commission officials, ordinary citizens or on election duty, police duty, military duty, judicial duty saw the elections of 1970 as a clarion call to end military rule. They refused to rig elections. They voted for PPP under the leadership of Quaid-e-Awam. The election victory was a triumph of people's power washing away all the so-called big names of politics in freedom's tidal wave of triumph.

Today Pakistan has to battle terrorists, extremists, militants, suicide bombers, Taliban, insurgency in Balochistan, reform madaris, improve the judiciary, the police service, the military, protect women and minorities, address the problems of the youth, ensure labour and peasant rights while dreaming of bringing the twenty-first century from backward tribal areas to the sea shores and dusty villages of the land.

A country that launched the world of modernity in the region in the seventies introducing radios and passports for every citizen and which launched the telecommunication revolution as well as the policies of information technology, deregulation, decentralisation and privitisation in Pakistan in 1988, with its success being copied in South and West Asia, has the capacity to once again transform its society from crisis to capability.

And to do that it must turn to the message of Quaid-e-Awam, the torch-bearer of the legacy of Quaid-e-Azam who believed in true enlightenment based on representative institutions, anchored in

justice and born with the zeal to serve the working classes, the middle classes and all the people of Pakistan.

He who gave his blood and the blood of his sons, both from his party and his family, knew that there can be no sacrifice greater than the sacrifice for the people whose respect, honour and dignity is the respect honour and dignity of the nation.

Even though Quaid-e-Awam was sentenced on a trumped up charge, today, as millions pay him tribute across the world, his name shines and inspires whereas those of his opponents is forgotten. His supporters pay him tribute although more than two decades have passed since he was taken away from this world in 1979 on the same day as the Jesus Christ was crucified.

Quaid-e-Awam made the people proud of themselves and of their nation. As his followers say, "Zinda Hai Bhutto, Zinda Hai" – Bhutto lives, he lives.

Indeed he does, in the heart of all those who dream of a better tomorrow.

[April 4, 2006]

PAKISTAN AND THE WAR AGAINST TERROR

The senseless catastrophe that struck America on September 11, 2001 continues to echo across the globe.

It would seem that the world is moving perilously close to the clash of civilisations predicted a generation ago by Professor Samuel Huntington. The question before us, and before the world, is whether the path to catastrophe can be avoided and whether the clash of civilisations is reversible.

Much of our ability to avert the clash of civilisations lies in learning the lessons of history. Patience and perseverance are required to uphaul political systems that disempower people in this the twenty-first century. Short-term solutions could lead to blowback. Pakistan is an example of a nation where the forces of tyranny, terrorism, proliferation and a militant interpretation of Islam by the margins mingle to create a difficult challenge.

The international community decided to throw its weight behind Pakistan's military dictator following the terrorist attack on the World Trade Center. It was the right decision to take given the context. There are worries though that the inability of the international community to facilitate Pakistan's transition to civilian and democratic rule could undermine its objectives in the long run.

It is a well-known secret that there is sympathy for bin Laden, Taliban and Arab fighters amongst Pakistan's military and clerical class. These were the two organisations used to train the mujahideen against the Soviet occupation of Afghanistan. Following the withdrawal of the Soviets, the mujahideen went on to become in large parts the Taliban and al-Qaeda.

Pakistan's military dictatorship has resulted in the domination of the country's political, financial and social class by the dominant military. It has also seen the rise of the religious parties. The

religious parties are public friends of bin Laden and Mullah Omar. They have filled the vacuum caused by the military regime's determination to sideline the genuine representatives of the people.

Withdrawal of the military from the political affairs remains a key concern of international policy makers as well as the people of Pakistan. Pakistan's present military ruler, General Musharraf, vested the presidency with enormous constitutional powers. These constitutional changes amounted to creating a civilian dictator. It was argued that an all powerful president would help facilitate the withdrawal of the army to the barracks and prevent the recurrence of martial law in the country.

This has not happened. In December 2004, after receiving signals that General Musharraf wanted to keep his military post of army chief, the parliament passed a bill enabling him to be both president and army chief.

A military president in Pakistan, Washington's key ally, sends the wrong message to one billion Muslims regarding the reasons for the war against terror. President Bush called this a war for the values of freedom. Prime Minister Blair said this was not a war between religions but against oppression and tyranny. The democratisation of Pakistan is important to the war against terrorism, to the interpretation of Islam as a message of freedom and enlightenment as well as to the empowerment of the people of Pakistan.

It is difficult to shake the haunting image of the Twin Towers and three thousand innocent victims, collapsing under the weight of hate. We live in an age traumatised by terror.

Today I see a Muslim world in flux. Children of two divergent education systems reach positions of power and responsibility. Many of the children of affluent, middle class families in the Muslim world studied in state-run schools are children of societies shadowed by dictatorship. Often, as in the case of Pakistan, they grew up under a ruthless dictatorship that used the intelligence services to imprison, torture and shoot citizens for their political views. People in Pakistan were whipped or shot at for holding a protest demonstration calling for the restoration of democracy.

Even as political freedoms were denied, economic and social successes remained a distant dream. More often than not, unemployment, poverty, malnutrition and injustice destroyed lives. Society was often governed by the whim of the rulers rather than by a set of rules. This led to frustration and discontent amongst ordinary people.

The mainstream political parties were banned and stopped from freely functioning. The avenue for the embittered, frustrated youth

was often only the mosque where they gathered for prayers.

Clerics, fearful of speaking against the dictator, would speak against those who supported the dictator – and often this was the West. Unable to directly vent the frustration felt by the domestic constituency, they would speak against the policies outside the country. Thus a post World War II generation, which one could call the cold war generation, grew up hearing about denial of nationhood to Palestine, lack of self-determination to Kashmir, the denial of autonomy to the Chechens. They learnt of past Muslim glory based on conquest and war. They learned little or nothing about the Muslim renaissance which saw giant leaps forward in medicine, astronomy, mathematics, literature and science based on education and rational discourse. They imbibed the lesson that a return to the simple, austere life of the past could once again rekindle the courage and passion that saw Islam sweep across continents and spread its message far and wide. The theocratic state, disciplined under a single religious figure, was presented as the path to victory – victory against the temptations of the soul, victory against the injustices perpetuated by bigger powers, victory against lawlessness at home.

It is this embittered generation that must be rescued with an alternative political model to that of the theocratic state. The fight for freedom is a fight for values that can build a pluralistic world free of discrimination on the basis of race, religion or gender.

When the terrorists targeted the World Trade Center, they tried to destroy a symbol of pluralism. At the World Trade Center, there were men and women, working side by side as equals. There were Muslims, Christians, Jews and Hindus working together to build worldwide trade and communication and cooperation.

Modernity, diversity and democracy are the fanatics' worst fears. They confuse the message to prevent Muslim people from learning that diversity ensures that cultural and religious identity remains intact.

Whatever their alleged goals, there is no defence or justification in Islam for their barbaric conduct.

Their actions contradict the teachings of the Muslim Prophet (PBUH) who said to Muslims that even during war, 'Do not cheat or commit treachery, nor should you mutilate or kill children, women or old men.'

It is ironic that despite the strong commitment to democracy, most Muslims are living in dictatorships. Much as the people of the communist world were in the past, so too are the Muslim people hostages in authoritarian regimes all around the world today.

Islam is committed to universal education and literacy. The very first word of the Holy Book Quran is "read."

Yet a Muslim past replete with the finest universities and research centres of rational discourse is now part of history.

Islam is committed to the equality of women in society. The wife of Islam's Prophet (PBUH) was herself a proud workingwoman.

As a Muslim woman who grew up believing that modernity and religion are compatible, it distresses me to see women discriminated against in different aspects of life including the right to choose their marital partner.

In this the twenty-first century, women in parts of the Muslim world are witnessing the re-emergence of a tribal custom that permits male family members to kill a woman who marries without their permission. This most dishonourable murder is called ironically an "honour killing".

Islam flourished in its early days with a commitment to trade and commerce. But today trade and commerce are often tangled in a web of government regulations denying ordinary Muslims opportunity of entrepreneurship.

Muslim countries are in search of leaders that can revive the values of Islam by reintroducing the politics of consensus and compromise which lie at the heart of democratic values. Such values have nothing to do with terrorism. Terrorism cannot be justified by any argument.

Unfortunately many Muslim countries, including Indonesia, Pakistan, the Phillipines had long histories of authoritarian rule. In the twentieth century some argued that authoritarianism could produce a professional middle class facilitating democratic reform. They cited the Asian tigers as examples.

Others argued that the rise of the lawlessness and terrorism was a consequence of a generation that saw power come from the use of force. By suspending the majesty of law, by taking over by force, by ruling through repression, military dictators and authoritarian rulers gave birth to the culture of obtaining power through violence.

To undermine terrorism, violence, brutality and barbarism, it is necessary to stress the values of democracy, pluralism, the rule of law, justice, equality and the empowerment of all citizens. The Muslim people need models of political development that enhance the dignity of the individual and the prosperity of the nation.

We must fight a war on terrorism and simultaneously fight an equally critical war on the political manipulation of religion and against the regressive forces of totalitarianism.

The terrorists who attack America aim to establish theocracies of

ignorance to manipulate for their own political ends. They are the enemies of all humanity.

The world is threatened but a military response is only part of the solution to the problem of terrorism and the growing divide between the Muslim and non-Muslim world.

The instability of the Iraqi occupation, the exploitation of the situation in Iraq by the remnants of Saddam's dictatorship and Osama's terrorists, the continuing instability in Afghanistan, the unresolved situation in the Middle East between Israelis and Palestinians, and the tragedy of Kashmir impact upon the people in the street. No one knows when the masses can become a mob and that mob strike out against anything western.

The attack on the American Embassy in Iran during the time of Ayatollah Khomeni and the burning of the American Embassy in Islamabad under General Zia are examples of those who would channel hate for their myopic political ends.

The war against terror is a war that must be fought for world safety.

We must learn from the lesson of the past, particularly the lessons from fighting the Soviets in Afghanistan in the eighties. Then America, Pakistan and its allies created the very Frankenstein that now calls itself al-Qaeda. It did this by neglecting to strengthen political moderates, by neglecting to put money into education and infrastructure. Short-term strategies often create far more intractable long-term problems. I am afraid we inadvertently created our own Frankensteins.

The Taliban have been routed. The military, political and economic control centres of the al-Qaeda are disrupted. An oppressive Iraqi regime has been toppled.

But the success of phase one does not mean that the war is over. The world walked away from Afghanistan once before, in the past, after the defeat of the Soviets in 1989. That political miscalculation sowed the seeds of the tragedy of the Taliban and the al-Qaeda and most regrettably, the events of September 11th, 2001.

The overall policy of standing against Soviet aggression in Afghanistan was right. Yet the early to arm, train, supply and legitimise the most extreme fanatics sowed the seeds for the twenty-first century terrorism that is now swirling around us.

The fundamental mistake, contributing to a long-term historical calamity, was that we were not consistently committed to the values of freedom, democracy and self-determination that ultimately undermine and belie the basic tenets of terrorism.

We must not repeat that mistake again.

Just as democracies do not make war, democracies also do not sponsor international terrorism.

Let us remember that building a moderate, stable and democratic political structure in Afghanistan would have marginalised the Taliban and the Osamas of this world well before they had unleashed their war against the people of Afghanistan and the people of the United States.

The international community has danced with dictators in the past, with tragic results. I pray that it is not making the same mistake today on the nuclear subcontinent. Now that the US presidential elections are over, I would like to see President Bush lead the international community in building an opportunity for Pakistan's transition to democratic rule. Pakistan's military ruler could be encouraged to open up a sincere and substantive dialogue with the democratic forces and to end judicial abuse and political harassment.

Fresh party-based elections, open to all parties and personalities, with international monitors, an independent Election Commission, electoral modalities that are transparent and a count that is immediate, open and accurately reflects the sentiments of the people could settle issues of legitimacy and governance which now complicate Pakistan's social and economic challenges. Such an election could put Pakistan back into the comity of democratic nations.

Recently, the world learned that scientists in charge of Islamabad's nuclear weapons programme were clandestinely selling nuclear secrets to North Korea, Iran and Libya. Dr. A. Q. Khan, the chief scientist became the fall guy for the operation. He came on television to confess his guilt. That very evening he was pardoned and allowed to keep the assets obtained through the illicit nuclear sales.

Meanwhile Osama bin Laden's biographer claimed that Osama told him he had access to two dirty bombs.

Two assassination attempts on General Musharraf demonstrate the thin thread on which the alliance with Islamabad is built.

For me, the democratic forces of Pakistan are the tiny ripples of hope that will coalesce to end authoritarianism and bring the promise of democracy to Pakistan.

For now, elements in Pakistan exploit the war on terror to protect a military dictatorship. A military dictatorship suits them. It undermines the international community's commitment to democracy in the context of Iraq and Afghanistan. It alienates the people of Pakistan and Muslim youth across the Muslim world.

This February, Fox television asked me whether bin Laden would be captured before the American presidential elections. I replied

with a categoric "No". The elements that need dictatorship in Pakistan need bin Laden and Taliban. They know that the international community's short-term decision on strategic grounds to support dictatorship would erode once bin Laden was caught or Taliban weakened.

In the war against terrorism, I believe the greatest protection of freedom from terrorists comes from replacing dictatorships with governments responsible to the people, governments based on the values of democracy and liberty.

History has taught us the very hard lesson that when the world turns against democracy, it turns against itself. A democratic Pakistan is the world's best guarantee of the triumph of moderation and modernity among one billion Muslims at the crossroads of our history.

[December 10, 2004]

MAJOR MILITARY CHANGES IN PAKISTAN

Returning from a long overseas visit, Pakistan's military ruler announced a flurry of high level military changes. Now the top military positions are occupied by officers much more junior to General Musharraf himself. In that sense, the changes ought to give General Musharraf more confidence in his control of the armed forces.

Pakistan's armed forces have traditionally been highly disciplined. Even the U-turns in foreign policy have not impacted upon the iron discipline of the armed forces. Although much was made of the involvement of a few junior officers in assassination attempts on the military and political leadership of the country since it joined the war against terror, the reality was that the armed forces remained loyal to their chief and disciplined to their institution.

With the changes, all serving three-star generals above the rank of brigadier owe their rank and position to General Musharraf. Interestingly, those with political duties, such as generals Akram, Hafeez and Ehtishaam, were largely left out of the promotions ladder. Whether this was done inadvertently or deliberately, it follows a pattern that some new democracies adopted during transitional periods.

The first impact on the high level army changes will be on the issue of Pakistan's transition to civilian rule.

Presently, General Musharraf holds both the positions of chief of army staff as well as the powerful presidency. If the changes give General Musharraf a greater sense of confidence, he is more likely to facilitate civilian rule by taking off his uniform in the coming months. Alternatively, he might feel overconfident and decide to keep the uniform dispensing with public sentiments.

Facilitating civilian rule by bifurcating the positions of president

with a categoric "No". The elements that need dictatorship in Pakistan need bin Laden and Taliban. They know that the international community's short-term decision on strategic grounds to support dictatorship would erode once bin Laden was caught or Taliban weakened.

In the war against terrorism, I believe the greatest protection of freedom from terrorists comes from replacing dictatorships with governments responsible to the people, governments based on the values of democracy and liberty.

History has taught us the very hard lesson that when the world turns against democracy, it turns against itself. A democratic Pakistan is the world's best guarantee of the triumph of moderation and modernity among one billion Muslims at the crossroads of our history.

[December 10, 2004]

MAJOR MILITARY CHANGES IN PAKISTAN

Returning from a long overseas visit, Pakistan's military ruler announced a flurry of high level military changes. Now the top military positions are occupied by officers much more junior to General Musharraf himself. In that sense, the changes ought to give General Musharraf more confidence in his control of the armed forces.

Pakistan's armed forces have traditionally been highly disciplined. Even the U-turns in foreign policy have not impacted upon the iron discipline of the armed forces. Although much was made of the involvement of a few junior officers in assassination attempts on the military and political leadership of the country since it joined the war against terror, the reality was that the armed forces remained loyal to their chief and disciplined to their institution.

With the changes, all serving three-star generals above the rank of brigadier owe their rank and position to General Musharraf. Interestingly, those with political duties, such as generals Akram, Hafeez and Ehtishaam, were largely left out of the promotions ladder. Whether this was done inadvertently or deliberately, it follows a pattern that some new democracies adopted during transitional periods.

The first impact on the high level army changes will be on the issue of Pakistan's transition to civilian rule.

Presently, General Musharraf holds both the positions of chief of army staff as well as the powerful presidency. If the changes give General Musharraf a greater sense of confidence, he is more likely to facilitate civilian rule by taking off his uniform in the coming months. Alternatively, he might feel overconfident and decide to keep the uniform dispensing with public sentiments.

Facilitating civilian rule by bifurcating the positions of president

and army chief was a pledge Musharraf made a year back. In an agreement with a grouping of religious parties, he accepted their nominee as parliamentary leader of opposition, allowed their government to continue in the Frontier province and accepted their clerical qualifications to enter parliament. The six-member alliance of religio-political parties in turn supported the constitutional changes Musharraf demanded. These changes created a dictatorial president armed with enormous powers over the executive, the judiciary and the armed forces. It also brought national security issues directly under the president making him the effective strategic commander in the field.

However, a few months back, Mr. Musharraf ignited a debate regarding his constitutional pledge to shed his military uniform. Citing the war against terror, he claimed he needed the military uniform to succeed in his efforts. Recently, there have been some dribs and drabs arrests of al-Qaeda militants in regular sequential order to keep the outside world placated. However, the guessing game of whether the General will hand over the prize of Taliban leader Mullah Omar and al-Qaeda Osama bin Laden before the US presidential elections continues.

Nonetheless, questions were asked as to whether General Musharraf needed to continue wearing the hat of army chief to successfully eliminate militancy and terrorism in the country. These questions were asked in the context of the enormous presidential powers that make the military subservient to the powers of the presidency.

Senior retired military generals with close links to General Musharraf as well as to the military have predicted that General Musharraf will indeed separate the offices of the presidency and the army chief by the end of this December.

If this prediction is correct, it means that a new round of military changes will take place come December. Pakistan could end up with an officer class that is distinct from the ones closely associated with the first Afghan Jihad. That Afghan war, while noble in resisting the Soviet occupation, witnessed the rise of the most extreme Afghan-Arab groups that went on to form al-Qaeda and Taliban. It was a rise with which Pakistani military officers, under orders from military dictator General Zia, were associated.

Already some changes are visibly discernable that can go on to have long-term effects. For example, to keep its grip on power, the establishment created an intelligence corps in 1990. This corps ensured that the same group of officers climbed up the promotion ladder. As the same group of men went from junior to senior, they carried with them similar ideological leanings, friendships,

hostilities and networking with a group of politicians, civil servants, businessmen and bankers. The promotions more or less went with a major general heading the Military Intelligence before going on to head the Inter Services Intelligence.

That mould has now been broken. Following the two assassination attempts against him last December, General Musharraf removed the head of Military Intelligence and appointed his military secretary as the new head. This October, as he promoted the head of the powerful ISI to the post of chairman joint chiefs of staff committee, General Musharraf brought in tenth corps commander General Kiani as the new head of ISI.

The tenth corps is extremely important. It is the corps that strikes when a coup takes place. General Kiani was replaced with General Satti as the new corps commander. Both these officers are from the Punjab – a further break to the mould. There was a perception earlier, whether true or false, that Musharraf who is Urdu speaking was turning to officers of a similar background for promotion. That perception is now laid to rest with the ethnically balanced promotions. (The third important social group in the army hails from the Frontier. It is not known whether any key appointments from this group were made or are planned.)

Both generals Satti and Kiani, according to media reports, played a pivotal role in investigating the conspirators in the assassin plan against Musharraf. Their investigations led to the sensational arrests of key players.

On the surface, General Ehsan is the only officer from the old intelligence apparatus to have survived the promotions scale. He is the new chairman joint chiefs of staff committee and replaces another ISI official, General Aziz. While most people dismiss the office of CJCS as unimportant, that perception is incorrect. The office of CJCS is an important one which sees all secrets ciphers and minutes of confidential meetings. It knows exactly what is happening in the country in all the sensitive fields. Knowledge is power and this office is one which does have power – although of a different kind to that of an operational office.

Outgoing CJCS General Aziz was one of the key players in the political battle that led to General Musharraf's successful coup d'etat in October 1999. After 9/11, he was removed from his early position as chief of general staff along with two other officers who brought General Musharraf to power. In removing the three men who helped his plane land to safety in October 1999 saving his life (and giving him the seat of power), General Musharraf re-ignited the traditions of the Mughul rulers of undivided India. They showed a ruthlessness in getting rid of their fathers, sons and brothers in the battle for power.

Media reports painted General Aziz as "the most feared" who "Musharraf projected in private sessions with American leaders as the fundo who may take over and reverse their war against the Islamic radicals."

The retirement of Aziz took place calmly and in routine.

General Musharraf tried to placate the ones he relieved from the offices they held. The former hardline head of ISI, General Mahmood, was made head of Fauji Foundation. The rumours are that General Aziz will be made president of Azad Kashmir.

The coveted post of vice chief of army staff went to Corps Commander, Karachi, Lt. Gen. Ahsan Saleem Hayat. He narrowly survived an assassination attempt by terrorists earlier. If anything were to happen to General Musharraf before December this year, Ahsan would become key to the future direction that Pakistan takes.

But if all goes well until December, and General Musharraf decides to take off his uniform (as predicted by the group of powerful retired military officials), its anybody's guess who makes it to chief. Certainly, the bet is on Vice Chief Ahsan by virtue of the office he now holds – but others could be in the running.

General Musharraf plays his promotion cards close to his chest. The military prefers promotions by seniority – but few were the times that seniority won in the chequered history of the country.

There is an appointment principle that claims in the first eighteen months an appointee is dependent and willing to please. After that he must be changed to prevent the boss becoming dependent on them.

Obviously, General Musharraf would not like to be dependent on anyone in the country, least of all from his core constituency of the military.

[October 2004]

THE STORY OF BENAZIR

<u>*From: Marvi of Malir Shah Latif*</u>

Benazir Bhutto

When the world was still to be born
When Adam was still to receive his form
Then my relationship began

When I heard the Lord's voice
A voice sweet and clear
I said "yes" with all my heart
And formed a bond with the land I love
When all of us were one
My bond then began

An exile now by destiny
I am nearer home than my heart's beat
I wonder: when will I be free
To return to Larkana

From dust to dust
Loved ones return
To what they were
When will I walk home from Arab lands
To my own sweet Motherland
Waiting for news in dreams and day
Waiting for messengers in dreams and day
When will the message come
Taking me from here to there

I want the answer to my heart
I want to pass God's test
O God, I await the messenger
Taking me to where I belong
Although the tyrants do not care
Strands of white my hair now shows
My face is gaunt with sadness
I to my people want to go
I came in the winter of repression
I pray to return in different times
Like the joy of a seasonal rain
The people support I will reclaim.
Almighty God,
Let Mother's sickness not worsen in exile.
Trapped in a mind wanting to forget
A heart weeping for young sons killed
O let Mother first her homeland see

O where is my husband gone?
His life's prime and his grace?
Prison walls confine him
Court rooms frustrate him
Judges are frightened
Courage has fled
Salaries are more important
Than honour for which men gave lives
Pakistan, my health is worn
My joy is gone
And yet my heart is strong
For the fight
For our people lost rights
Each day I smile for the world,
For my children and myself
They ask: when can we return?
I speak of justice fled
From hearts of men
Into the breasts of beasts
I tell them

We will smile and we will eat
When freedom from chains is freed
I think of the poor people
A better fate they deserve
Than the military conqueror's boots
Yet the lust for land grows
Plazas and plots for the elite lot
Government homes too
Not one but two
All on starving backs of people robbed
The sweet lands lie parched
For water people pray
The crops perish
The cattle die
The stoves grow cold
As labour is sent home
Fair Pakistan's face is blotted
Mug shots and finger prints are demanded
Worshippers live in fear and dread
Tenants are ejected
Soldiers in snows abandoned
The poets in the mountains and the deserts
Speak of another time
When the country and the individual had respect
Before the Benazir government left
One pension is too little for some
One state, two jobs, two salaries and two pensions
For retired Khaki specials
Democracy is for those in Mufti
Dictatorship the dream of Generals in Khaki
The British left last century
Their space the Khaki filled
The Father died too quickly
In an ambulance in Karachi
One day the tyrants will depart
Public opinion will set us free
There will be dancing in the streets,
Music and song

Laughter will fill the air
As people rejoice in their destiny
Larkana, Loved-one, I remember
The sweet scent of roses
Of fresh rain on desert sand
Of trees washed by nature's hand
Away I live in a mansion grand
But I long to campaign
On long and rocky roads
In bumpy jeep rides
With flags and banners
With selfless zeal to change
The sad present
Into a smiling future
I want to breathe the breath
Of home,
a breath both fair and fine
My spirit is in one place
My body in another
My mind torn asunder
The Elections were so Unfair
Made of Broken Promises
Billions spent in marketing
A dictatorship as a democracy
That too unsuccessfully
The European Union called Foul
So did the Office of the Commonwealth
Boxes were filled
Ballots torn
Peoples verdict shorn
By cowards masquerading as patriots
The presidential palace is ugly
In a land with widespread poverty
Parliament has yet to dress itself
With Constitutional power
The phoenix rises from the ashes
Peoples power will be born again

Centres of learning
I will build for the children of the poor
Provide the aged and the young
Dignity, hope and security
We will raise buildings
Where there are deserts
And stop the weeping of the women of the land
Cry not
For change is in our hands
To reject wrong and embrace right
These days of despots will soon go
Just as other despots did
Memory for ever recalls Quaid-e-Awam
The sword of truth
Who gave his life
So we could live
With legal rights and economic security
With knowledge and opportunity
With representation and success
With peace and with progress
His name will for ever shine
Who can forget him
That historical memory embraces
For ever in its folds.
He who wore threads of fine gold
Tore them for prison cells
He who slept, in silken sheets and fed with silver spoons
Threw them aside for the darkness of the death cell
Defying death
The rulers offer comfort
In return they demand conscience
Don't offer comfort
To history's children
To the brave and the bold
The Kurds fought for decades
The Kashmiris do too
The Palestinians refused to surrender
In every continent

In every era
The brave and the bold
Carved history with their bare hands
One has might
The other right
One has the sword
The other the pen
Guns rust and fall apart
Ideas live for ever
Tyrant: do not offer comfort
Comfort leaves me cold
Much dearer do I hold
Marvi's ancestral shawl
Symbol of our Treasure
From Marvi I learnt
From past mystic saints
From my dear brother Shah I learnt
That handsome youth who fought another tyrant
That
Were I to breathe my last, living
Away from the home I loved
My body won't imprison me.
Shah returned home while his soul went free
No stranger to the soil
Embracing his body in death
Making it part of the legends of our land
When his last breath came
We carried him to the hidden coolness of the desert sand
Pride and sadness mixed in our hearts
Swaying emotions
Knowing that his life was given
For a clear cause of liberation
From a Dictator's occupation
We buried him lovingly
In the land that was his
In a sea of people
That loved him
For his life

And for his death
Killed and yet the struggle lived
The cranes fly to their native hills
My heart longs to fly with them
Invisible chains
Hold me prisoner
The wounds of the past
Fester again
For my country and me
As I see people denied rights
Denied opportunities
Youth looking for hope
Democracy separated from the polity
Dictatorship cuts cruelly to the bone
Undermining the economy
Undermining the society
Introducing suicide
Economic suicide for those too poor to live
Political suicide for asymmetric warfare
Joy left when the stove turned cold
Joy fled when the church and hospital blew
Some sent messages
To forget about politics
To leave the people
To find happiness
They thought it foolish
That the weight of persecution
Could be borne
With a Mother ill
And children small
With the pain of exile
Of a husband separated by prison walls.
They thought it generous
To offer freedom for abandonment
The abandonment of a people, of a land
Of a struggle, of a dream
Of principles and of conscience
I thought it wrong

I know I will return
On a wave of peoples support
Led by the bravest Party of them all
A Party of martyrs
A Party of struggle
A Party that serves
A Party of the people
My enemies wish I never was born
For them it was a torture and a shame
That I became
The first woman leader of a Muslim State
Crumbling centuries of control
Triumphantly proclaiming
The equality of men and women
The pristine message of Islam
Hidden under prejudice and discrimination
Destiny's hand moves on
Writing its own tale
Of triumph and tragedies,
Of wars and peace,
Of bombs pulverising houses
Above the stench of death
Life begins again
The tide of sorrow turns
The sea of happiness awaits
The patient pray and persevere
Loved ones parted meet
Prisoners are freed
Fresh ones take their places
Or flee
Destiny's moving finger writes on
Seasons change
Realities change
The rest is a test
Better a life of test
Than a worthless life of rest
The land reclaims its own
When the dead die

They live again
Becoming part of a land
Centuries old
Holding secrets
Of great civilisations
Of heroes and heroines of bygone times
Shaping history and heritage
Shaping culture
Shaping the future
Time begins
Time ends
We decide
What to do with time
The repression of retrenchment
The despair of downsizing
The evil of unemployment
Prisons hold
Those that defy dictators
Those that pay the price for freedom
Knowing the chains holding liberty will break
That the desert men
Will write of desert courage
Of integrity, loyalty and unity
Baptised in suffering
That a desert maid
Will return home
Hear the wind
It carries the message:
Of dictators that came and went
Of tyrants now particles in the sands of times
How many armies came and went
How much blood was shed
Conquests proclaimed
Kingdoms fell; Tyrants too
The desert sands speak
The desert winds whisper
Truth will triumph
The desert maid will return

Travellers travel bringing news
Of political developments,
I hear of miseries
Of families without income
Of fear of hunger
I hear
And my own suffering retreats
Days pass
Life passes
I am shackled
To the dream of democracy
Unhappy are the days
Remember the poor and the wretched
Remember the desperate and the hopeful
Remember God's sacred trust
The children of the land
Do hot let your conscience die
For Power and Pride
The scent of the homeland
Wafts through the ocean air
Through continents
Its insistent call
A reverberating sound
Through sunset and dawn
Calling
Through walls
Calling
Through mountains
Seeking to reclaim
Its own
To my dear ones I say
Worry not
Shed no tears
Bear no regrets
These days will pass
After night comes day
After sorrow comes joy
The daughters of the desert know

That Destiny
Cannot Chain
The dream of a people free
Of a youth redeemed
Of a land
Where the sweet scent of justice
Fills the air
Where human rights
And economic rights
Break the prisons of poverty
Break the dungeons of disease
Far from Malir and Multan
Far from Mardan and Makran
My countrymen are far
No one can reproach them
For they stand strong
As the October elections showed
One day I will recall these days
And forget the pain
One day I will recall these days
When political storms roared
When thundering threats filled the air
One day I will recall these days
Knowing my commitment to my land
Was purified and sustained.
I think of those exiled
from their homelands
In Los Angeles, London, Dubai
Of the days they pass
Some in despair,
Some in frustration
Some with determination
The seasons change
My face with them
Theirs too
Will my fellow villagers recognise
A face
Reflecting the seasons of fate

Night falls
The world sleeps
Darkness fills the air
I raise both my hands
And ask my children
To raise their little hands
Marvi of Maru and Malir,
In the mists of time
She raised her hands
While the world slept
To God
Full of hope
Praying to see her homeland
Marvi,
We raise our hands
As you raised yours
To God
In hope
For the homeland
I was born in
Buried my Father
Buried my brother
Married
Had my children
Served a Nation
Helped a people
Without telephone or electricity
Computers or emails
Polio drops or iodine
Enter the modern age
But the bullets were fired
Piercing my tall and handsome Brother
His precious blood on the pavement fell
Where once we walked
The angels came
And took him away
To my Father and my Brother
As the Martyrs watched

In July we met
His warm embrace I recall
In the chandeliered Prime Minister's Hall
His special goodbye as he left
His voice on the phone
When we talked
As family members do
The phone came
It spoke of bullets fired
Of Murtaza wounded
I took a plane
With Holy Book in Hand
To the Hospital where he lay
God, do not take
The brother that I love
It was too late
He was gone
Again I buried a brother
The killers buried the Government
Husband was imprisoned
Tiny children exiled
With ailing grandmother
Midnight raids and imprisonment
Torture and terror
Perjury and Perversion
Billions spent on false cases
On propaganda
Psy war and special operations
On a Mother
Courts cal liberated
With different orders
Caught flights daily
From one to the other
Lahore to Rawalpindi
Then to Karachi
The persecutors fell
In divine retribution
The military marched in